READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM

ہر گھر کیلئے

ماہنامہ حنا

جلد 38 شمارہ 10
اکتوبر 20016ء
قیمت -/60 روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامیات

انشاء نامہ

یادرفتگاں

سلسلے وار ناول

انٹرویو

ناولٹ

مکمل ناول

افسانے

☆☆☆

سردار طاہر محمود نے نواز پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ حنا 205 سرکلر روڈ لاہور سے شائع کیا۔
خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ، **ماهنامه حنا** پہلی منزل محمد علی امین میڈیسن مارکیٹ 207 سرکلر روڈ

اردو بازار لاہور فون: 042-37321690, 042-37310797 ای میل ایڈریس،
monthlyhina@hotmail.com, monthlyhina@yahoo.com

قارئین کرام! اکتوبر 2016ء کا شمارہ پیش خدمت ہے۔

8 جولائی کو برہان وانی کی شہادت نے مقبوضہ کشمیر میں جاری آزادی کی تحریک میں ایک نئی جان پیدا کر دی ہے۔ مقبوضہ ریاست میں سو سے زائد افراد کی شہادت۔ ہزاروں افراد کے پیلٹ گنوں سے نابینا اور معذور ہونے کے باوجود کشمیری عوام جس طرح گھروں سے نکل کر آزادی کے نعرے لگا رہے ہیں۔ اس پر اس تحریک کے لئے بھی انتفاضہ کا لفظ ٹھیک طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

وزیراعظم پاکستان نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے اپنے حالیہ خطاب میں مسئلہ کشمیر پر پاکستانی موقف جس طرح موثر انداز میں پیش کیا اور مسئلہ کشمیر پر عالمی ضمیر کو جھنجھوڑنے کی جو کوشش کی ہے وہ قابل تحسین ہے انہوں نے عالمی برادری پر بجا طور پر واضح کیا کہ مسئلہ کشمیر کے حل کے بغیر پاک بھارت تعلقات معمول پر نہیں آ سکتے۔ انہوں نے مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے بھارت کو سنجیدہ مذاکرات کی پیش کش کی لیکن کیا کیا جائے کہ ہندوستان کی حکومت نے پورے خطے کے امن کو تہہ و بالا کیا ہوا ہے۔ مودی جی نے پورے ہندوستان میں نفرت کی آگ لگا رکھی ہے۔ جس کے شعلے پورے خطے کو جھلسا رہے ہیں۔ مودی کی انتہا پسندانہ پالیسوں کی وجہ سے اس وقت خطے پر جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں لیکن مودی جی کو سمجھ لینا چاہیے کہ جنگ خود ایک مسئلہ ہے۔ کسی مسئلے کا حل نہیں ہے، مسئلوں کے حل جنگ کے بعد بھی مذاکرات کے ذریعے ہی نکلتے ہیں۔

اس شمارے میں:۔ ایک دن حنا کے ساتھ میں سحرش بانو اپنے روز و شب کے ساتھ، طیبہ ہاشمی اور فلک ارم ذاکر کے مکمل ناول، تحسین اختر، سندس جبیں اور درثمن کے ناولٹ، مصباح علی سید، ہما راؤ، حنا اصغر، فرزانہ حبیب اور سباس گل کے افسانے۔

نایاب جیلانی کا سلسلے وار ناول کے علاوہ حنا کے سبھی مستقل سلسلے شامل ہیں۔

آپ کی آرا کا منتظر

سردار طاہر محمود

دل رفتہ جمال ہے اس ذوالجلال کا
مجمع جمیع صفات و کمال کا

ادراک کو ہے ذات مقدس میں دخل کیا
ادھر نہیں گزار گمان و خیال کا

حیرت سے عارفوں کو نہیں راہ معرفت
حال اور کچھ ہے یاں اپنوں کے حال وقال کا

ہے قسمت زمین و فلک سے غرض نمود
جلوہ وگرنہ سب میں ہے اس کے جمال کا

مرنے کا بھی خیال رہے میر گر تجھے
ہے اشتیاق جان جہاں کے وصال کا

میر تقی میر

ہے تیری ذات میں اسوۂ سب کے لئے
تو ہے اسوۂ حسن تجھ پہ لاکھوں سلام

تو ہے ختم الرسل تو ہے خیر البشر
تو ہے نور البشر تجھ پہ لاکھوں سلام

تو ہے شفیع الامم تو ہے بحر کرم
تو ہے ابر کرم تجھ پہ لاکھوں سلام

تو امام الرسل ہر دوارض و سماء
تو حبیب خدا تجھ پہ لاکھوں سلام

تو ہے شہر علم تو ہے فخر البشر
تو ہے بحر سخاء تجھ پہ لاکھوں سلام

کیوں نہ تجھ پہ فدا ہو دل و جاں مری
تو ہے جان منیر تجھ پہ لاکھوں سلام

منیر عالم

پیارے نبی کی پیاری باتیں

سید اختر ناز

دائرہ حقوق اللہ اور حقوق العباد

حقوق اللہ اور حقوق العباد کوئی ایک دوسرے سے کٹے ہوئے یا علیحدہ نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط اور پیوست ہیں، ایک کی ادائیگی سے دوسرے کی بھی ادائیگی ہو جاتی ہے، حقوق العباد کی ادائیگی کا حکم چونکہ اللہ کی طرف سے ہے، لہٰذا اس کی ادائیگی سے اللہ کے حکم کی ادائیگی ہوگی اور اس طرح حقوق اللہ کے زمرے میں آئے گی اور یہ عبادت شمار ہوتی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"راستے سے تکلیف دو چیز ہٹانا بھی نیکی ہے۔"

راستہ میں پڑا پتھر چونکہ مخلوق خدا کو تکلیف دیتا ہے، اس لئے اس کے ہٹانے کو بھی حقوق اللہ کی ادائیگی سے متصور کر کے نیکی مانا جائے گا۔

حقوق اللہ میں مندرجہ ذیل اہم پہلوؤں پر ایمان لانا ضروری ہے۔

۱۔ توحید باری تعالیٰ
۲۔ قیام صلوۃ یا عبادت
۳۔ ادائیگی زکوۃ
۴۔ اہتمام صیام
۵۔ ادائیگی مناسک حج
۶۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر یا جہاد

اللہ تعالیٰ نے اپنی ترتیب میں حقوق العباد کو اپنے حقوق کی نسبت زیادہ اہمیت دی ہے، عام لوگوں میں غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ حقوق اللہ کو حقوق العباد پر برتری حاصل ہے اس لئے وہ نماز، روزہ کا کچھ اہتمام کر لیتے ہیں، لیکن حقوق العباد کی نگہداشت نہیں کرتے جس کے نتیجہ میں عدل و احسان کا فقدان ہو جاتا ہے اور معاشرہ نفاق، انتشار، عدم اطمینان اور تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے، حقوق اللہ میں کوتاہی تو شاید اللہ تعالیٰ کی رحیمی و کریمی کے طفیل عفو و درگزر کی وجہ سے معاف ہو جائے لیکن حقوق العباد یعنی حقوق انسانی کے سلسلے میں کیے جانے والے گناہوں کی اللہ تعالیٰ سے معافی کی کوئی امید نہیں ہے کیونکہ بندے کا گناہ تو بندہ ہی معاف کر سکتا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حوالے سے فرمایا۔

"کیا جانتے ہو مفلس کون ہوتا ہے؟"

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا۔

"جس کے پاس درہم و دینار نہ ہوں۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"نہیں! مفلس وہ ہے جو آخرت میں اس حال میں ہو جائے گا کہ اس کے پاس نماز بھی ہو گی، روزہ بھی ہوگا، زکوۃ بھی ادا کی ہو گی اور حج بھی کر لیا ہوگا مگر وہ گناہ جو لوگوں کو گالیاں دے کر، غیبت کر کے یا کسی فرد کا حق مار کر مفاد اٹھایا ہوگا، وہ اسے کیسے جنت میں جانے دے گا، جن کا حق مارا ہو گا وہ اس کی نیکیاں لے کر جائیں گے اور اگر نیکیاں نہیں کی ہوں گی تو اس پر لوگوں کے گناہ ڈال دیئے جائیں گے اور وہ جہنم کا ایندھن بنے گا۔" اسی وجہ سے محسن انسانیت خیر

الانام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ بڑھ چڑھ کر نیکیاں کیا کرو اور کبھی بھی نیکی کو حقیر نہ سمجھو، چاہے ایک کھجور کا صدقہ ہی کیوں نہ ہو۔

حقوق العباد پر اللہ تعالیٰ کا زور اس لئے بھی ہے کہ حقوق العباد کی روگردانی سے خود بنی نوع انسان کو نقصان ہوتا ہے، عدل و توازن برقرار نہیں رہتا، ظلم پھیلتا ہے اور عفو و احسان سکڑتا ہے، اخوت و مساوات ختم ہوتی ہے اور ظاہر ہے ایسا ماحول جہنم سے کم نہیں ہے، اس لئے انسان کی نجات کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام مبعوث فرمائے جن کا کام تذکیہ نفس اور حکمت کی تعلیم تھا تا کہ خلافت ارضی پر مامور حضرت انسان کو فرائض خلافت کی ذمہ داریوں کے حوالے سے تیار کر سکیں، آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان حقوق اللہ اور حقوق العباد کے باہمی تعلق اور نجات اخروی میں ان کی اہمیت کو بخوبی واضح کر دیتا ہے۔

جنت میں لے جانے والے اعمال

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''جنت میں لے جانے والے اعمال یہ ہیں۔''

اللہ کی عبادت ایسے خلوص سے کرو کہ اللہ کے سوا نہ صرف یہ کہ کسی غیر کی عبادت نہ کرو بلکہ اللہ کی جو عبادت کرو، اس میں شرکت غیر کا شائبہ تک نہ ہو، خالصتاً اللہ کی عبادت ہو اور اللہ کی خوشنودی کے لئے ہو، نماز قائم کرو، زکوۃ ادا کرو اور رشتہ داروں سے میل جول اور حسن سلوک کرو۔''

رزق حلال

ایک اور ارشاد میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''ایک شخص لمبا سفر کر کے غبار میں اٹا ہوا آتا ہے اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر ربی کہتا ہے، دعا کرتا ہے مگر اس کا کھانا، پینا، لباس اور نشو و نما سب حرام کی کمائی سے ہے تو اس کی دعا کہاں قبول ہو گی۔''

نیکی کیا ہے

حضرت وابصہ ابن معبد رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے فرمایا۔

''تم پوچھنے آئے ہو کہ نیکی کیا ہے؟ اور گناہ کیا؟''

میں نے عرض کیا۔

''ہاں''

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انگلیوں کو اٹھا کر اور میرے سینہ پر مار کر فرمایا۔

''اپنے آپ سے دریافت کر، اپنے دل سے دریافت کرو۔''

پھر فرمایا۔

''نیکی وہ ہے جس سے انسان خود مطمئن ہو جائے اور اس کے دل کو اطمینان ہو جائے اور گناہ وہ ہے جس سے انسان کا ضمیر خلش محسوس کرے اور جس سے اس کے سینہ میں شک پیدا ہو جائے۔''

جب ایک شخص کسی دوسرے شخص کے حقوق پر دست درازی کرتا ہے تو وہ در حقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی حفاظت کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے اس لئے اگر وہ کسی کی جان لیتا

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ 5.L/78 تحصیل وضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

ہے تو اس کی جان لے لی جاتی ہے، اگر وہ کسی کی تہمت لگا کر بے عزتی کرتا ہے تو وہ ہمیشہ کے لئے غیر معتبر ٹھہر جاتا ہے، اسی طرح کوئی محفوظ مال چراتا ہے تو گویا وہ اپنے بھائی کا حق مار کر جرم کا مرتکب ہو جاتا ہے، غرضیکہ یہ سارے جرائم ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بندوں کے خلاف ہوتے ہیں تو اس سے بندوں کا خالق متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، چنانچہ اسی وجہ سے اس نے معاشرے میں ایسے لوگوں کی سرکوبی کے لئے حدود کا تعین کر دیا ہے جو قرآن و حدیث میں بیان کر دی گئی ہیں۔

حقوق نفس

نفس سے مراد انسانی جان ہے جو کہ شخصیت انسانی کی تمام ظاہری و باطنی کیفیات پر محیط ہے، لہٰذا نفس کے حقوق وہی ہوں گے جو انسان کے جسم اور اس کی روح کے حقوق ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے لئے فرمایا۔

''بے شک تیری جان کا تجھ پر حق ہے، تیرے بدن کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے۔''

قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

''اللہ تعالیٰ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا بلکہ اس طاقت کے مطابق اس کے لئے وہی کچھ ہے جو اس نے کمایا اور اس پر وہی ہے جو اس نے کیا۔'' (البقرہ۔۲)

اور قرآن مجید میں ایک جگہ اور ارشاد ہے۔

''اپنی جانوں اور اپنے اہل خانہ کی جانوں کو آگ سے بچاؤ۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے سورۃ شعراء کی آیت ۲۱۴ نازل فرمائی کہ ''اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ'' تو آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھڑے ہو کر فرمایا۔

''اے گروہ قریش! اپنی جانوں کو (جہنم سے) بچا لو، میں تم کو عذاب الٰہی سے ذرا بھی بچا نہ سکوں گا۔'' پھر آپ نے نام لے لے کر بنی عبد مناف، حضرت عباس بن عبد المطلب اور اپنی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے کہا۔

''میں آپ کو اللہ کی گرفت سے ذرا بھی نہ بچا سکوں گا۔'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بیٹی سے کہا۔

''اے فاطمہ میری بیٹی! تم مجھ سے میرے مال میں سے جو چاہو لے لو مگر میں اللہ تعالیٰ کی گرفت سے تمہیں ذرا بھی نہ بچا سکوں گا۔''

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دیہاتی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مکہ سے ہجرت کی اجازت طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''نادان ہجرت بہت مشکل کام ہے تم اگر سمندروں کے اس پار رہتے ہوئے بھی نیک عمل کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے کسی عمل کو ضائع نہیں کرے گا اور اس کا اجر تم کو مل کر رہے گا۔'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے دریافت فرمایا۔

''کیا تمہارے پاس اونٹ ہیں اور کیا تم ان کی زکوٰۃ ادا کرتے ہو؟'' اس نے عرض کیا۔

''ہاں!'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''تو پھر زکوٰۃ ادا کرتے رہو۔''

• حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''جب تم میں سے کوئی بستر پر جانے لگے تو تو اسے چاہیے کہ پہلے بستر کو جھاڑ لے، اسے نہیں معلوم کہ اس کے پیچھے اس پر کیا چیز آئی پھر کہے

اے میرے مالک! میں تیرے ہی نام سے اپنا پہلو بستر پر رکھ رہا ہوں اور تیرا ہی نام لے کر اسے بستر سے اٹھاؤں گا، اگر اس دوران تو میری روح قبض کرے تو اس پر رحم فرمائیو اور اگر تو اسے آزاد رکھے تو اس کی اس طرح حفاظت فرما جیسے تو اپنے نیک بندوں کی حفاظت فرماتا ہے۔"

مسافر کے لئے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"سفر ایک طرح کا عذاب ہے، جس کی وجہ سے انسان کھانے، پینے اور سونے سے محروم رہتا ہے اس لئے مسافر کو چاہیے کہ وہ اپنے کام سے فارغ ہوتے ہی اپنے اہل وعیال کے پاس پہنچنے میں جلدی کرے۔" (بخاری ۱۹:۲۶)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"سوتے وقت اپنے گھروں میں آگ جلتی نہ چھوڑو۔" (بخاری ۷۹:۴۹)

سوال نہ کرنا

حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ انصار میں سے چند لوگوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کچھ طلب کیا آپ نے انہیں دے دیا، انہوں نے پھر مانگا آپ نے پھر عطا فرمایا حتیٰ کہ جو کچھ آپ کے پاس موجود تھا سب ختم ہو گیا پھر آپ نے ارشاد فرمایا۔

"میرے ہاں جو مال ہوتا ہے، میں اس کے دینے میں دریغ نہیں کرتا اور تم سے بچا کر نہیں رکھتا لیکن جو شخص سوال کرنے سے باز رہتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے صبر آسان کر دیتا ہے اور کسی کو کوئی عطائے الٰہی صبر سے زیادہ بہتر اور وسعت والی نہیں ملی۔" (بخاری ۸:۲۵)

حیاء

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"حیاء صرف بھلائی لاتی ہے۔" (بخاری ۷۸:۷۷)

دیور سے پردہ

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"عورتوں کے پاس جانے سے خود کو بچاؤ۔"

ایک انصاری نے دریافت کیا۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم! دیور کے بارے میں کیا حکم ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"دیور تو موت ہے۔" (بخاری ۶۷:۱۱)

صدقہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"جب کوئی شخص اپنی پاک کمائی میں سے ایک کھجور کے برابر بھی صدقہ دیتا ہے تو اللہ اسے بڑھاتا ہے حتیٰ کہ وہ پہاڑ کی شکل ہو جاتا ہے۔" (بخاری ۹۷:۲۳)

گھر والوں پر خرچ

حضرت ابو مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''مسلمان جب اپنے گھر والوں پر خرچ کرتا ہے اور خرچ کرتے وقت ثواب کی امید رکھتا ہے تو وہ خرچ اس کا صدقہ بن جاتا ہے۔'' (بخاری ۱:۲۹۱)

صدقہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ''انسانوں کے جسم میں جتنے جوڑ ہیں ان میں سے ہر ایک پر صدقہ واجب ہے ہر روز جب آفتاب طلوع ہوتا ہے تو دو آدمیوں کے درمیان انصاف سے فیصلہ کر دینا بھی صدقہ ہے اور کسی کی مدد کرنا اس طرح کہ اسے اپنی سواری پر بٹھا کر اس کا سامان لاد کر منزل تک پہنچا دے یہ بھی صدقہ ہے اور کلمہ خیر یا اچھی بات کہنا بھی صدقہ ہے اور ہر وہ قدم جو نماز کے لئے مسجد کو جاتے ہوئے اٹھتا ہے وہ بھی صدقہ ہے اور راستے میں ایذا رساں چیز ہٹانا صدقہ ہے۔'' (بخاری ۵۶:۱۲۸)

سوال کرنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''انسان کا جنگل سے لکڑیوں کا گٹھا کمر پر اٹھا کر لانا اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ کسی کے آگے دست سوال دراز کرے جو اسے کچھ دے یا انکار کر دے۔'' (بخاری ۳۴:۲۳)

دھوکا دینا

حضرت عبد اللہ بن عمر سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''جب تم کچھ خریدو یا بیچو تو کہہ دیا کرو لاخلابہ'' (یعنی بلا کسی دھوکے کے عیب ذکر کر دیا کرو۔) (بخاری ۳۴:۴۸)

سود

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، کسی سے حسد نہ کرو اور نہ آپس میں بول چال بند کرو اور سب اللہ کے بندو ایک دوسرے کے بھائی بن کر زندگی گزارو اور کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی سے تعلقات یا بول چال ترک کرے۔'' (بخاری ۷۸:۵۷)

مسلمانوں کے حقوق

حضرت عبد اللہ بن عمر سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے اور بھائی نہ تو اپنے بھائی پر ظلم کرتا ہے اور نہ اس کو ظلم یا تکلیف میں مبتلا دیکھ سکتا ہے اور جو شخص اپنے بھائی کی حاجت روائی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات کا کفیل ہو جاتا ہے اور جو شخص کسی ایک مسلمان کی تکلیف دور کرتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکالیف میں سے ایک تکلیف دور فرمائے گا اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی کرے گا۔'' (بخاری ۴۶:۳)

☆☆☆

ابن انشاء

راہوں میں پتھر
جلسوں میں پتھر
سینوں میں پتھر
عقلوں پہ پتھر
آستانوں پہ پتھر
دیوانوں پہ پتھر
پتھر ہی پتھر
یہ زمانہ پتھر کا زمانہ کہلاتا ہے۔

دیگیں ہی دیگیں
چمچے ہی چمچے
سکے ہی سکے
پیسے ہی پیسے
سونا ہی سونا
چاندی ہی چاندی
یہ زمانہ دھات کا زمانہ کہلاتا ہے۔

لوگ سونے چاندی کو زنجیریں بناتے ہیں
ہمیں اور آپ کو پہناتے ہیں
ہم اور آپ پہن کر خوش رہتے ہیں
بلکہ تھینک یو بھی کہتے ہیں
ایک اور زمانہ ہے آئرن ایج

یعنی لوہے کا زمانہ
لوہا وہ دھات ہے
جس کا سب لوہا مانتے ہیں
ہل کا پھل بھی لوہا
کارخانے کی کل بھی لوہا
لوہا مقناطیس بن جاتا ہے
تو چاندی تک کو کھینچ لاتا ہے
سوسنار کی ایک لوہار کی
سونے والے لوہے والوں سے ڈرتے ہیں
لیکن کوئی کہاں تک رکوائے گا
ہمارے ہاں بھی لوہے کا زمانہ آئے گا
کچا لوہا اور کسی کام نہیں
بس اس سے آدمی بناتے ہیں
جو مرد آہن کہلاتے ہیں
ان کو زنگ لگ جاتا ہے

بلکہ کھا جاتا ہے
پھر بھی لوگ گھوڑے پر سے اٹھلاتے ہیں
زندہ باد کے نعروں سے جلاتے ہیں

....

یہ اور دور ہے
لوگ ننگے گھومتے ہیں
کاغذ کا آدمی
کاغذ کے جنگل
کاغذ کے شیر
ذرا نم ہو تو سب کے سب ڈھیر
کاغذ کے نوٹ
کاغذ کے ووٹ
کاغذ کا ایمان
کاغذ کا مسلمان
کاغذ کے اخبار
اور کاغذ ہی کے کالم نگار

یہ سارا کاغذ کا دور ہے

ننگے ناچتے ہیں
ننگے کلبوں میں جاتے ہیں
ایک دوسرے کو جلسوں میں ننگا کرتے ہیں
عوام تک کے کپڑے اتار لیتے ہیں
بلکہ کھال کھینچ لیتے ہیں
کھالوں سے زرمبادلہ کماتے ہیں
گوشت کچا کھا جاتے ہیں
نہ چولھا ہے نہ سیخ ہے

یہ زمانہ قبل از تاریخ ہے

ملاوٹ کی صنعت
رشوت کی صنعت
کوٹھی کی صنعت
پگڑی کی صنعت
حلوے کی صنعت
مانڈے کی صنعت
بیانوں اور نعروں کی صنعت
تعویذوں اور گنڈوں کی صنعت

یہ ہمارے ہاں کا صنعتی دور ہے

کاغذ کے کپڑے
کاغذ کے مکان
اب اس آخری دور کو دیکھیے
پیٹ روٹی سے خالی
جیب پیسے سے خالی
باتیں بصیرت سے خالی
وعدے حقیقت سے خالی
دل درد سے خالی
دماغ عقل سے خالی
شہر فرزانوں سے خالی
جنگل دیوانوں سے خالی

یہ خلائی دور ہے

لوگ تو ہم کے غبارے پھلاتے ہیں
معجون فلک سیر کھاتے ہیں
رویت ہلال کمیٹیاں بناتے ہیں
آسمان کے تارے توڑ لاتے ہیں
ڈٹ کے دبے نوش فرماتے ہیں
بیت الخلا میں مدار پر پہنچ جاتے ہیں
ہمارے ہاں کا خلائی دور یہی ہے

☆☆☆

ایک دن حنا کے ساتھ

مہمان: سحرش بانو

قاری کا منصف سے دلی و جذباتی تعلق ہوتا ہے، ایسا تعلق جوان کے دلوں کو جکڑے رکھتا ہے، ہماری قارئین بھی مصنفین سے ایسی ہی دلی وابستگی رکھتی ہیں اور وہ مصنفین کے بارے میں جاننا چاہتی ہیں کہ ان کی ذاتی زندگی، خیالات، احساسات وہ جاننا چاہتی ہیں کہ کیا مصنفین بھی عام لوگوں کی طرح ہوتے ہیں یا ان کے شب و روز میں کچھ انوکھا ہے ہم نے قارئین کی دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک سلسلہ شروع کیا ہے ''ایک دن حنا کے نام'' جس میں ہر ماہ ایک مصنفہ اپنے ایک دن کا احوال لکھیں گی جو صبح آنکھ کھلنے سے لے کر رات نیند کو خوش آمدید کہنے تک وہ کون کون سی مصروفیات ہے لکھنے کے علاوہ جو وہ انجام دیتی ہے، امید ہے آپ کو یہ سلسلہ پسند آئے گا۔

فوزیہ شفیق

پڑھنے والی آنکھوں اور سننے والے کانوں کو میرا اخلوص بھرا اسلام۔

امید واثق سب خیر خیریت سے ہونگے اور دعا کامل کے خدا ہمیں اور آپ سب کو اپنے حفظ وامان میں رکھے آمین۔

قارئین کرام! ایک دن حنا کے ساتھ، میں شرکت کی سب سے بڑی وجہ فوزیہ آپی کی ہلکی ہلکی سی وہ خفگی ہے جو یہاں ان سے بہت دور ہونے کے باوجود بھی محسوس ہوئی سو کاغذ قلم اٹھایا جھٹ سے کچھ کاغذ سیاہ کیے روانہ کرنے سے پہلے خیال آیا ایک کے ساتھ ایک فری والا معاملہ کرتے ذرا حنا کے ساتھ اپنے ایک دن کی روداد بھی شیئر کر لوں، (فوزیہ یہ رشوت نہیں ہے) کے بہت عرصہ پہلے یہ درخواست موصول ہو چکی تھی مگر میری سستی اور کام چوری کی نظر ہو چکی تھی۔

قارئین! فوزیہ میری بہت اچھی دوست ہیں، رہبر ہیں، استاد ہیں، محسن ہیں، بہت اچھی ہیں اور مجھے بہت پسند بھی ہیں۔

اب ذرا اپنی بات کروں تو حنا کے ساتھ تعلق دو سال پرانا ہے (خالدہ نثار کے نام سے آپ پہلے مجھے پڑھتے رہے ہیں، فوزیہ تو اب بھی خالدہ ہی کہتی ہیں کے بقول ان کے انہیں میرا

یہی نام اچھا لگتا ہے)۔
سحرش بانو کے نام سے بھی آپ نے مجھے حنا کی زینت بنتے دیکھا اور انشاء اللہ بشرط زندگی یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔
جہاں تک روز و شب کی بات ہے تو میرے لیے دن کا آغاز بہت جلدی ہو جاتا ہے، صبح ناشتہ بنانا، سرو کرنا، گھر کے چھوٹے موٹے کام۔
لیجیے دس بج گئے، اب فائل کھولی، پین اٹھایا اور لکھنا، پڑھنا شروع، لنچ ٹائم تک لکھا، لنچ کیا، ظہر ادا کی اور پھر کوئی کتاب اٹھالی، شام کی چائے پی کر کچن کی راہ لی، ہانڈی چولہا (عورت کی اصل پہچان) عصر اور مغرب کی ادائیگی کے بعد ذرا ٹی وی کے آگے بیٹھ کر دن بھر کی نیوز پہ نظر ڈالی، روٹی بنانے اور کھانے کے بعد ذرا فرصت سے F.B اور WHATS APP پر جھانکی ماری، میوزک سے جی بہلایا، کبھی شاعرانہ موڈ بنا تو محسن نقوی، غالب یا اقبال اور فیض کے ساتھ وقت گزارا، کبھی گرین ٹی کا کپ لئے بہن کے ساتھ واک کرتے دنیا جہاں کی باتیں کر لی، عشاء ادا کرتے ہی بستر میں، پھر میں اور میری کتابیں، کتاب پڑھتے پڑھتے ہی نیند کی وادی میں گم اور اگلی صبح سے پھر یہی روٹین، مگر یہ آج کل کی روٹین ہے جب ذرا فرصت کے پل میسر ہیں، ورنہ چند دن پہلے TRIPLE-APP میں ایز DOVLPER کام کرتے اس سے پہلے انشورنس کمپنی میں SALES MANGER کے طور پر فرائض انجام دیئے اور اس سے بھی چند دن پہلے سکول ٹیچنگ کرتے روٹین خاصی ٹف تھی میری، یہ تھے محدود سے روز و شب میرے جو آپ کے ساتھ شیئر کیے، امید ہے آپ کا زیادہ وقت نہیں لیا میں نے اور آخر میں ایک بات۔
کاغذ اور قلم اٹھاتے اور کسی بھی تحریر کو آپ سب کے سامنے لاتے ہمیشہ جو چیز اہم رہی میرے لئے وہ مقصدیت ہے، کوشش یہی ہوتی ہے میری کے اپنی تحریر کے ذریعے کسی اچھے اور مثبت پیغام کو سامنے لاؤں، میرا قاری جب میری تحریر پڑھ کے اٹھے تو کچھ نہ کچھ سیکھ کر اٹھے، میں اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوئی ہوں اس کا فیصلہ آپ لوگوں نے کرنا ہے اور آپ سب سے ان چند الفاظ کے ذریعے بس اتنی سی گزارش ہے ہمیشہ اچھی اور با مقصد چیز پڑھیں، کیونکہ ایک اچھی تحریر آپ پر اچھا اثر ڈالے گی اور بری تحریر یقیناً برا، کہانی کو صرف ایک کہانی سمجھ کر پڑھنے کے بجائے اس میں سے کچھ نہ کچھ سیکھنے کی کوشش کریں، اسی چھوٹی سی بات کے ساتھ اجازت چاہوں رہیں خوش رہیں۔ ☆☆☆

اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیئے

ابن انشاء

- اردو کی آخری کتاب............ ☆
- خمار گندم............ ☆
- دنیا گول ہے............ ☆
- آوارہ گرد کی ڈائری............ ☆
- ابن بطوطہ کے تعاقب میں............ ☆
- چلتے ہو تو چین کو چلئے............ ☆
- نگری نگری پھرا مسافر............ ☆
- خط انشاجی کے............ ☆

www.paksociety.com
کرنیں ہمیں سے پھوٹیں گی
مصباح علی سید
Downloaded From paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

بے پناہ گونجتی تالیاں، روشن تابناک چمکتی
پیشانیاں، ماضی کو سینوں میں دبائے آنے والے
کل کی خوابناکی رقصاں کرتی فطین آنکھیں اور
ان سب کے بیچ و بیچ آغا عثمان ہرے پتوں اور
کونپلوں سے بھرا ننھا سا پودا لئے کھڑے تھے،
تالیوں کا ایسا ساز تھا جس کے تال ٹوٹتے نہ تھے،
عزم رگوں میں گردش کرتا چہرے پر لالی بڑھا رہا
تھا، کبھی جوانی کی بات تھی کچے صحن میں انہوں نے
انار کا پودا لگایا تھا خوب دیکھ دیکھ کر بور آتا پھول
بنتا جھڑ جاتا، کوئی ایک آدھ انار لگتا کسی میں بمشکل
جوس ہوتا تو کسی میں صرف پھوس، بقر عید قریب
تھی مینڈھا لا کر لاغر درخت ک تنے سے باندھ
دیا، آغا عثمان کو بہت اچھی طرح یاد تھا جب اماں
نے کہا تھا۔

''آغا عثمان! انار ہمیشہ قربانی کے خون سے
پھلتا ہے، جتنا خون ذبیحہ کا زمین میں جائے گا اتنا
پھل پھولے گا۔''

وہ بات ایسی دل کو لگی ہر سال قربانی انار
کے درخت کی چھاؤں میں ہونے لگی، جانے اس
درخت کا پھل پھولا تھا یا نہیں، انار دانے دار
آئے؟ جوس والے آئے؟ یا پھوک والے ہی؟
بس اک بات لاشعور میں بیٹھ گئی تھی قربانی ہو گی تو
انار کے سرسراتے ترش پتوں کی چھاؤں میں ہی،
لیکن اب برس در برس گزر کر اماں کی بات کا
فلسفہ معانی و مطالب بلکہ جامع تشریح کی صورت
نگاہوں کے سامنے تھا، کتنے عظیم فلسفی تھے پرانے
لوگ سادہ لوحی میں اک تجربہ چھپا رکھتے تھے،
بوڑھے آغا کے ہاتھوں میں ننھا پودا مدھر ہوا سے
مست لہر رہا تھا، زمین کا سینہ کھلنے کے لئے بے
قرار تھا، کہ عہد کا یہ پودا میری چھاتی پر سجے گا اور
چھاتی کی تمام رستی طاقت اس کو بالا کر تناور درخت
بنا دوں گی، شاخیں لہرائیں گی، جڑیں کونے
کونے میں پھیل جائیں گی، کڑواہٹ کا ست تو
کیا تلخ ہوا کا گزر نہیں ہو گا، اس کی جڑوں کو اپنے
وجود کی مضبوطی عطا کروں گی۔

یہ زمین کا عہد تھا اور یہ زمین اپنے عہد پر
ہمیشہ پوری اتری ہے، وہ زمین جس کے سینے پہ
جا بجا کرب ہے، جسے چھلنی کیا گیا، رگیدا گیا،
پامال کیا گیا، کبھی معصوم فرشتوں کا خون انڈیل کر
تو کبھی جوانوں کا گرماتا لہو چھڑک کر، یہاں تک
کہ اس کی بوڑھی ہوتی جھریوں کا بھی خیال نہ
کیا، عدالت کے سامنے میزان رکھنے والے سیاہ
کوٹوں کو سفید براق پروں میں لپیٹ کر اس کی
کوکھ میں خاموشی سے دبا دیا، زمین نے سسکاری
بھی اپنی، اپنے ہی دانتوں سے دبالی، ضعیف
آنکھوں نے نیل بہا دیئے، کپکپاتے پپوٹوں نے
اس کے سینے سے لپٹ کر ہچکیاں بھریں، لیکن اس
زمین کا سکتہ نہیں ٹوٹا، امانت دار ہونے کا عہد
ٹھوس اٹل اپنی جگہ، کچھ رائیگاں نہیں گیا۔

''نہ خون، نہ آنسو۔''

☆☆☆

اسی زمین کی بخشی طاقت تھی کہ آغا عثمان
نے تقریب کے باقاعدہ آغاز کے لئے تیرہ سالہ
بچے کو تلاوت قرآن پاک کی دعوت دی، وہ سورۃ
النصر کی قرآت کر رہا تھا۔

''جب آئے مدد خدا کی، اور فتح ہو (مکہ)
اور دیکھے تو لوگوں کو داخل ہوتے ہیں، اللہ کے
دین میں، فوج در فوج، پس پاکی بیان کر اپنے
پروردگار کی تعریف کے ساتھ اور اس سے بخشش
مانگ، بے شک کہ وہی توبہ قبول کرنے والا
ہے۔''

تلاوت و ترجمہ کے اختتام پر بے شک
''جزاک اللہ'' کہتے آغا عثمان نے اس کے کتبے
کے پاس پودا لگایا ابھی وہ سیدھے ہو کر دعا مانگنا

چاہتے تھے کہ شہید قاسم کی تین سالہ بیٹی نور ابول پڑی۔

''عثمان چاچا، سب سے پہلے میرا نام رجسٹر کرو۔''

اس کے استحقاق بھرے لہجے کے تحکم میں وہ لحہ بھر کے لئے چونکے، سفیدی میں بجھتی آنکھیں قندیل کی طرح چمک کر پھیل گئیں، سوکھے لبوں پر سنجیدگی کی جگہ مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوئی اور قندیل ڈبڈبا گئی۔

☆☆☆

''بابا ام پڑھے گا! ام بہت پڑھے گا۔''

''اوہ بابا تم نے اور کتنا پڑھنا ہے۔''

آغا عثمان اسے سمجھا سمجھا تھک جاتے، لیکن وہ اپنے نام کی ایک تھی، کھانا کھاتے کتاب گود میں دھری، ہنڈیا پکاتے اونچی سوکھی لکڑیوں کے ڈھیر پہ کھلی رکھی کتاب، صبح کتاب، شام کو سونے سے پہلے کتاب، رات کا آخری پہر ہوتا قلم اور کتاب اس لڑکی کی گود میں ہوتے تھے، وہ قلم جس کی قسم اللہ نے کھائی ہے کہ اس کے ذریعے اللہ نے اپنے بندے کو علم دیا، ہونہہ بھلا پھر یہ قلم گمراہ کیسے کر سکتا ہے۔ بے حیائی کیسے پھیلا سکتا ہے، جس کا مقصد ہی صفحہ قرطاس پر بکھر کر ذہنوں کو جلا بخشتا ہے وہ اندھیروں میں کیسے دھکیل سکتا ہے۔

علم کے دشمن کو یہ بات کون سکھائے
تیرے ذہن کی سیاہی دھوتا ہے قلم میرا

خاندان کی پہلی لڑکی تھی جو ضد، لڑ جھگڑ کر پانچ سال کی عمر میں داخل ہوئی تھی، باقی آٹھ آٹھ، دس دس سال کی لڑکیاں ابھی پہاڑوں پر نکلتیں، پھلانگتیں، یا شاخ سے ریوڑ ہانکتی، مگر وہ نیا سکول کھلتے دیکھتے ہی بابا کے سر ہو گئی، کہ سب سے پہلے اس کا داخلہ ہو گا۔

''ابھی تم بہت چھوٹی ہے گل پنیرے۔'' اماں نے بہت سمجھایا۔

چاچی نے باتوں باتوں میں کتابوں، استانیوں سے ڈرایا، مگر گل پنیرے کی ایک ہی بات۔

''ام چھوٹا نہیں ایں، یہ دیکھو۔'' اس نے کپڑوں کی گٹھڑی اٹھالی۔

''جب ام یہ اٹھا سکتا ہے تو بستہ تو ہلکا ہوتا ہے چاچی، ام وہ اٹھا لے گا۔'' سبز آنکھیں گھما گھما کر ابا سے ضد، چچا، تایا سے ایک ہی ضد۔

''ام کو سکول چھوڑ کر آؤ۔''

آخر ابا نے انگلی پکڑی، اماں نے دوپٹہ درست کیا اور گل پنیرے کو سکول چھوڑ آئے، اتنی لگن شاید کسی اور طالبہ کو ہو جتنی اسے تھی، اپنا تو یاد کر سو کر دوسرے بچوں کا بھی سبق یاد کر لیتی، سکول کی کتابیں، قرآن کا ترجمہ، استاد حیران، ماں باپ فاخر۔

''تم ملک کا نام بہت روشن کرو گی گل پنیرے۔''

اس کی استانی ہمیشہ اس کے ریشمی بھرے گالوں پہ نرمی سے چٹکی لیتے ہوئے کہتی تھی۔

اور یہ اس کی طلب کی روشنی تھی جو کم نہ ہوتی تھی، نہ پرائمری میں نہ مڈل میں اور نہ ہی ہائی حصے میں جا کر ہمیشہ سب سے اچھے نمبر، سب سے پہلی پوزیشن نے خواہشوں کو اڑان دے دی، اماں ابا کالج کے لئے بے حد مشکل سے مگر مان ہی گئے، وہاں بھی اے پلس۔

☆☆☆

سرد ٹھٹھرتی چٹانیں، مکئی کے اونچے کھیتوں پہ گرتے برف سے ریزے، تعلیم وہاں کے رہائشیوں کا بھی حق تھا، جانے کس علم کے پیاسے کو خیال آیا اور اس علاقے کے لئے نئی یونیورسٹی

کا قیام ہوا، آغا عثمان کی ویران پڑی زمین کے قریب ہی یونیورسٹی کی عمارت تعمیر ہونے لگی۔

ابا جب جب آ کر بتاتے گل پنیرے کی آنکھیں الوہی خواہش سے دمک جاتیں کیا زمرد کی چمک ہو گی جو اس صبیح چہرے پر آنکھیں ہیرے کی طرح چمکتی تھیں پہلا سیشن شروع ہوا پنیرے نے باپ کی منتیں شروع کر دیں۔

''بابا تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے، امم تمہاری شادی کا سوچتا ہے اور تم کو آگے پڑھنے کی لگی ہے۔''

''بابا آپ میرے اچھے بابا نہیں ہیں، مجھے پڑھنے دیں۔''

''بچے وہاں لڑکے بھی پڑھتا ہے، اب تم لڑکوں کے ساتھ پڑھے گا؟'' ابا کے لہجے اور آنکھوں میں حیرانگی تھی، اس نے اپنی مسکراہٹ دبا کر پوری سنجیدگی سے کہا تھا۔

''بابا میں پہلے بھی پردہ کرتی ہوں، اب بھی کروں گی، پھر کیا مسئلہ ہے۔''

''مسئلہ ہے بچے۔''

''کیا؟''

''اتنی دور کیسے جائے گا؟''

''جب تم زمینوں پر جائے گا، مجھے بھی ساتھ لے جانا، امم پیدل چل لے گا بابا۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے پنیرے کے ابا۔''

اماں دور چولہے کے پاس سے ہی دھاڑی تھیں۔

''امم نے کون سا تم سے کاروبار کروانا ہے جو یوں روز روز اتنی دور جائے گا۔''

.کاروبار کوئی گناہ بھی نہیں ہے، اگر ہوتا تو بی بی خدیجہؓ کا مال تجارت آپؐ کبھی نہ لے کر جاتے، بی بی صفیہؓ سپاہوں کے تیرکش نہ بھرتیں، بی بی عمارہؓ کو زخموں کی مرہم پٹی سے روک دیا جاتا، جب اتنی بزرگ عظیم ہستیوں کو کام سے نہیں روکا گیا، تو ہم گناہ گاروں کو کیوں اماں نام نہاد پردے کے لئے روک دیا جاتا ہے۔''

''پتا نہیں پنیرے تم کیسی باتیں کرتا ہے۔''

اماں ہاتھ جھاڑ جان چھڑا کر اٹھ گئیں اور وہ رکنے والی تھی اب، ابا کے سر ہو گئی اور منوا کر اٹھی، حالانکہ چاچا نے بہت رخنے ڈالے۔

''تم اتنا بے غیرت ہے عثمان کاکا، تمہارا بچی لڑکوں کے ساتھ پڑھے گا، اوہ بے غیرتا وہ بھاگ جائے گا کسی کے ساتھ، تم سینہ پیٹتا رہ جائے گا۔''

''بابا تمہیں اپنی بیٹی، گل پنیرے پر اعتبار نہیں اے۔'' اس نے باپ کو فیصلے پر ڈگمگاتے دیکھ کر گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔

''بابا ہمارا سر آپ کی غیرت کے لئے کٹ جائے گا مگر، آپ کے سر کو جھکنے نہیں دے گا۔'' اس کے آنسوؤں سے آغا عثمان کے گھٹنے خم ہو گئے، انہوں نے اس کے نرم بالوں کو سہلایا اس نے اپنا گیلا چہرہ اٹھا کر بابا کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

''یاد ہے دادی خارش کرتی زخم چھیلتی مر گئی تھی، ہمارے علاقے میں لیڈی ڈاکٹر نہیں تھی ناں، ہمارے علاقے کو ڈاکٹر کی ضرورت ہے، استانی چاہیے بابا، ہماری لڑکیوں کو نہیں پتا دنیا کتنی آگے بڑھ گئی ہے، ہم پہاڑوں پر ضرور رہتے ہیں مگر ہمیں شیرنیاں ہرنیاں بن کر نہیں جینا، ہمیں اللہ نے انسان بنایا ہے اشرف المخلوقات، وہ حدیث بھول گئے، کہ باپ اگر بیٹی کو کچھ دے سکتا ہے تو وہ بہتر تعلیم ہے۔'' بابا سر اثبات میں ہلا تھا وہ مان گئے تھے۔

☆☆☆

شیر قاسم علی بھی کچھ ایسی ہی باتیں کرتا تھا، خاندان بھر سے الگ اک جستجو، اک لگن تھی آگے

بڑھنے کی، سخت پتھر اس کی ہمت پر بجھ بجھ جاتے، اونچے نیچے راستوں پر کوسوں چل کر کالج جاتا تھا، تب بہت کٹھن راستہ تھا، روزگار کی محنت الگ سے کرنی، اپنی محنت کے بل بوتے پر نئی دنیا پہاڑوں پر آباد کرنے کا خواب جگاتا تھا، اک ہی بات پر کسی سے کہتا۔

''ہم پہاڑوں پر بسنے والے انسان ہیں، غاروں میں چھپنے والے درندے نہیں، ہماری فطرت بلند ہے، نئی کہکشائیں دریافت کرنا ہے، روزگار چاہیے، شعور چاہیے، عورتوں، بچوں کا تحفظ، تعلیم چاہیے۔''

وہ فزیالوجی میں پی ایچ ڈی کر کے اپنے علاقے کو بدلنے کا خواب لے کر واپس وطن آیا تھا، یونیورسٹی میں اسے بہترین ملازمت ملی، زندگی میں شریک سفر شامل ہوئی، پیاری سی گڑیا دنیا میں آگئی، اب تھکن اترنے کا وقت آگیا تھا، مگر درندے پیچھے سے وار کرتے ہیں، موسم کی آڑ لیتے ہیں، پہاڑوں کے ہر زرے پر شعور بکھیرنے والی آنکھوں کے خوابوں کو نوچ ڈالا، دھند کی آڑ لے کر گرماتا لہو تھا اور صف ماتم تھی، زمین کے ناخداؤں نے ہاتھوں میں دبے قلموں کو سرخ سیاہی پلا دی۔

گل پنیرے اور شیر قاسم علی شاید کسی اور دنیا کے باسی تھے ان پہاڑوں پر ان کا بسیرا مشکل تھا، اس خاک کا پانی انہیں موافق نہیں تھا لیکچر دیتا استاد شیر قاسم علی اور لیکچر کو تیزی سے کاغذ پر سجاتی شاگرد گل پنیرے اور بہت سے، سب کے زخم بہت گہرے تھے بدن چھلنی نال کی آگ سے ہو رہے تھے، بدن کے سوراخوں میں خون کی پچکاریاں تھیں، موسم تو کیا ٹھنڈا ہوا تھا کہ وہ کہتے کہتے ٹھنڈے ہو گئے۔

''قیامت بارود، ناخنوں سے نہیں آئے گی، جہالت سے آئے گی اور یہ کارواں ڈر کر رکنے والا نہیں۔''

آغا عثمان آوازیں سن کر ہی اپنی زمین سے اٹھے بھاگتے چلے گئے وہ چھلنی حالت میں مل گئی، اس کے سینے پر اس کی فائل جمی تھی انگلیوں میں قلم اور قلم سے رستا اس کا تازہ گرم لہو، وہ اسے بانہوں میں اٹھائے بھاگتے، ایمبولینس تک جا رہے تھے مگر سب رستے میں ختم ہو گیا، اسے ایمبولینس میں نہیں بابا کی بانہوں سے زمین پر جانا تھا۔

''بابا روم مت۔'' اس کے آخری لفظ تھے۔

''یہ لہو بہت رنگ لگائے گا اس زمین کو۔''

اور ایسا ہی ہوا تھا، یہ قوم ڈرنے والی نہیں ہے اگر ڈرنے والی ہوتی تو دو سال پہلے ہی ہر درس گاہ پر تالے دیکھائی دیتے، کالے جھنڈے لہرائے جاتے، مگر یہ پڑھانے والی قوم ہے، جسے خداوند تعالیٰ نے قلم کے ذریعے شعور دیا اور آج ایک سال گزر جانے کے بعد ہی شیر قاسم شہد کی بیٹی پلوشے ''گل پنیرے'' ماڈل سکول میں داخلہ لینے کے لئے بے تاب تھی، آغا عثمان نے اپنی تمام زمین درس گاہ کے لئے مختص کر دی اور ذاتی خرچے سے اک چھوٹی سی عمارت بنائی تھی جس کی آج افتتاحی تقریب تھی، انہوں نے پودا گل پنیرے ماڈل سکول کے کتبے کے پاس لگایا اور ننھی پلوشے کو گود میں اٹھالیا اماں کے الفاظ۔

''انار ہمیشہ قربانی کے خون سے پھیلتا ہے، جتنا خون ذبیحہ کا زمین میں جائے گا، اتنا پھل پھولے گا۔''

آج اماں کے حکمت بھرے لفظ کا حرف حرف سمجھ میں آتا تھا، پلوشے کی آنکھوں میں دلیری تھی ٹھوس اٹل عزم تھا، بالکل اپنے باپ قاسم شیر علی کی طرح۔

☆☆☆

محبت جاوداں
فلک ارم ذاکر

ماں جی گھنٹہ بھر سے موبائل کان سے لگائے موبائل کمپنی کی جانب سے دی گئی فری کالز کی سہولت سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے پسندیدہ ترین موضوع پر ہمیشہ کی مانند دل کھول کر اظہار خیال فرمانے میں مگن تھیں۔

''ارے میری ہمت ہے جیسے میں نے ہاجرہ باجی کے ساتھ تحمل مزاجی سے نبھاہ کیا، کہنے کو میرے سسرال میں ساس کے سوا اور کسی سسرالی ہستی کا وجود نہیں تھا، بڑی دو نندیں ہاجرہ باجی اور سلطانہ باجی بیاہی ہوئی تھیں، گھر میں ہم میاں بیوی اور ساس صاحبہ کل ملا کر تین نفوس تھے لیکن......'' وہ لمحہ بھر کو سانس لینے کے لئے ٹھہریں اور پاؤں سمیٹ کر صوفے پر رکھ لئے جبکہ موبائل ایک کان سے ہٹا کر دوسرے کان میں منتقل کیا یہ اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ اب ماں جی ہزار بار کے روئے گئے دکھڑے جب تک ازسرنو بیان نہیں کرلیں گی تب تک کوئی مائی کا لعل ان کے آگے دم نہیں مار سکتا۔

ٹی وی لاؤنج میں ڈھیروں ڈھیر فلور کشن کے درمیان گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز انتہائی کم آواز میں نیشنل جغرافیہ چینل پر جانوروں کے متعلق ڈاکومینٹری فلم ملاحظہ کرتے زوہیب نے ذرا کی ذرا اپنی گردن ترچھی کر کے دائیں طرف کے صوفے پر فرصت سے ماں جی کو یوں پھسکڑا مارتے دیکھا تو وہ اس کے خوبصورت کٹاؤ والے دلکش لبوں کی تراش میں بے ساختہ ہلکی سی مسکراہٹ در آئی وہ اپنے شہر میں اتوار کے دن کی ڈھلتی دوپہر میں ٹی وی کے سامنے براجمان ہونے کے باوجود راولپنڈی میں اپنے سسرال میں فون پر ماں جی سے مخاطب چھوٹی بہن تحریم کا کوفت زدہ چہرہ باآسانی دیکھ سکتا تھا۔

''کیوں بس کروں، ہیں اور سسرالیوں کے

ناولٹ

لاڈ پیار نے تمہیں اتنا خودسر بنا دیا ہے کہ یوں منہ اٹھا کے ماں کو ٹوکنے لگ گئیں ہاں بھئی سلطانہ باجی اپنی پسندیدہ پھپھی کے ہاں بیاہی گئی ہو ہاجرہ باجی کی علیزہ تمہاری جیٹھانی ہے، ددھیال کی محبت میں رہتی ہو اب کہاں ماں کے دکھ سننے کی فرصت، ماں کی باتیں پرانی بے کار لگنے لگی ہیں۔" تحریم نے نجانے کیا کہا تھا جو ماں جی نے باقاعدہ اسے لتاڑ کر رکھ دیا، زوہیب مختلف اندازے لگانے لگا، ماں جی کے آگے دھڑے سے اپنی رائے کا اظہار کرنا صرف تحریم کا ہی خاصہ تھا، کہنے کو وہ زوہیب سے آٹھ سال چھوٹی تھی مگر اس کی نسبت ماں جی کی سرچڑھی تھی یہ اور بات کہ ان کے خصوصی لاڈ پیار کی بدولت ان کے سامنے اپنی بات کہنے کی جرأت کر کے ماں جی کے زیر عتاب بھی وہی آیا کرتی تھیں دو منٹ سے بھی کم عرصہ میں وہ اسے عرش سے فرش پر پٹخ دیا کرتی تھیں اور وہ ہنستے ہنستے چٹکیوں میں ان کا غصہ اڑا دیا کرتی تھی۔

سلطانہ پھپھو کے دو ہی فرزند تھے، چھ ماہ پہلے ہی تحریم ان کے چھوٹے فرزند ارجمند "سعد" کی دلہن بن کر اس شہر سے رخصت ہوئی تھی اور ساری رونقیں گویا اپنے ساتھ ہی لے گئی، گھر کے کونے کونے سے اس کی ہنسی کی کھنک گونجتی محسوس ہوتی تھی، اللہ کا کرم تھا وہ اپنے گھر میں مطمئن وخوش وخرم زندگی گزار رہی تھی۔

وہ اپنے بیاہ سے پہلے زوہیب کا کوئی بندوبست کر کے اس گھر سے رخصت ہونا چاہتی تھی اور اس مقصد کی انجام دہی کی خاطر ماں جی کے ساتھ مل کر بہت سی لڑکیاں دیکھی جا چکی تھیں مگر ماں جی کو اپنے ہیرے جیسے بیٹے کے شایان شان کوئی لڑکی بھاتی ہی نہ تھی۔

کہیں لڑکی پسند نہ آتی، کہیں اس کے گھر والے کے جہاں سب کچھ ٹھیک ہوتا تو ماں جی لڑکی کے لہجہ و ادائیں ناپسند ٹھہراتیں۔

"اُف بیگم اللہ کا خوف کرو، اچھی بھلی لڑکی ہے۔" بابا جی ایک آدھ بار اس مہم میں ان کے ہمراہ شریک ہوئے پھر کانوں کو ہاتھ لگا کر ایک طرف ہو گئے۔

ایک دفعہ بابا جی نے ہاجرہ پھپھی کی سب سے چھوٹی عریشہ کا نام بہو بنانے کی تجویز کے طور پر ان کے سامنے رکھا جواباً ماں جی نے الف تا ے اپنا پسندیدہ موضوع ہاجرہ باجی اور ان کے ماضی میں کیے گئے ظلم پر کچھ اس انداز سے درد بھری تقریر کی کہ بابا جی نے خاموشی اختیار کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔

لیکن ماں جی کی سرچڑھی تحریم کی سوئی عریشہ پر ہی اٹک گئی کئی بار اس کے دل میں بھی یہ آرزو جاگتی جسے وہ ماں جی کی ناراضگی اور انکار کی بدولت دل میں تھپک کر سلا لیتی، لیکن بابا جی کے منہ سے وہی بات سن کر اس نے گرہ میں باندھ لی تھی اور شادی کے بعد اکثر فون پر ماں جی کے سامنے وہ گرہ کھول کر اپنی شامت کو آواز دیا کرتی تھی، بقول اس کے جیسی لڑکی ماں جی کو بہو کے روپ میں درکار ہے وہ صرف عریشہ ہی ہو سکتی ہے، آج بھی کچھ ایسا ہی ہوا بات زوہیب کے رشتہ سے ہوتی ہوئی ہاجرہ پھپھی تک پہنچی، جسے ماں جی نے ہمیشہ کی مانند درمیان میں اپنے دکھڑے سنانے کے لئے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔

زوہیب کی نگاہیں ٹی وی سکرین پر نظر آتے جانوروں پر مرکوز تھیں جبکہ دماغ ماں جی اور تحریم کے مابین ہونے والی گفتگو سے سوچوں کے گرداب میں الجھ گیا تھا، ایسا ہمیشہ سے ہوتا آیا تھا جب ماں جی اور تحریم کے مابین اس کے لئے

رشتہ کو لے کر بحث ہوتی تو چپکے سے اک چہرہ اس کے خیالوں میں بن بلائے آ کر ہولے سے جھلملاتا تھا اور وہ اس خیال سے حتی الامکان نظر چرا کے اسے جھٹکنے کی سعی میں دنیا مافیہا سے بیگانہ ہونے لگتا تھا۔

اسے صنف مخالف سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی، اس نے آج تک کسی دوشیزہ کی جانب دوستی تک کا ہاتھ نہ بڑھایا تھا، کجا کہ کسی کی چاہت رکھنا، یہ محبت کا فلسفہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا وہ سیدھی سادی زندگی گزارنے کا قائل تھا، اپنی جانب بڑھتے قدموں کو ہمیشہ اس نے بے اعتنائی سے روک دیا تھا، لیکن یہ چہرہ نجانے کیوں ذہن کے پردوں پر نمودار ہو کر اس کا دھیان بھٹکانے آن وارد ہوتا تھا، وہ کسی ایسے راستے کا مسافر نہیں بننا چاہتا تھا جس کی کوئی منزل نہ ہو جبکہ ماں جی کے خیالات سے بھی واقف تھا، اس کے جذبات، خیالات اور دل پر اس کی شریک حیات کے سوا کسی کا کوئی حق نہیں ہو سکتا تھا، پھر اس سراب کے پیچھے کیوں بھاگتا جس کا اس کی زیست میں ہمسفر کی صورت کبھی گزر نہیں ہو سکتا، اس نے سختی سے اپنی سوچوں سے اسے پرے دھکیلا، اسی پل اس کی سماعتوں سے ماں جی کی آواز ٹکرائی وہ یکلخت چونک گیا وہ جانے کب سے اسے مخاطب کیے جا رہی تھیں۔

''جی جی ماں جی!'' وہ یکدم اٹھ بیٹھا، ان کی اور تحریم کی کال کب انجام کو پہنچی کب لائٹ جانے کی بدولت ٹی وی رنگوں سے عاری ہوا اسے کچھ خبر نہ ہو سکی تھی۔

ماں جی اٹھ کر ٹی وی لاؤنج کی گلاس ونڈوز کھول رہی تھیں، جن کی بدولت ونڈوز کے سبزی مائل شیشوں سے دکھائی دیتا اسکن کلر کا ٹائلز سے مزین کوریڈور اور اس کی دیوار کے ساتھ بنی ایک طویل کیاری جو انواع و اقسام کی مختلف سر سبز بیلوں کے موٹے تنوں کو اپنی گہرائی میں سموئے ہوئے تھی، جن کی شاخیں گھر کی بیرونی دیوار کے اس پار بنی سڑک پر رواں دواں ٹریفک اور راہگیروں کو یک ٹک دیکھا کرتی تھیں، یہ تمام منظر کھڑکیاں کھلنے سے کچھ اور واضح ہو گیا تھا۔

''ارے میں نے کہا ٹی وی کی خالی سکرین پر اتنی دیر سے کون سے منظر دیکھ رہے تھے۔'' ماں جی بڑبڑائیں۔

''کک...... کچھ نہیں، بس ملک کے مسائل کے متعلق سوچنے لگا تھا یہ لوڈ شیڈنگ کا خاتمہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے، میری ڈاکومنٹری ادھوری رہ گئی۔'' ان کی بغور جانچتی بڑی بڑی بادامی آنکھیں، وہ بوکھلا کر وضاحتیں گھڑنے لگا۔

''یہ انسانوں کے ڈاکٹر ہو کر تم جانوروں کی زندگیوں پر غور و فکر میں کھوئے رہتے ہو، میری تو سمجھ سے بالاتر ہے۔'' وہ ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھا اپنا ذاتی کلینک چلاتا تھا، ان کی رائے پر مسکرا دیا۔

''بھئی بیگم بچے کا شوق ہے اس میں حیرت زدہ ہونے والی کون سی بات ہے، اللہ کا شکر ادا کریں اتنا ہونہار، سعادت مند اور نیک فرزند عطا کیا ہے اس نے ہمیں، آج کے اس خراب زمانے میں نیک اولاد سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہے۔'' بابا جی نے ٹی وی لاؤنج کے اندر قدم رکھتے ہوئے ان کا جملہ سماعت کیا اور اس کا جواب دینا ضروری سمجھا۔

سہ پہر کی خوشگوار ہوا کھلے سبز شیشوں کے اس بار ان تینوں نفوس کے وجود کو چھو کر باہر کوریڈور کے اختتام پر شروع ہوتے پچھلے صحن اور وہاں چہچہاتے پرندوں، کھلے پھولوں سے گلے مل کر واپس کھڑکیوں تک پلٹی تھی۔

''بے شک آپ نے ٹھیک کہا، سگریٹ، لڑکیاں، الٹے سیدھے فیشن، آوارہ دوست ہر قسم کے عیب سے دور ہے، میں تو ہزار بار شکر ادا کرتی ہوں مولا کا، جس نے ایسی نیک اولاد سے نوازا ہے، جیسے میرا بیٹا ہے رب اس کے نصیب میں اس جیسی کوئی نیک اور خالص لڑکی لکھ دے اور جلدی اس کو سامنے لے آئے بچی، ڈھونڈ ڈھونڈ کر میری تو جوتیا گھس گئی ہیں۔'' انہوں نے بابا جی کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے دعا کے ساتھ آخر میں ہونے والی بہو کے دسترس سے دور ہونے پر فکر مندی کا اظہار کیا۔

''حق ہا، یا اللہ میرے بیٹے کی جوانی پر رحم فرما دے مولا اس کی ظالم ماں کو جلد کوئی لڑکی بھا جائے، تاکہ اس گھر میں بہو آ جائے۔'' بابا جی کے مصنوعی رقت زدہ انداز میں دعا مانگنے پر زوہیب بے ساختہ ہنس پڑا تھا جبکہ ماں جی نے ان کو گھورنے پر اکتفا کیا اور چائے بنانے کچن میں چلی گئیں ان کے قہقہے نے دور تک ان کا پیچھا کیا تھا۔

بابا جی زوہیب کو لئے ٹی وی لاؤنج کے راہداری میں کھلنے والے دروازے سے نکل کر سر سبز بیلوں والی کیاری کے ساتھ ساتھ چلتے پچھلے صحن کی اور نکل آئے جس کے کچھ حصے میں گھاس اور پھولوں کے پودے لگا کر اسے چھوٹے سے لان کی صورت دی گئی تھی، علاوہ ازیں صحن کے ایک کونے میں آسٹریلین طوطے بڑے سے لوہے کی سلاخوں والے جالی دار پنجرے میں مقید اپنی مخصوص آوازوں میں چہچہانے میں مگن تھے۔

''اور سنائیں بابا جی، چھپا جان کے ساتھ شطرنج کی بساط کیسی رہی؟'' وہ بخوبی واقف تھا کہ بابا جی چھٹی والے دن عموماً ان کے ساتھ شطرنج کھیلنے کے لئے جاتے تھے، اس لئے اتنے وثوق سے دریافت کر رہا تھا، ورنہ عام دنوں میں ان کو کسی سے ملنے ملانے کی فرصت کہاں میسر ہوتی تھی، مقامی بازار میں ان کی کپڑے کی بڑی سی دکان تھی، جہاں کام اگرچہ کاریگر لڑکے ہی کرتے تھے بابا جی بس کاؤنٹر پر حساب کتاب کی نگرانی کے لئے براجمان رہتے تھے۔

''آج تو مہلت ہی نہیں مل سکی، تمہاری ہاجرہ پھپھی کے پاؤں میں موچ آ گئی اچانک سے، تو بس ہم لوگ انہیں کلینک لے کر گئے پٹی وغیرہ کے بعد ان کے ہاں باتوں میں اتنا وقت گزر گیا۔'' انہوں نے ہلکے پھلکے انداز میں تفصیل مہیا کی۔

''ہائے اللہ خیر کرے، اللہ آپا کو تندرستی عطا فرمائے کیا ہو گیا تھا موچ کیسے آئی؟'' ماں جی چائے کے ٹرے لئے لان میں چلی آئیں تھیں اور پلاسٹک کی میز پر ٹرے رکھتے ہوئے بابا جی کی گفتگو ملاحظہ کی تھی اور بے ساختہ فکر مندی و تشویش کا اظہار کیا، وہ انہیں تمام معاملے سے آگاہ کرنے لگے۔

زوہیب نے چائے کا کپ اٹھا کر لبوں سے لگایا اور ماں جی کی پریشانی پر مسکرا دیا وہ ایسی ہی تھیں ہر کسی سے محبت اور ہر کسی کے دکھ درد کا احساس کرنے والی نرم دل، ہمدرد اور مہربان ہستی۔

فضا میں سبزے و پھولوں کی ملی جلی مہک پھیلی ہوئی تھی اس نے اپنی توجہ پنجرے کے اندر پھدکتے، گنگناتے نیلے، پیلے، سفید، ہرے اور چتکبرے رنگوں والے طوطوں پر مرکوز کر دی۔

☆☆☆

محبت مورتی ہے
اور کبھی دل کے مندر میں کہیں پر ٹوٹ جائے تو!
محبت کانچ کی گڑیا

فضاؤں میں کسی کے ہاتھ سے گر کر چھوٹ جائے
تو!
محبت آبلہ ہے کرب کا
اور پھوٹ جائے تو!
محبت روگ ہوتی ہے
محبت رات ہوتی ہے
محبت جھلملاتی آنکھوں میں برسات ہوتی ہے
محبت نیند کی رت میں حسیں خوابوں کے رستوں پر
سلگتے جان کو آتے رتجگوں کی گھات ہوتی ہے
محبت جیتی ہوتی ہے
محبت مات ہوتی ہے
محبت ذات ہوتی ہے!!

محبت کا رنگ برنگ خوبصورت و خوش گلو پنچھی جو مختلف کیفیات اور جذبات کے زیر اثر اپنا رنگ و روپ بدلنے پر پوری طرح قادر تھا اس کے شعور سنبھالنے سے بھی بہت پہلے اس کے دل کی منڈیر پر بیٹھ کر دلکش نغمے گنگنایا کرتا تھا اور ایسا کیسے ہوسکتا تھا کہ اس کی خوبصورتی اور آواز کی سحر انگیزی اسے اپنا اسیر نہ کرپاتی وہ تو یوں بھی ناسمجھ تھی اور اسیر تو وہ پنچھی بھی اس کے دل کا ہوگیا تھا جو اس سرزمین پر ہمیشہ کے لئے اپنا مسکن بنا کر اسے ساتھ لئے خوابوں کی اڑانیں بھرا کرتا تھا۔

ورنہ تو نانو اور علیزہ آپی سے چاند، ستاروں کے شہزادوں کی کہانیاں سن کر اس کے دل میں میٹھے میٹھے جذبے انگڑائی لے کر اک انجانے شہزادے کے سنگ چاند پر بسیرا کرنے کے تمنائی ہونے لگتے تھے، اس تخیل کے شہزادے کو چہرہ اس روز ملا جب نانو کے گھر سلطانہ خالہ راولپنڈی سے اپنے دونوں سپوتوں اسد بھائی اور سعد کے ساتھ رہنے کے لئے آئی ہوئی تھیں۔

جبکہ اس کے پاپا بیرون ملک ملازمت کی بنا پر سال چھ ماہ بعد پاکستان چکر لگایا کرتے تھے اور ماما اپنے جنجال پورہ جیسے سسرالی گھر عزیز و اقارب سب چھوڑ چھاڑ ان تینوں بچوں ندیم بھائی، علیزہ آپی اور عریشہ کے ہمراہ مستقل نانو کے گھر سکونت اختیار کیے رکھتیں چہ جائیکہ پاپا اک ماہ کے لئے وطن واپس نہ آجاتے۔

اس دن سلطانہ خالہ نے چکوال سے کچھ دوری پر واقع ایک خوبصورت تفریح گاہ ''کلر کہار'' پر پکنک منانے کا پروگرام بنایا تھا، نانو، ماموں، مامی، زوہیب بھائی بھی ان کے ہمراہ گئے تھے، سلطانہ خالہ بہت دوستانہ طبیعت کی مالک تھیں جب وہ نانو کے ہاں آتیں تو ان کی موجودگی میں اسے اپنی مامی کے چہرے پر بھی اطمینان بھری مسکراہٹ کی جھلک نظر آجایا کرتی تھی۔

ورنہ تو عموماً اس نے ہمیشہ مامی کو صبح سویرے سے رات گئے تک کولہو کے بیل کی مانند کاموں میں الجھا سہما اور نانو، ماما سے بات بے بات جھڑکیں سنتے دیکھا تھا۔

ماما دن چڑھے تک سونے کی عادی تھیں اور ان تینوں کا ناشتہ، سکول کے لئے تیاری، لنچ بکس بنانا، یونیفارم دھونا، پریس کرنا یہ سب مامی کی ذمہ داری تھی، بقیہ کے وقت میں ماما صرف ٹی وی دیکھا کرتی تھیں اور مامی کو اپنے مختلف کاموں کے لئے آرڈر جاری کرتیں اور وہ بنا ماتھے پر کوئی شکن ڈالے ان کی جی حضوری میں لگی رہتیں خواہ ان کی طبیعت کیسی بھی ہوتی، اس پہ بھی ماما نانو سے نجانے کیا مرچ مصالحے لگاتیں کہ وہ ماما کے ساتھ مل کر کئی بار انہیں تلخ و ترش باتوں سے فیضیاب کرتی رہتیں۔

لیکن سلطانہ خالہ کا معاملہ تھوڑا الگ تھا وہ ہمیشہ نانو اور ماما کے ساتھ مامی کی طرفداری کیا کرتیں اور مامی کے ساتھ مل کر ایسے فٹافٹ کام نمٹا تیں کہ ماما خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتیں،

ماموں پر تو ان کا بے حد رعب تھا مگر خالہ ان کے دباؤ میں نہیں آتی تھیں۔

کلر کہار میں سرسبز مرغزاروں کے درمیان دلکش جھیل، جھیل کے اطراف میں واقع بلند و بالا سرسبز کوہساروں کی چوٹیاں، ماہتاب کی نارنجی شعاعیں اور جھیل کے اوپر جھکے نیلے وسیع آسمان پر محو پرواز آبی پرندے یہ تمام مناظر اپنے خوابناک عکس سے جھیل کے پانی میں مختلف رنگ بکھیر رہے تھے۔

ندیم بھائی نے اسے جھولے سے دھکا دے کر گرا دیا تھا اور خود مزے سے اس کی جگہ جھولا جھولنے لگا وہ حلق پھاڑ کر واویلا کرتی سبز گھاس پر لوٹ پوٹ ہونے لگی ماموں ماما اور خالہ وغیرہ کشتی بانی سے لطف اندوز ہوتی دور نکل گئی تھیں زوہیب بھائی نے اپنے جھولے سے اتر کر اسے چپ کرانے کے لئے چاکلیٹ پیش کی تھی، جو اس نے جھٹ سے تھام لی پھر انہوں نے چار سالہ عریشہ کو اپنے جھولے پر خوب احتیاط سے جھولا جھلایا یہاں تک کہ اس کا رونا کھنک دار ہنسی میں تبدیل ہوگیا۔

نانو مامی کے ساتھ یہ منظر دیکھ رہی تھیں اور جب اس نے کھلکھلاتے ہوئے جا کر ان کی گود میں بیٹھ کر ندیم بھائی کی شکایت اور زوہیب کی تعریف کی تو نانو نے اچانک ہی عریشہ کو زوہیب کی دلہن بنانے کی خواہش مامی کے روبرو ظاہر کر دی۔

عریشہ نے کئی بار کھیل کھیل میں اپنی گڑیا اور گڈے کی شادی کی تھی اور کتنی کہانیاں نانو کی زبانی سن رکھی تھیں جن میں چاند سے شہزادہ آ کر زمین کی شہزادی کو بیاہ کر اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور پر آسمان میں جہاں پر روز چندا ماما جگمگاتے ہیں، وہ جھینپ کر بھاگتی ہوئی جھیل کنارے جا کر کھڑی ہوگئی، وہ انجان تھی کہ مامی نے اسی وقت نانو کی بات سے دامن بچا کر سارا مدعا ناقابل اعتبار پل پل بدلتے وقت اور بچوں کی ذہنی و قلبی رنگ بدلتی حالت پر ڈال کر ان تمام باتوں کو سوچنا قبل از وقت قرار دے دیا تھا۔

اسے یاد تھا تو بس اتنا کہ تخیل میں تراشے گئے اس کے چاند نگر کے شہزادے کے دھندلے سے نقوش اک سانچے میں ڈھل گئے تھے۔

اور محبت کے پنچھی نے اوپر آسمانوں سے اتر کر اس کے دل کی سرزمین پر پہلی بار اس دن یوں رنگ بکھیرے تھے جیسے دھنک رنگ جھیل کے پانی کے اوپر بن رہے تھے، اس واقعہ کے بعد اس کو نجانے کیوں زوہیب کا سامنا کرتے حجاب آتا۔

''تمہیں کیا ہوا ہے؟ تم مجھ سے اتنا شرماتی کیوں ہو؟'' آٹھ سالہ زوہیب اس کانچ جیسی نازک سی گڑیا کی کلائی تھام کر کئی بار استفسار کرتا جس پر وہ مزید گھبر کر ہاتھ چھڑاتی بھاگ جاتی، پھر اک دن مامی نے یہ سب ملاحظہ کیا اور اس کے بعد نامحسوس سے انداز میں زوہیب کو عریشہ سے دور رکھنے لگیں یوں بھی ان کے ہاں خود اک پری آ گئی تھی۔

زوہیب کا وقت زیادہ تر تحریم کے ساتھ گزرنے لگا انہی دنوں عریشہ کے پاپا مستقل پاکستان شفٹ ہو گئے اور عریشہ لوگ ان سے دو گلیوں کے فاصلے پر اپنے الگ گھر میں چلے گئے۔

بادلوں کی گرجدار آواز یکدم اسے خیالوں کی دنیا سے واپس کھینچ لائی، اس نے چونک کر کھلی کھڑکی سے نظر آتے سیاہ رات کی آغوش میں چھپے آسمان کو اک نظر دیکھا، ہر سو سرخی مائل بادلوں کے قافلے اترے ہوئے تھے، ہوا شوریدہ سری پر

اتری ہوئی لان میں اونگھتے املتاس، شیشم، کیکر، سیب اور آلوچے کے پیڑوں کی شاخیں زور زور سے ہلاتی ہوئی مسلسل ان کی نیند میں خلل کا باعث بنی ہوئی تھی۔

اور نیند تو آج عریشہ کی جھیل سی گہری آنکھوں کے کناروں کے اس پار بیٹھ کر خواب بننے کی بجائے شوریدہ سر ہوا کے سنگ درختوں سے لپٹ کر بین کرنے میں مصروف تھی، حالانکہ قصور وار سراسر وہ خود تھی جو ہمیشہ لاحاصل سے خواب بنا کرتی تھی، جبکہ مامی گزشتہ کئی سالوں سے کئی بار اس کی موجودگی میں ماما کو یہ بات باور کروائی آئی تھیں کہ زوہیب کا رشتہ وہ خاندان سے باہر کریں گی اور زوہیب خود خاندان میں رشتہ کرنے کے حق میں نہیں ہے سب کزنز اس کی بہنیں ہیں اور یہ تو ماما بھی اچھی طرح جان چکی تھیں کہ سب کزنز، سے مراد محض عریشہ ہے کیونکہ مامی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھیں۔

لیکن نجانے کیوں ماما ہمیشہ ان کے سامنے عریشہ کے رشتے کے لئے فکرمندی کا اظہار کرنا ضروری سمجھتیں جیسا کہ آج کیا تھا، جب سلونی شام گہری ہونے کے بعد وہ زوہیب کے ہمراہ ماما کی خیریت دریافت کرنے آئیں، صبح ہی تو ان کے پاؤں میں سیڑھیاں اترتے ہوئے موچ آ گئی تھی۔

''آپا آپ کسی رشتے والی سے رابطہ کریں اللہ اچھی کرے گا۔'' مامی نے سبھاؤ سے ہمیشہ والا جواب دیا۔

''ارے بہت رشتے والیوں کو کہہ رکھا ہے پیسے بٹور کر چلی جاتی ہیں ان کے پاس اوٹ پٹانگ بے جوڑ سے رشتوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا، میری تو راتوں کی نیندیں اڑ گئیں ہیں سوچ سوچ کے، کیا بنے گا میری عریشہ کا، عمر نکلی جا رہی ہے، اس برس چوبیسواں سال لگ جائے گا اسے۔''

لوازمات کی بھری ٹرالی اندر لاتے ہوئے عریشہ کا چہرہ لال بھبھوکا ہونے لگا، اسے ماما کی یہ بات سخت ناپسند تھی۔

''مامی ان باتوں سے کیا مطلب اخذ کرتی ہوں گی، آپ ان کے سامنے پلیز اس موضوع پر بات مت کیا کیجئے، میں تو حتی الامکان مامی سے زیادہ بات چیت کرنے سے بھی گریز کرتی ہوں کہ میری بے غرض محبت سے وہ کوئی غلط مفہوم اخذ نہ کریں اور آپ......'' رنج و غصہ کی ملی جلی شدت سے اس کی آواز بھیگنے لگتی تھی کتنی بار اس نے ماما کو عاجز آ کر سمجھایا تھا مگر بے سود۔

''ارے تم تو ہو ہی عقل سے پیدل، ان کے سامنے نمایاں ہو کر ان پر چھائی رہو گی تب ہی تو ان کی نظر میں سماؤ گی۔''

''ماما! یہ ہتھکنڈے نظر سے گرانے کے لئے ہوتے ہیں، مجھے اپنی خود کی اور ان لوگوں کی نگاہوں میں مت ہلکا کیجئے ماما کسی کے پیروں میں گر کے لڑکی نہیں دی جاتی، یہ رشتے اپنے دل کی خوشی سے مربوط ہوتے ہیں کوئی زبردستی نہیں کی جاتی، مجھے کبھی شادی ہی نہیں کرنی، آپ بھی یہ خیال چھوڑ دیجئے۔''

مگر وہ ماما ہی کیا جو کسی کی بات کو اپنے سامنے چلنے دیں، عریشہ تو یوں بھی ان کی نظر میں بے وقوف تھی اسے ماموں مامی کے آگے پیچھے پھرنے اور زوہیب سے بے تکلفی بڑھانے کے بہت سے مشوروں سے نوازا جاتا تھا یہ اور بات کہ ان کے ہر مشورے کو رد کر کے وہ الٹا مامی لوگوں سے کچھ اور کنارہ کش ہو جاتی اور زوہیب کی تو پرچھائی تک سے خائف رہتی تھی، لیکن اس سب سے کچھ افاقہ اس صورت ہوا کہ ماما نے ماموں لوگوں کے سامنے اس کی خوبیوں، سلیقے

طریقے کو ہر وقت بیان کرنا چھوڑ دیا، لیکن رشتہ کی فکر مندی کا ہر حیلے بہانے اظہار کرنا نہیں بھولتی تھیں مامی ہر مرتبہ انہیں تسلی و تشفی سے نواز کر ادھر ادھر کی باتوں کے دوران زوہیب کے رشتے سے متعلق اپنے فرمودات بیان کر دیتی تھیں۔

وہ ان لوگوں کے سامنے زیادہ دیر ٹکتی بھی نہیں تھی، اپنا پندار اسے اپنی محبتوں سے زیادہ عزیز تھا، زوہیب سے بہت بچپن میں اسے حجاب آتا تھا، مگر پھر وہ نامحسوس سے انداز میں اس سے کترانے لگی، اپنے جذبے عیاں ہونے کے خوف سے اس نے کبھی زوہیب سے نظر اٹھا کر زیادہ بات چیت تک نہ کی تھی، ازل سے اس کے مابین اک فاصلہ اور حد مقرر کر دی تھی، جسے زوہیب نے کبھی پھلانگنے کی جسارت نہیں کی وہ جیسے اس کے گریز اور خاموش برتاؤ کا عادی ہو چلا تھا۔

جب چاند نگر جا کر خواب تعمیر کرنے والی لڑکی نے شعور کی دہلیز پر قدم رکھ کر بہت سی حقیقتوں کو پرکھا تو بہت چپکے سے اس کے اندر گنگناتا، مسکراتا بے فکر پنچھی دل کے مرغزاروں میں کھلے بیش بہا خوش کن پھولوں کے ساتھ موجود نوکیلے کانٹوں میں الجھ گیا اور بہت سے کانٹے اس کے سینے میں پیوست ہو گئے جن کی بدولت لہولہو پنچھی نے روتے کراہتے ہوئے درد بھری دھنیں کشید کر لیں اس کے زیر اثر دل کے اندر نہاں خانوں میں پت جھڑ کا موسم ہمیشہ کے لئے ٹھہر گیا تھا۔

میں اس کو بھولنا بھی چاہوں تو کیا کروں عادل
جو مجھ میں زندہ ہے خود میری ذات ہونے تک

اس بار بادلوں کی گرج کے ساتھ یکدم بجلی بھی زور سے کڑکی تھی، وہ یکلخت ہی پھر سے مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنے ذہن اور چکراتے خیالات کو جھٹک کر کھڑکی بند کر کے بیڈ پر آ کر نیم دراز ہو گئی۔

اسے بجلی کی چمک سے بے حد خوف آتا تھا خصوصاً رات کے اندھیرے میں کڑکتی بجلیاں، اسی لئے اس نے کھڑکی کو دبیز پردوں کی اوٹ میں چھپا دیا تھا، وہ تو چندا ماما جو اس کے بچپن کے ہمراہ اور گہرے دوست تھے ان کو کھڑکی کے اس پار نخل فلک پر تلاشنے جا کھڑی ہوئی تھی لیکن اس کی آنکھ کی نیند کی مانند وہ بھی بدلیوں کی اوٹ میں چھپے بیٹھے تھے۔

ان سے اپنا حال دل بیاں کیے بنا اسے سکون کا اک پل بسر کرنا محال تھا، دل جو زوہیب کو اپنے اردگرد موجود دیکھ کر ضدی بچے کی طرح ہمکنے لگتا تھا، کتنی مشکل سے وہ اپنے سسکتے دل کو منت سماجت، ڈانٹ ڈپٹ سے چپ کرا کر قابو کرتی تھی اور وہ دشمن جاں اپنی محض ایک جھلک سے اسے پھر سے اسی موڑ پر لا کھڑا کرتا جہاں سے وہ چلی تھی اور پھر خود کو سنبھالنے کی سعی میں بکھر کر وہ ہلکان ہو جاتی چندا ماما گواہ تھے کہ اپنی ذات کی کرچیوں کو یکجا کرنے میں بہت سا وقت لگتا تھا، اس نے کہیں پڑھا تھا۔

''محبت قابو نہیں کرتی ناں ہی یہ قابو ہوتی ہے، اس کی کوئی خواہش کوئی تمنا نہیں ہوتی لیکن یہ اپنی تکمیل چاہتی ہے۔'' وہ محبت کے زخموں سے چور نڈھال سی تھک ہار کر رونے لگی، وجود کے اندر پنچھی درد کی شدت سے پھڑ پھڑا رہا تھا اور پردوں کی اوٹ میں بند کھڑکیوں سے ادھر شب کے مہیب سناٹے میں بارش کی آواز اک عجب پراسرار سا راگ ہوا کے ساتھ مل کر بجا رہی تھی۔

☆☆☆

مریضوں کو نمٹا کر اس نے ریوالونگ چیئر کی پشت سے سر ٹکا کر اک گہری سانس کلینک میں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

ہومیو پیتھک ادویات کی ملی جلی مہک والی فضا میں خارج کی، آج اس کا کمپاؤنڈر چھٹی پر تھا، اس لئے مریضوں کے معائنہ کے بعد تجویز کردہ نسخہ کے مطابق ادویات اسے خود ہی نکل کر کمپاؤنڈر کے انداز میں مریضوں کو بمعہ ہدایات کے سپرد کرنی پڑیں۔

کئی دن سے اس کی طبیعت مضمحل و بوجھل سی ہو رہی تھی، کبھی کبھار تو اسے اپنا آپ بڑا اجنبی سا لگنے لگتا تھا، پھر اسے خود پر بے تحاشا طیش آتا اور وہ خود سے روٹھ جایا کرتا تھا، اپنے آپ کو اس قدر مصروف رکھتا کہ اندر اٹھتی ہوئی آوازیں چیخ چلا کر خود بخود خاموشی کے پردے میں سو جاتی تھیں اور اپنے اندر کی اس جنگ میں فتح کے بعد اس کے وجود پر یونہی کتنے روز بوجھل پن و اداسی کا غلبہ رہتا تھا۔

اس نے سابق انداز میں براجمان ریوالونگ چیئر کو ذرا کی ذرا ادھر سے ادھر حرکت دیتے ہوئے کلینک کے گلاس ڈور سے اس پار اک خاموش نگاہ دوڑائی، سامنے سڑک پر معمول کے انداز میں ٹریفک رواں دواں تھی، سڑک کے اوپر نظر آتے آسمان پر تاحد نگاہ آفتاب جلوہ افروز تھا، گلابی نگاہوں کو بھلی لگتی دھوپ دور تک بچھی ہوئی تھی، جس کی بدولت سڑک کے دونوں اطراف میں لگے چنار املتاس اور صنوبر کے درختوں کے سائے زمین پر بن رہے تھے جو ہر لحظہ چلتی ہوا کے سبب اپنا زاویہ بدلنے لگتے اور ہوا جونہی ذرا تھمتی پھر سے ساکت ہو جاتے۔

زوہیب کے اندر بھی ایسے ہی سائے بنتے، بگڑتے ساکت ہوتے تھے اور وہ ان سے پیچھا چھڑانے کی تگ و دو میں عاجز، اسی پل آفتاب کو اک بادل کے ٹکڑے نے اپنی اوٹ میں چھپا دیا، دھوپ کے ساتھ سائے بھی اوجھل ہو گئے، لیکن ہر منظر بے حد روشن اور واضح تھا، چنار کی بلند و بالا شاخوں پر کھلے جابجا سرخ زرد اور نارنجی پتے (جو دور سے نگاہوں کو پیڑ پر آگ لگنے کا تاثر دیتے تھے) فٹ پاتھ پر دائیں بائیں لگے گیندے کے پیلے پھول ان کو چھیڑتی مست ہوائیں کھمبے کی تاروں پر چہکتی چڑیوں کی لمبی قطاریں اور نیچے سڑک پر بھاگتی دوڑتی ٹریفک کچھ بھی تو نہ بدلا تھا لیکن جب اس کے اندر کے سائے غائب ہوئے تھے تو وجود میں دور تک اندھیرے، خاموشی اور یاسیت کا دور دورہ ہو جاتا تھا، اس کے آگے اک بہت بڑا سوالیہ نشان تھا جس کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

گلاس ڈور سے اندر داخل ہوتے مریض کو دیکھ کر وہ تمام سوچیں جھٹک کر اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

☆☆☆

''توبہ، اللہ معافی، میرے مولا! ہمیں صراط مستقیم پر چلا دے، ہم سب کو سچا پکا مسلمان بنا دے آمین۔''

''بیگم کچھ پتا تو چلے کہ ہوا کیا ہے؟ کچھ بتایئے تو سہی۔'' بابا جی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا، انہوں نے عاجز آ کر استفسار کیا۔

چھٹی کے دن کی خوشگوار سی دوپہر میں وہ لان میں پلاسٹک چیئر پر تشریف فرما اخبار کی ورق گردانی میں محو تھے جبکہ سماعتیں بیگم کی آہٹوں کی منتظر تھیں جو کہ کچھ دیر پیشتر ہی زوہیب کے دوست کی کسی کزن کے دیدار کو نکلی تھیں، جو کہ ان کی کالونی کے آخری گھر میں مقیم تھا وہ خود تو شادی کے بندھن میں بندھ چکا تھا اور بیوی کو پیارا ہونے کے بعد کسی اور سے ملنے کی فرصت نہیں رہی تھی مگر آج دوپہر میں نہ صرف زوہیب سے ملاقات کو آیا بلکہ ماں جی کے کہنے کے مطابق

بالآخر اس نے اپنی کسی دور پرے کی کزن کا اچھی سی لڑکی کے طور پر تذکرہ کیا تھا۔

لہٰذا ماں جی دید کے شوق میں کوشاں چل پڑیں اور اب واپس آکر دھم سے کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ کر توبہ استغفار کرنے میں مشغول تھیں۔

''بیٹا جی جتنا میں تمہاری ماں کو جانتا ہوں اس کی روشنی میں یہ بات ڈنکے کی چوٹ پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ ''اچھی لڑکی'' بھی تمہاری ماں جی کے بنائے گئے بہو کے سانچے میں فٹ نہیں آسکی۔''

ان کو مسلسل توبہ تلا کرتے دیکھ کر اور اپنے سوالوں کے نظر انداز کیے جانے پر بابا جی نے بیٹے کو مخاطب کر کے حتمی رائے کا اظہار کیا، اس نے اک نگاہ ان پر ڈالی اور پھر سے آسٹریلین طوطوں کے پنجرے کی صفائی میں مشغول ہو گیا۔

''ارے خاک اچھی ہے، میں پاگل ہوں جو اس جھوٹے کی باتوں میں آکر چل پڑی، وہ لڑکی بھی اس کی ان تمام کزنز کی مانند ہی ہے جو اس کی شادی پر دیکھی تھیں، فیشن کی ماری سر تا پا زیورات و میک اپ میں لدی پھندی انڈین و مغربی تہذیب کی بے باک، بے حیا منہ بولتی تصویریں اللہ معافی، توبہ۔''

''اب کسی نہ کسی سے تو کرنی ہے ناں زمانے کو دیکھیں کہاں جا رہا ہے اور آپ کن باتوں میں الجھی ہوئی ہیں ایسے ہی رہا تو ہمارا بچہ کنوارا بیٹھا رہے گا۔'' بابا جی کے لہجے سے برہمی جھلکنے لگی تھی اخبار انہوں نے سامنے میز پر پٹخ دیا تھا۔

''اللہ اللہ کیا ہو گیا ہے آپ کو، ہمارا مذہب ہماری اولین شناخت ہے، مسلمان کی زندگی پر اس کے ہر عمل میں اسلام کی چھاپ ہونی چاہیے، ایسی لڑکی بیاہ کر لے آؤں تو آنے والی نسلوں کی تربیت کن خطوط پر استوار ہو گی، اسی لئے تو آج کل کے بچے اپنی تہذیب اور مذہب سے قطعی نا آشنا ہیں۔'' انہوں نے طویل لیکچر دے ڈالا۔

''وہ پھر وہ مولوی صاحب کی لڑکی سے کیوں نہیں کر دیتیں؟'' بابا جی نے جلے کٹے انداز میں اپنے دوست کی بیٹی کا نام لیا۔

''وہ ناں ناں وہ دیکھنے میں زوہیب کے جوڑ کی نہیں ہے۔'' ماں جی نے جھٹ سے بیان دیا، بابا جی سر تھام کر بیٹھ گئے۔

زوہیب کو نجانے کیوں بہت زوروں سے ہنسی آگئی تھی، سبک خرامی سے چلتی ہوا بے اختیار ٹھٹک گئی، چمپا، بیلا اور گل بکاؤلی کے سفید، پیلے، نارنجی، گلابی اور سرخ پھولوں نے ایک لمحہ کے لئے ٹھہر کر اسے دیکھا تھا، حتی کہ پنجرے میں پھدکتے ننھے منے رنگ برنگ آسٹریلین طوطے بھی اک پل کے لئے چہچہانا شور مچانا بھول گئے تھے، وہ بے تحاشا ہنس رہا تھا، بابا جی یوں اسے ہنستے دیکھ کر خاموشی سے ماں جی پر اک خفا نگاہ ڈال کر وہاں سے چلے گئے جبکہ ماں جی حیرت سے منہ کھولے تھوڑی پر ایک انگلی ٹکائے اسے دیکھتی رہیں، اب وہ ہنسی ضبط کر کے طوطوں کے پیالے میں پانی بھر رہا تھا، لیکن اس طرح ہنسنے سے اس کی روشن سیاہ آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئی تھیں اسے تحریم بہت شدت سے یاد آئی تھی، بہت زیادہ، کاش وہ اس وقت یہاں موجود ہوتی، اس نے سوچا تھا۔

☆☆☆

اس ویک اینڈ پر علیزہ آپی اپنے میاں جی اور دو عدد پیارے بچوں آٹھ سالہ احمد اور چھ سالہ ماہا کے ساتھ اپنے میکے جلوہ افروز ہوئی تھیں، ان کے گھر کے در و دیوار یکدم ہی کھل اٹھے تھے۔

''اوہ آپی اتنے عرصہ بعد آپ چکوال

تشریف لائی ہیں اور اتنے مختصر وقت کے لیے یہ تو ناانصافی ہے۔'' کچن میں مختلف ڈشز کی تیاری کے دوران جلدی جلدی ہاتھ چلاتے ہوئے عریشہ نے محبت بھرا شکوہ کیا۔

''یار بچوں کی پڑھائی کا حرج ہوتا ہے پھر تمہارے بہنوئی کی کاروباری مصروفیات یہی غنیمت ہے کہ کل تک کے لئے ہم یہاں تشریف فرما ہو گئے ورنہ تو یوں بھی آج کل نکلنا مشکل تھا۔'' انہوں نے مسکرا کر لب کشائی کی۔

''کیوں؟'' اس نے استعجاب میں گھر کر استفسار کیا۔

''تحریم کا مسئلہ تھا یار، اسے ڈاکٹر نے بیڈ ریسٹ کی تاکید کی ہے اسے اس حال میں چھوڑ کر آنے کے لئے دل نہیں مان رہا تھا لیکن سلطانہ خالہ اور تحریم دونوں نے ہی زور دیا تو میں نے حامی بھری، تم لوگ بے حد یاد آ رہے تھے۔'' کچن میں کسی کام سے آتی ماما نے دروازے پر ٹھہر کر ان کا بیان ملاحظہ کیا تھا۔

''یہاں یہ عالم ہے کہ ان کے دلوں میں احساس و محبت نام کی کوئی شے کا وجود نہیں اور میرے بچے مرے دھرے ہیں ان کے پیچھے، تمہیں کیا ضرورت ہے تحریم کی فکر میں دبلا ہو کر خدمتیں کرنے کی، بے عقل لڑکی، ان لوگوں نے سوچا بھی عریشہ کے لئے؟'' ماما کی بڑبڑاہٹ و تلخی سے بھرپور انداز نے ان دونوں کی سماعتوں کو فیضیاب کیا تھا، ان کی سوچ پر عریشہ تاسف سے سر ہلا کر کام میں محو ہو گئی ماما کی سوچوں کے رخ کو بدلنا درست سمت گامزن کرنا دیوار سے سر پھوڑنے کے مترادف تھا۔

''ماما آپ کیوں ہر وقت ایسی باتیں کرتی ہیں، ماموں، مامی کی فیملی نے ہمیشہ ہمیں اتنی محبتوں سے نوازا ہے ہر موقع پر لینا، دینا کرتے

رہے ہیں، ورنہ آج کے دور میں کوئی شادی شدہ بہنوں کو نہیں پوچھتا آگے سے ان کے نواسوں، پوتوں کے ساتھ محبتیں رکھنا تو دور کی بات ہے۔'' علیزہ آپی مکمل طور پر ماما کی جانب متوجہ ہو چکی تھیں، چکن کڑاہی تیار تھی، بریانی دم پر لگا کر وہ شامی کباب فرائی کرتی ساتھ میں ان کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔

''ارے تو بہنیں بھی تو ہم جیسی ہوں، کبھی بھابھی کو ایک لفظ تک نہیں کہا، ہم جیسی چاہنے والی بہن اللہ سب کو دے۔'' ماما نے فوراً پینترا بدل کر مبالغہ آمیزی کی۔

''جانے دیں ماما میں جب چھوٹی تھی سب دیکھا کرتی تھی۔'' علیزہ آپی نے ہنستے ہوئے لقمہ دیا، کچن کی جالی دار کھڑکیوں سے ڈھلتی دھوپ نے بے ساختہ اندر جھانکا تھا اور عریشہ کے صبیح مکھڑے کا احاطہ کر لیا، وہ مسکرا دی۔

''کیا دیکھا کرتی تھیں مطلب کیا ہے تمہارا؟'' ماما نے تیکھے چتونوں سے انہیں گھورا۔

''میرا مطلب ہے ماما کہ ہر کسی سے بے غرض محبت و خلوص کا رشتہ رکھنا چاہیے، اللہ کے سوا کسی کی ذات سے کوئی امید نہیں رکھنی چاہیے، ہماری عریشہ کے لئے رب نے جو شخص چنا ہو گا وہ وقت آنے پر اسے ضرور مل جائے گا، دعا ہے کہ اللہ نیک صالح محبت کرنے والے قدر کرنے والے لوگوں سے واسطہ جوڑے اس کے نصیب اچھے کرے۔''

''آمین۔'' ماما نے صدق دل سے آمین کہا تھا، وہ اپنی سوچوں میں گم یہ قطعاً فراموش کر گئیں کہ علیزہ آپی نے بڑی مہارت سے ان کے غصہ کو زائل کر دیا تھا۔

''تمہیں کیا ہوا؟'' مدہم سی سنہری دھوپ میں اس کے چہرے کے دلکش نقوش میں چھلکتا

اضطراب کشمکش کی کیفیت اور آنکھوں کی جھیلوں کی نم سطح کو انہوں نے بغور دیکھا۔

''کچھ نہیں آپی مجھے الجھن ہوتی ہے ہر کوئی میرے رشتے کو لے کر اظہار خیال کرتا ہے، میں نے کتنی بار واضح کیا ہے کہ میں نے شادی ہی نہیں کرنی۔''

''لیکن کیوں؟ کوئی وجہ بھی تو ہو ناں؟'' انہوں نے گہری نگاہیں اس پر مرکوز کر دیں۔

''بس میں نے ہمیشہ ماما، پاپا کے پاس رہنا ہے کہیں نہیں جانا جبکہ ندیم بھائی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ دور دراز کے شہر میں رہائش پذیر ہیں تو میں کیسے ماما، پاپا کو اکیلا چھوڑ کر چلی جاؤں۔'' اس نے دلی کیفیت پر پا بو پا کر اہم ترین وجوہات کو گول کر کے محض ایک وجہ بیان کر دی جو کہ اس کے خیال میں کافی تھی۔

''پاگل! بھائی تو اپنی جاب کی بدولت اس شہر سے دور آباد ہیں جب بھی ان کی ٹرانسفر یہاں ہوئی تو وہ لوگ واپس لوٹ آئیں گے۔'' انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگا کر اس کا اعتراض چٹکیوں میں اڑا دیا۔

''اللہ کرے میرے لئے کبھی کوئی ڈھنگ کا رشتہ ہی نہ ملے نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری۔'' شامی کباب ٹرے میں سیٹ کرتے ہوئے اس نے وحشت زدہ انداز میں دعا کی اور محاورہ کچھ ترمیم کے ساتھ حسب حال بنا لیا باہر ڈھلتی دھوپ میں ایستادہ درختوں پر بلبل، کوئل، مینا اپنے اپنے راگ الاپ رہی تھیں۔

☆☆☆

''اخاہ! محترم دوست آج آپ کیسے راستہ بھول گئے۔'' تین بجے کے قریب وہ کلینک سے اٹھ کر کھانا کھانے کے لئے گھر کی جانب روانہ ہوا ہی چاہتا تھا کہ اس کے بچپن کے دوست اختر کی آمد ہو گئی، گرمجوشی سے اٹھ کر بغل گیر ہونے کے بعد اس نے اسے چھیڑا۔

''چل اوئے عورتوں کی مانند طعنے نہ دے، یاد ہے رستہ مجھے۔'' وہ کجل سا ہو کر وضاحت دینے لگا۔

''ہاں اسی لئے تو روز آتے ہو ملنے۔'' وہ اب بھی باز نہیں آیا اور شرارت سے اسے چھیڑ کر ہنس دیا۔

''یار شادی شدہ بندہ ہوں سو مصروفیات ہوتی ہیں اور تجھے کنوارے پن سے عیش کرتے دیکھ کر جل جاتا ہوں اس لئے نہیں آتا۔'' اس کے جلے کٹے انداز پر اس نے اک بھرپور قہقہہ لگایا اور کلینک کمپاؤنڈر کے سپرد کر کے باہر سڑک کی اور نکل آیا اختر اس سے دو قدم آگے چل رہا تھا۔

سڑک پر معمول کی چہل پہل اور ٹریفک کا شور تھا، فٹ پاتھ پر دائیں بائیں گیندے کے پھولوں کے ساتھ کثرت سے ایستادہ صنوبر، املتاس اور چنار کے درختوں کی بالائی شاخوں پر ڈھلتی مدہم دھوپ کا بسیرا تھا، ان کے سروں سے کچھ اوپر چڑیاں اور جنگلی نیلے کبوتر محو پرواز گنگنا رہے تھے، چوں چوں غٹرغوں۔

''کیا ہوا؟'' اختر چنار کے درخت کے چوڑے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا اس کی نگاہیں چنار کی برہنہ شاخوں پر بیٹھے کالے کائیں کائیں کرتے کوؤں سے سفر کرتی ہوئی املتاس کی موٹی شاخوں کے کناروں پر کھلے جا بجا سرخ بڑے بڑے پھولوں پر تھیں۔

چلتی ہوا اور پرندوں کی حرکت سے پھول اور چنار کے نارنجی پتے متواتر زمین پر گر رہے تھے، اس کی نگاہوں کے تعاقب میں نظر دوڑا کر اس نے استفسار کیا۔

''یار میں اب سوچتا ہوں کہ چنار کی

شاخوں پر پنچھی اپنا آشیانہ کب بنائیں گے۔'' وہ ہنوز اسی انداز میں گویا ہوا۔

''دوست خیریت ہے، تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ ناممکن ہے، کیونکہ اس پیڑ کی شاخوں پر کوئی پرندہ گھونسلہ نہیں بناتا بھی۔'' اس نے ٹھٹک کر وضاحت دی اور وہ کچھ الجھ سا گیا تھا، بچپن میں ان دونوں کے درمیان زیادہ تر انہی پیڑوں کے متعلق گفتگو ہوتی تھی پھر اب اس کو اچانک سے یہ سب پھر سے دریافت کرنے کی کیا سوجھی تھی۔

''یہی تو، بالکل اسی طرح تیرا رشتہ ہونا بھی ناممکن لگنے لگا ہے مجھے۔'' پھاڑ کھانے والے انداز میں اپنی رائے دے کر وہ پھر سے چلنے لگا تھا۔

''اچھا۔'' اس کی غیر متوقع سی بات پر زوہیب کا قہقہہ بے ساختہ تھا، ہنستے ہوئے اس نے اچھا کا لفظ کچھ اس سکون بھرے انداز سے اس کی بات کے مفہوم میں چھپی ناراضگی کو محسوس کرتے ہوئے ادا کیا تھا کہ اختر دانت پیس کر رہ گیا۔

''اوہ یار! تم خواہ مخواہ ناراض ہو اب تک۔''

''خواہ مخواہ! میری جس دور پرے کی کزن کو تمہاری ماں جی نے رد کیا ہے لاکھوں میں ایک لڑکی ہے، صورت سے لے کر سیرت تعلیم سلیقہ کیا کمی ہے، ایک سے ایک ڈشز بناتی ہے ملکی و غیر ملکی، بڑا دکھ ہوا قسم سے اور وہ تو شکر ہوا کہ ماں جی کو بہانے سے ملوایا تھا ورنہ بہت ندامت اٹھانی پڑتی۔''

''یار ماں جی ان باتوں کو بہتر سمجھتی ہیں ان کو پتا ہوگا، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' وہ متانت سے گویا ہوا۔

درختوں اور پھولوں کے ساتھ ساتھ چلتے اب وہ کالونی میں داخل ہو رہے تھے، ہوا کے دوش پر رقص کرتے چنار کے پتے ان کے قدموں سے لپٹنے لگے۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں، ہونہہ اتنا ہی تو بچہ ہے اٹھائیس سالہ نوجوان ہے منہ سے پھوٹ نہیں سکتا ان کے سامنے کچھ اپنی رائے، ایسے یہ چلتا رہا تو ہو چکی تیری شادی۔'' اس نے منہ بگاڑ کر اس کی نقل اتاری اور پھر اسے لتاڑ کر رکھ دیا۔

''ریلیکس یار! تم تو ایسے میری فکر میں دبلے ہوتے ہو جیسے میں کوئی لڑکی ہوں، شادی تو یوں بھی ذمہ داریوں کا ٹوکرا سر پر لادنے کا نام ہے کوئی جلدی نہیں، جب ہوگی دیکھا جائے گا۔''

''لیکن اب میں تیرے لئے کوئی لڑکی نہیں ڈھونڈوں گا۔'' اختر نے روہانسے انداز میں بیان دیا۔

''ہاں ٹھیک ہے میرا بچہ۔'' اس نے ہنستے ہوئے اسے پیار سے پچکارا اور پھر ادھر ادھر کی چند ایک باتوں کے دوران وہ اپنے گھر پہنچ گیا اور اختر اندر آنے سے معذرت کرتا اپنے راستے ہو لیا۔

☆☆☆

''میاؤں، میاؤں۔'' کھانے کے دوران اس نے آواز کی سمت بے اختیار نظر دوڑائی اور اک بے ساختہ مسکراہٹ نے اس کے یاقوتی گلابی لبوں کو چھوا تھا۔

گھر کی منڈیر پھلانگ کر سرسبز بیلوں والی کیاری کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی ٹی وی لاؤنج کے کوریڈور کی جانب کھلنے والے جالی کے دروازے کے قریب آ کر ذرا کی ذرا گردن موڑ کر اندر جھانک کر میاؤں کی آواز کے ساتھ گویا اس نے اپنی آمد کی اطلاع فراہم کی تھی۔

''ماں جی آپ کی لاڈلی کی تشریف آوری ہو چکی ہے۔'' اس نے موبائل کان سے لگائے تحریم کے ساتھ باتوں میں مگن ماں جی کو مخاطب کیا۔

ابھی کچھ دیر قبل ہی موبائل پر اس سے باتوں کے دوران زوہیب نے ہنستے ہوئے اس کو بتایا تھا کہ اس کے بیاہ کے بعد ماں جی نے بلی سے دوستی کرلی ہے روزانہ اپنے مقررہ وقت پر نجانے کہاں سے آوارہ گردی کرتی ہوئی آتی ہے اور کوریڈور میں اپنے مخصوص برتن کے قریب بیٹھ کر ماں جی کی نوازشات سے فیضیاب ہوتی ہے۔

وہ اک گہرے کلر کی سیاہ دھاری دار جلد والی اک بے حد عام سی بلی تھی، جو دن بدن ماں جی کے لئے خاص الخاص بنتی جارہی تھی، اب بھی پیالے میں ڈالے گئے دودھ کو بے حد رغبت سے پینے میں مگن تھی، وہ کھانے سے فراغت پا کر ماں جی کو سلام کرتا باہر نکل آیا۔

پیار بھی عجب شے ہے
اضطرار میں مضمر
انتشار میں آگے
اختیار سے باہر

اس رات وہ بے حد اضطراری حالت میں اپنے کمرے میں موجود راکنگ چیئر پر نیم دراز آنکھیں موندے مسلسل جھول رہا تھا، دل و دماغ میں ایسی جنگ چھڑی تھی کہ اس کا وجود ریزہ ریزہ ہو کر بکھر چلا تھا، شورش ہستی نے اس کا چین سکھ قرار لوٹ لیا تھا۔

وہ جتنا اس عکس سے پیچھا چھڑاتا اس کے بعد وہ خیال پہلے سے زیادہ شدت سے اس پر حملہ آوار ہونے لگتے تھے۔

''چنار کے پیڑوں کی شاخوں پر کبھی کسی پرندے کا آشیانہ نہیں بن سکتا جیسے میری زیست میں تمہاری دائمی رفاقت کبھی ممکن نہیں ہو سکتی، پھر کیوں میرے تصور میں آ جاتی ہو؟'' بے بسی و اذیت کے عالم میں وہ خود کلامی کے سے انداز میں گویا ہوا تھا اور کھڑکی کی اوٹ سے اوائل تاریخوں کا زرد سا چاند جھانک رہا تھا۔

یہ تھکا تھکا سا جو چاند ہے
وہی خواب ہے کسی آنکھ کا
جسے جاگنے کی سزا ملی
یہ جو چاند ہے یہ جواب ہے
کسی اس طرح کے سوال کا
کہ جو آج تک نہیں اٹھ سکا کسی ذہن میں
یہ جو چاند ہے یہ تو باب ہے
کسی درد کا کسی ہجر کا کسی وصل کا
کبھی بن پڑے تو یہ پوچھنا
اسے گہری گہری نیند سے
بھلا کس نے آ کے جگا دیا
اسے روگ کس نے لگا دیا!!!

شام کے جھٹپٹے میں وہ علیزہ اور اسد سے ملنے اور اگلے دن ان کو اپنے ہاں لنچ پر مدعو کرنے ماں جی کی خاص تاکید پر ہاجرہ پھپھو کے گھر گیا تھا۔

احمد اور ماہا زبردستی اس کم گو اور سنجیدہ سی لڑکی کو کھینچ کر اپنے ساتھ کھیلنے باہر لان میں لے گئے تھے اور جب وہ وہاں سے رخصت لے کر گھر جانے کے ارادے سے نکلا تو سورج افق کے اس پار اتر رہا تھا، فضا میں بوجھل سی اداسی کا ہاتھ تھامے ہوا درختوں کی اوٹ میں چھپی کھڑی تھی۔

احمد اور ماہا کو پکڑنے کے لئے ان کے پیچھے بھاگتی عریشہ انجانے میں اس کے کشادہ سینے سے آن ٹکرائی، قریب تھا کہ وہ لڑکھڑا کر گر پڑتی زوہیب نے بے اختیار تھوڑا سا جھک کر اسے تھام لیا، عریشہ نے بے ساختہ اس کی جانب دیکھا

تھا اس پل اس کی سیاہ آنکھیں ان دو جھیلوں سے ٹکرائی تھیں اور نجانے کیسا طلسم کتنی گہرائی تھی کہ وہ نگاہ ہٹا نہیں پایا۔

عریشہ نے لمحے کے ہزارویں حصہ میں ٹپٹا کر اپنے آپ کو سنبھالا تھا شفق کی لالی آسمان سے اس کے عارضوں پر اتر آئی تھی اور روشن گلابی مکھڑے پر ندامت و خجالت کی چھاپ اس کی پلکوں کا لرزنا، پیشانی پر پسینے کے قطرے، وہ بوکھلا کر اپنے کمرے کی اور بھاگی اور پلٹ کر نہیں دیکھا جہاں زوہیب پتھر کے بت کی مانند ساکت کھڑا تھا۔

اور اب نجانے کیوں شدت سے اس کا دل بار بار اسے دیکھنے کی چاہ میں پاگل ہوتا سسک رہا تھا، وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آخر ایسا کون سا طلسم تھا جو زوہیب کو حتی الامکان دامن بچانے کے باوجود اس کی جانب کھینچتا تھا، اب سے نہیں نجانے کتنی مدت سے اک وہ چہرہ اس کے خیال اسے پریشان کرتے رہتے تھے، ان تمام الجھے سوالوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

☆☆☆

شب و روز اپنی مخصوص ڈگر پر رواں دواں تھے، علیزہ آپی کے مشورے پر اس نے گریجویشن مکمل کرنے کے بعد کئی سالوں سے تعلیم کا رکا ہوا سلسلہ پھر سے جوڑ لیا تھا اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں بی ایڈ کی غرض سے داخلہ لے لیا تھا۔

گھر میں اور نفوس ہی کتنے تھے، پاپا کاروباری مصروفیات میں کم رہتے تھے، ماما کا زیادہ تر وقت ٹی وی کے سامنے موبائل پر تمام دن گھڑی گھڑی سلطانہ خالہ وغیرہ سے گفتگو میں صرف ہوتا تھا، عریشہ بس چند لمحوں کے لئے خیر خیریت دریافت کر لیتی تھی اور ٹکر ٹکر ماما کو بلا تکان تمام دن فون پر باتیں کرتے سنتی، صفائی ملازمہ آ کر کر جایا کرتی، کچن وہ خود سنبھالتی تھی، اس کے باوجود ڈھیروں ڈھیر فراغت کا وقت کاٹے نہیں کٹتا تھا اور وجود میں پھڑ پھڑاتا پنچھی اپنی نوکیلی چونچ سے اسے زخماتا رہتا، اپنے کمرے کی دلفریب و بے کل سرگوشیاں کرتی تنہائی اور کمرے کے ایک کونے میں موجود بک ریک پر سجی کتابوں کے ہر لفظ ہر سطر میں اک ہی نام، اک ہی چہرہ بصارت کو دکھائی اور سماعت کو سنائی دیتا اس کی ذات کے دائروں کو توڑنے کی سعی میں مگن پل پل اسے آزماتا اور پھر کرلاتے بلکتے پنچھی کی فریادیں، کمرے کے در و دیوار گواہ تھے کہ وہ ضبط کرتے کرتے بھی رات کے سناٹوں میں چندا ماما کے سامنے بکھر جاتی تھی۔

لیکن اب جیسے زندگی پر چھایا جمود ہلکا سا مرتعش ہوا تھا، اپنی ذات کے دکھوں اور رنگ برنگ پنچھی کے اداس گیتوں کے بجائے اس کی توجہ اپنی اسائنمنٹ کی تیاری پر مرکوز رہنے لگی تھی۔

☆☆☆

''بیٹا آ جاؤ تھوڑی دیر کے لئے، ورنہ ویسے کون سا تم ہمارے ہاں آنا پسند کرتے ہو۔'' وہ ان کو گیٹ کے باہر چھوڑ کر پلٹنا ہی چاہتا تھا کہ اس کا ارادہ بھانپ کر پھپھی نے اسے اندر آنے کی پیشکش کر دی اور اس کے انکار کے باوجود اپنی بات پر مصر رہیں ناچار اسے ان کے حکم کی تعمیل میں ان کی معیت میں کھلے سیاہ گیٹ سے اندر قدم رنجہ کرنا پڑا جبکہ تصور میں ماں جی کی گھورتی نگاہیں شکوہ کناں تھیں وہ کہاں زوہیب کو ہاجرہ پھپھو کے گھر تن تنہا وقت گزارنے کی اجازت دینے کا خطرناک رسک اٹھا سکتی تھیں، مگر وہ بے اختیار ان کے تصور سے نظر چرا گیا۔

سرما کے دھند آلود دنوں میں کئی دن سے ابر

آلود مطلع آج خورشید کے کھل کر مسکرانے سے صاف ہوا تھا، گزشتہ کئی روز کی نسبت گو کہ آج فضا میں خنکی کا تناسب قدرے کم ہو گیا تھا پھر بھی ہوا کے خنک جھونکے اس پر ہلکی سی کپکپاہٹ طاری کر دیتے سہ پہر کے بعد گلابی دھوپ یوں بھی مری مری سی ہونے لگی تھی۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں گھسا لئے وہ کلینک سے اٹھ کر دوپہر کے کھانے کی غرض سے گھر آیا تھا جہاں ہاجرہ پھپھو نے صبح سے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے اور ماں جی سے باتوں میں مشغول تھی۔

کھانے سے فراغت کے بعد وہ زوہیب کے ساتھ ہی رخصت ہوئی تھیں دو گلیوں کا فاصلہ ہی تو تھا جوان دونوں نے ہلکی پھلکی باتوں کے دوران طے کیا تھا اور اب وہ گہری سانس خارج کرتا ہوا ٹنڈ منڈ پیڑوں اور خشک سی گھاس پر بکھرے جابجا سوکھے زرد پتوں سے مزین لان کے ایک جانب رکھے جھولے پر اسے دیکھ رہا تھا۔

نیوی بلو اور سیاہ کنٹراسٹ کے گرم سوٹ میں سیاہ گرم شال اپنے شانوں پر بکھرائے آنکھوں میں ڈھیروں ڈھیر زرد رتوں کی سی اداسی کا عکس لئے وہ درختوں کی بنجر شاخوں کی جانب نگاہ کیے نجانے کیا تلاش رہی تھی، وہ اسے اس اداس سے منظر کا ہی کوئی حصہ معلوم ہونے لگی۔

"عریشہ!" پھپھو کے دو بار پکارنے پر بمشکل وہ سوچوں کے ارتکاز سے چونک کر انہیں دیکھنے لگی تھی اور ان کے ہمراہ اسے دیکھ کر عریشہ نے بے اختیار سیاہ شال سے اپنا سر ڈھانپ کر زوہیب کے کیے گئے سلام کا جواب دیا تھا اور نظریں ہمیشہ کی مانند جھکا لیں۔

عریشہ کے وجود کا احاطہ کیے زرد سی دھوپ زوہیب کے اندر پھیل کر سائے بنانے میں مگن ہونے لگی وہ سر جھٹک کر اندر کی اور بڑھ گیا۔

تجھ سے ملنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے مل کر اداس رہتی ہوں

وہ مکمل توجہ سے کافی پھینٹ رہی تھی اس کو روبرو دیکھ کر ہمیشہ اس کے دل کو اک انجانی سی مسرت کے ساتھ ایک ہوک ابھرتی محسوس ہوتی تھی، کرب نارسائی یونہی عریشہ کے دل کو کچوکے لگا کر اسے زوہیب کے سامنے بیک وقت متضاد کیفیات سے ہمکنار کرتا تھا۔

اس نے اک بوجھل سانس سرد فضا کے سپرد کی اور اپنی ذات کے شور سے نظر چرا کر بے نیازی کا لبادہ اوڑھے ڈرائنگ روم کی سمت قدم بڑھا دیئے۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟" کافی کا مگ اٹھا کر زوہیب نے اس پر اک سرسری سی نگاہ کی تھی لیکن اس کی سرخ ہوتی ستواں ناک اور گھنی لمبی پلکوں کی جھالر والی بڑی بڑی گہری آنکھوں میں تیرتے گلابی ڈورے بے حد نمایاں ہو رہے تھے زوہیب کا ٹھٹکنا بے جا نہ تھا۔

"جی!" اس نے اپنے نڈھال وجود کو بدقت سنبھال کر محض جی کہنے پر اکتفا کیا۔

"تمہاری طبیعت تو واقعی ٹھیک نہیں لگ رہی؟" ماما نے چونک کر فکر مندی سے اس کا چہرہ ملاحظہ کیا تھا۔

"ارے تمہیں تو بخار لگ رہا ہے؟" انہوں نے پلٹ کر باہر نکلتی عریشہ کا ہاتھ تھاما تھا، کافی کو گرما گرم عجلت کے سے انداز میں اپنے اندر انڈیلتے زوہیب نے ان کی بات پر بے ساختہ اسے دیکھا تھا۔

"ماما ہلکا سا ٹمپریچر ہے کوئی ایسی فکر مندی کی بات نہیں، سرد موسم کی سوغات ہے۔" عریشہ نے

لاپرواہ سے انداز میں وضاحت دے کر ان کی فکر دور کرنی چاہی۔

''آخر تم اپنی ذات سے اس قدر لاپروائی کیوں برتتی ہو؟ اتنی گرم ہو رہی ہو، تپ رہا ہے تمہارا ہاتھ، آرام کرنے کی بجائے یہاں وہاں پھر رہی ہو، کام بھی کیے۔'' ماما کے لہجے سے اس کے لئے تشویش، محبت چھلک رہی تھی انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے قریب ہی آرام دہ صوفہ پر بیٹھا لیا۔

''زوہیب بیٹا میری یہ بچی بہت کم گو، صابر اور لاپرواہ ہے اب یہی دیکھ لو اگلے گھر جا کر یونہی اپنی ذات سے غافل رہے گی تو کیا ہو گا، نجانے وہ لوگ کیسے ہوں گے اس کا خیال رکھیں گے یا نہیں، جب سوچتی ہوں کلیجہ ہل جاتا ہے۔'' ماما کی یہ وقت بے وقت کی راگنی وہ بھی اس شخص کے سامنے، وہ سخت کوفت میں مبتلا ہونے لگی اور اضطراری انداز میں اپنی انگلیاں مروڑنے لگی۔

''جی آپ ٹھیک کہتی ہیں انسان کو اپنا خیال خود رکھنا چاہیے۔'' ان کی بات پر وہ سنجیدگی سے گویا ہوا اور خالی مگ سامنے دھری میز پر ٹکا کر اجازت طلب نظروں سے انہیں دیکھا۔

''میں ابھی کلینک جا کر میڈیسن بھجوا دیتا ہوں انشاء اللہ طبیعت جلد ٹھیک ہو جائے گی۔'' ان سے رخصت لیتے ہوئے اس نے بیان دیا وہ بخوبی جانتا تھا کہ اب وہ لوگ اسے اپنا ''فیملی ڈاکٹر'' بھی مانتے تھے گو کہ اس کا مخاطب عریشہ تھی لیکن اس نے اس کی جانب دیکھنے سے گریز کیا۔

''چیک تو کرتے جاؤ۔'' ماما کی بات ڈرائنگ روم کے دروازے کی اوٹ میں ایستادہ سردسہ پہر نے سنی اور ہوا کے خنک جھونکے بے تابی سے بند دروازے سے ٹکرانے لگے۔

عریشہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا، وہ جاتے جاتے ٹھٹک کر پلٹا اور سنجیدگی سے گہری سانس بھرتا اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔

''دکھایئے۔'' اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پھیلائے وہ منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق عریشہ نے اپنی نازک سی گلابی کلائی اس کے حوالے کر دی، ماما اٹھ کر اپنے کمرے کی اور جا چکی تھیں ان کی یہ حرکت اسے بہت عجیب اور سطحی قسم کی لگی تھی، اس نے بے ساختہ لب بھینچ لئے، زوہیب نجانے کیا سوچے گا۔

اسی پل زوہیب نے اس کی نبض چیک کرنے کے لئے کلائی پر گرفت کی تھی اور نجانے کیا ہوا تھا کہ بظاہر اعتماد سے براجمان عریشہ کا ہاتھ بری طرح کپکپانے لگا تھا۔

زوہیب نے چونک کر اس کے سرخ پڑتے چہرے کی سمت دیکھا اور اس کی لرزتی کلائی چھوڑ دی، اس کے ذہن میں بچپن کی بھولی بسری یادوں نے سر اٹھایا تھا اس کا شدت سے دل چاہا کہ وہ اس سے وہی سالوں پہلے والا سوال پوچھے۔

''تم مجھ سے اتنا شرماتی کیوں ہو؟'' لیکن دل کے نہاں خانوں سے سر اٹھاتے سوال کو سختی سے کچل کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا، درختوں کی شاخوں سے جھانکتی دھوپ دور تک اسے دیکھتی رہی اور دھوپ کی بدولت بنتے سائے ساکن تھے۔

اک دل ہی تھا جس سے کبھی نہ بن سکی میری
باقی تو سب عزیز میرے ہم خیال تھے

☆☆☆

''اوں ہوں کوئی ایک لڑکی بھی ایسی نہیں ہے جسے دیکھ کر فوراً بہو بنانے کو جی مچل اٹھے۔'' ماں جی نے منہ بنایا، تحریم کو سوا ماہ پیشتر اللہ نے

اپنی رحمت سے نوازا تھا اور ایک خوبصورت ننھی سی گڑیا ''لاریب'' عطا کی تھی۔

ان لمحوں میں ماں جی راولپنڈی میں اپنی پیاری نند اور سمدھن سلطانہ باجی کے ہاں موجود تھیں، سب لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی، اس ایک ماہ سے زائد کے عرصہ میں ماں جی کا ایک پاؤں پنڈی اور دوسرا چکوال میں ہوتا تھا گو کہ سب لوگ یہاں اس کا بے حد خیال رکھنے والے اور محبت کرنے والے تھے لیکن ان کا دل تحریم اور ننھی سی گڑیا سے دوری گوارا ہی نہ کرتا تھا۔

اب تحریم چلہ نہا کر لاریب کے ہمراہ میکے میں خوب ناز اٹھوا رہی تھی، ماں جی، بابا جی اور زوہیب ہمہ وقت لاریب کے ساتھ مگن رہتے ان کے ہاتھ جیسے کوئی دلچسپ کھلونا لگ گیا تھا۔

اس دن یونہی باتوں کے دوران تحریم نے لاریب کی پیدائش کے ہفتہ بعد منعقد کی گئی عقیقہ کی تقریب میں سلطانہ پھپھو کے سسرالی رشتے داروں کی لڑکیوں کے متعلق ماں جی کی رائے مانگی تو انہوں نے منہ بنا کر اظہار خیال کیا وہ بے اختیار گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

موسم بہار کی خوشگوار ہوا ٹی وی لاؤنج کے کھلے جالی دار دروازے سے اندر آ کر اسکن کلر کی ٹائلز سے مزین کوریڈور کی دیوار کے ساتھ بنی طویل کیاری میں موجود سرسبز بیلوں پر کھلے جا بجا سفید، پیازی، نیلے گلابی اور کاسنی پھولوں کی مہک لئے تحریم کے خوبصورت چہرے پر آئی بالوں کی لٹوں کے ساتھ چھیڑ خانی کرنے میں محو تھی۔

بابا جی حسب معمول دکان پر تھے اور زوہیب بھائی کچھ دیر قبل دوپہر کا کھانا کھا کر کلینک سدھارے تھے، ننھی لاریب ان کی گود میں مزے سے محو استراحت تھی۔

''ماں جی مجھے بے حد فکر ہوتی ہے بھائی کی شادی کا مسئلہ ایسے کیسے حل ہوگا آپ کو کوئی لڑکی بھا ہی نہیں رہی۔'' شام کے کھانے کے لئے مٹر کے دانے نکالتے ہوئے اس نے لب کشائی کی اس کا ارادہ مٹر پلاؤ بنانے کا تھا۔

''تو تمہیں کیا لگتا ہے مجھے انکار کرنے کا شوق ہے یا میں پاگل ہوں بیٹے کی دشمن ہوں دانستہ اس کی شادی کرنے سے اجتناب برت رہی ہوں، اس عمر میں گھر کی ذمہ داریاں اٹھانے کی بہت ہمت ہے جو میں بہو نہیں لا رہی۔'' ماں جی یکلخت پھٹ پڑی تھیں انہوں نے طنز کے ڈونگروں کی بارش سی کر دی۔

''ہائے ماں جی قسم سے ٹھنڈ پڑ گئی کلیجے میں، اتنے عرصے بعد یوں آپ کی جھڑکیاں سننے کو ملی ہیں ورنہ تو کان ترس گئے تھے میرے۔'' تحریم بے ساختہ ہنس پڑی۔

سبزی مائل گلاس ونڈوز کی اوٹ میں ایستادہ گھنی بیلوں پر رنگ برنگ پھولوں کے گچھے ہوا کے دوش پر رقص کناں تھے، تحریم کی بے سروپا باتیں اور ہنسی کو یکسر نظر انداز کیے وہ منہ پھلا کر کھلے دروازے کے دائیں طرف کیاری کے عین مقابل دیوار کے ساتھ اپنے مخصوص پیالے کے قریب اونگھتی گرے کلر کی سیاہ دھاری دار بلی کو دیکھنے لگیں جو پیالے میں موجود دودھ چٹ کر جانے کے بعد اب ستا رہی تھی، اسی لمحہ ہوا کے جھونکے کی بدولت سرسبز بیلوں پر لہراتے پھولوں کے گچھوں میں سے بہت سے پھول ٹوٹ کر اس کے وجود سے ٹکرائے تھے۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور جونہی اس کی نگاہ کھلے جالی دار دروازے کے اندر فلور کشن پر براجمان ماں جی کے پروقار چہرے سے ٹکرائی وہ اک ادا سے انہیں دیکھ کر دم ہلا کر اپنی خوبصورت سرمئی آنکھیں میچ کر میٹھی میٹھی نظروں سے ان پر

نثار ہونے کے سے انداز میں وہیں سابقہ انداز میں براجمان بڑے لاڈ سے خفیف و مدہم آواز میں میاؤں میاؤں کرنے لگی۔

''مجھے لڑکیوں کے فیشن ایبل ہونے پر اعتراض نہیں ہے بلکہ بے ہودہ اور بے تکے فیشن مشرقی روایات اور مذہب سے دوری پر شکایت ہے، یہ لڑکیاں آنے والی نسلوں کی مائیں ہیں اپنی گود میں نسلوں کی اولین درسگاہ میں ان کو کیسے اقدار اور کس شخصیت کا حامل بنائیں گی۔'' انہوں نے بلی پر سے نگاہیں ہٹا کر تحریم کو ملاحظہ کیا جوان کی بات کے زیر اثر فکر انگیز انداز میں ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔

''جدید فیشن والے لباس تم اور عریشہ بھی پہنتی ہو لیکن تم لوگوں کی سادگی، حیا اور معصومیت تم لوگوں میں اک عجب سی تمکنت و وقار پیدا کر دیتے ہیں۔''

''عقیقہ کی تقریب میں عریشہ سر پہ دوپٹہ جمائے مشرقی اقدار کی ترجمانی کرتی سب لڑکیوں میں الگ لگ رہی تھی، ہاجرہ باجی خود تو بے ڈھنگی ہیں لیکن لڑکیوں کو ڈھنگ طریقے سے لگایا ہے جو ماننے والی بات ہے بہت اچھی تربیت کی ہے انہوں نے۔'' ماں جی نے توصیفی انداز میں بیان دیا۔

''اسی لئے تو کہتی ہوں عریشہ آپی کو میری بھابھی بنا دیں، آج کے دور میں ایسی لڑکی چراغ تو کیا ٹیوب لائٹ لے کر پھرنے سے بھی نہیں ملے گی۔'' وہ یکدم شوخی سے گویا ہوئی اور تو اور اس نے جھٹ موقع دیکھ کر چوکا مارنے کی سعی کی لیکن ماں جی نے بال کو باؤنڈری وال تک جانے سے فوراً روک دیا۔

''اس کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ وہ تمہاری ہاجرہ پھپھو کی بیٹی ہے۔'' وہ گہری سانس بھر کر گویا ہوئیں۔

''آپ پرانی رنجشیں دل سے نکال دیں اب تو وہ پیار کرتی ہیں۔'' وہ جرح پر اتر آئی۔

''وہ بدلتے وقت کے ساتھ اپنی غرض کے لئے سدھری ہیں ان کا وہ روپ میں نہیں بھول سکتی کبھی۔'' جواب حاضر تھا۔

''ماں جی چھوڑیں نہ وہ باتیں۔'' ملتجی لہجہ، رجائیت سے بھرپور آنکھیں۔

''کیسے چھوڑ دوں ہاجرہ باجی کے ساتھ صبر سے جو نو سال کا کٹھن عرصہ میں نے گزارا ہے نہیں محو ہوتا میری یادداشت سے بے دام غلام بن کر ان کو چاہا، مانا، خدمتیں کیں اس کے باوجود طعنے، تشنے، ذلت ان کا کسیلہ لہجہ میرا صبر آزماتا رہا اور تو اور ساس مرحومہ فطرتاً نیک دل تھیں، لیکن ان کی موجودگی میں ہمیشہ مجھ سے متنفر رہیں ہاں بعد میں ان کا رویہ بدل گیا تھا شہہ دینے اور تیلی لگانے والی بیٹی جو ساتھ نہیں رہی تھی وہ وقت۔'' ماں جی اپنے پسندیدہ موضوع پر ہر بار کی مانند نئے سرے سے شروع ہو چکی تھیں رقت آمیز لہجے میں ماضی کی تلخ یادیں آنسو بہا رہی تھیں۔

تحریم بے چارگی سے منہ لٹکائے دل مسوس کر رہ گئی، جبکہ راہداری کے ایک جانب تشریف فرما بلی صاحبہ بے حد ادب سے انہیں ملاحظہ کرتی رہی۔

گر نہیں وصل تو یہ خواب رفاقت ہی سہی
وقت سے کون کہے یار ذرا آہستہ !!

☆☆☆

پاپا کے منہ سے اچانک اتنی غیر متوقع بات سن کر عریشہ کے حلق میں نوالہ تک اٹک گیا جبکہ تمام حاضرین مسرت آمیز خوشگوار تحیر سے مبارک، سلامت کے پیام کے ہمراہ اللہ کا شکر ادا

کرنے میں مشغول ہو گئے تھے۔

سعد بھائی سمیت سلطانہ خالہ کی سواری باد بہاری گزشتہ شام ان کے شہر میں اتری تھی، جبکہ علیزہ آپی کے بچوں کے سکول میں جاری ماہانہ ٹیسٹ کی بدولت ان کا یہاں آنا ناگریز تھا، سلطانہ خالہ کی موجودگی میں ان کے اور ماموں کے گھر کے مابین موجود دو گلیوں کا فاصلہ سمٹ جاتا تھا کھانا وہ سب لوگ ماموں کے اصرار پر زیادہ تر ان کے ہاں نوش کرتے تھے اور ایک آدھ وقت کے کھانے پر ماما بھی ان سب کو مدعو کر لیتیں تھیں، کل رات کا ڈنر اور دوپہر کا لنچ ماما پاپا نے ماموں کے گھر خالہ خالو کی معیت میں کیا تھا عریشہ ہمیشہ کی مانند کسی نہ کسی بہانے اپنے گھر رہی تھی۔

اور آج رات کے ڈنر کے لئے ماما نے ان سب لوگوں کو ادھر مدعو کیا تھا یوں بھی ڈنر کے فوراً بعد سلطانہ خالہ کی تحریم اور لاریب کے سنگ واپسی تھی، ان سب نے کچھ ہی دیر میں راولپنڈی کے لئے روانہ ہونا تھا۔

''بھئی واہ بہت ذائقہ ہے عریشہ بیٹی کے ہاتھ میں، مزا آ گیا۔'' کھانے کے دوران خالہ خالو، ماموں مامی کے توصیفی تبصرے وہ مدھم سی مسکراہٹ سمیت سنتی رہی۔

''عریشہ آپی کمال کی ڈشز بنائی ہیں آپ نے، آپ کی ہمت ہے ایک ہی وقت میں اکیلے اتنی ساری ڈشز تیار کرنا آپ ہی کی ذات کا خاصہ ہے۔''

''بس بس لڑکی اتنی تعریفیں سن کر میں موٹی ہو جاؤں گی اتنا نہ پھلاؤ مجھے۔'' اس نے ہنستے ہوئے پیار سے تحریم کو چپت رسید کی تھی۔

''اور میری کوکنگ اگر اچھی ہے تو اس کا سہرا مامی کے سر جاتا ہے۔'' اس نے کھلے دل سے اعتراف کیا، اس کی بات پر ماما خواہ مخواہ جز بز ہو گئیں اور اک سنجیدہ نظر اس پر ڈال کر فرائیڈ فش سے کانٹے نکالنے لگیں۔

جبکہ باقی سب کے چہروں پر مسکراہٹ تھی اور مامی کی استفہامیہ نگاہیں بے ساختہ اس کی جانب اٹھی تھیں۔

''علیزہ آپی آپ کے ہاں سے جو ڈش سیکھ کر آتیں وہ گھر میں ٹرائی کے دوران مجھے بھی سکھایا کرتی اس لئے۔''

''آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے بیٹا ورنہ اور کوئی بات نہیں ہے۔'' ماں جی نے اک نظر بڑی نند کے تنے تنے سے چہرے کے نقوش پر ڈالی پھر اپنے مخصوص دھیمے شفیق انداز میں اسے مخاطب کیا۔

''مامی آپ شرمندہ نہ کریں۔'' وہ سچ میں نادم ہونے لگی تھی اور فریج سے سویٹ ڈش نکالنے کے بہانے وہاں سے کھسک گئی، ماں جی گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔

بہاروں کی شب کی خوشگوار ہوا ڈائننگ روم کی کھلی کھڑکیوں سے بار بار اندر جھانکتی تھی، رات نے اپنی مٹھی کھول کر آسمان پر جابجا ستارے پھیلا دیئے تھے لیکن چندا ماما کسی ابر کی اوٹ میں دبکے پڑے تھے جو کھلی کھڑکیوں کے اس پار دکھائی دیتے نخل فلک سے ہنوز غائب تھے۔

سویٹ ڈش سرو کر کے اس نے اک نظر اس پار سیاہ آسمان کی ستاروں بھری شام کے درمیاں چندا ماما کی تلاش میں دوڑائی پھر مایوسی سے اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔

چند لمحات قبل پاپا کو سیل فون پر ندیم بھائی کی کال موصول ہوئی تھی وہ معذرت کرتے ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ کر باہر اک کونے میں چلے گئے تھے۔

''کیا ہوا بھائی صاحب بہت خوش دکھائی دے رہے ہیں؟'' ان کے چہرے پر مسرت اور دبے دبے سے جوش کی کیفیت دیکھ کر بابا جی نے سوال کیا سب حاضرین بھی ان کی جانب متوجہ ہو چکے تھے، حتی کہ لاتعلقی سے نظریں جھکا کر فرنی کے لقمے لیتا زوہیب بھی انہیں سر اٹھا کر دیکھنے لگا۔

''بات ہی ایسی ہے۔'' انہوں نے سب کے متجس چہروں پر نگاہ ڈال کر ان کا اشتیاق مزید بھڑکایا۔

''ندیم نے اپنی عریشہ کے لئے بہت اچھا پرپوزل دیکھا ہے، ندیم کے صادق آباد والے دیرینہ دوست کا بھائی ہے، ایل ڈی اے میں افسر ہے پڑھا لکھا، نیک سلجھا ہوا لڑکا ہے، لوگ دیکھے بھالے ہیں ان کے پڑوس میں ہی تو آباد ہیں۔'' ستارے کھڑکیوں پر ٹکے انہیں سماعت فرما رہے تھے ہوا ساکن ہو گئی تھی۔

شاہی ٹکڑے کا لقمہ عریشہ کے حلق میں اٹک گیا تھا، سب لوگ خوشی کا اظہار کر رہے تھے اور ماما اللہ کا شکر۔

عریشہ کو یکدم کھانسی کا دورہ پڑ گیا تحریم اس کی کمر سہلا کر پانی کا گلاس پکڑا رہی تھی۔

''عقیقہ کی تقریب کے دوران کھینچی گئی تصاویر ملاحظہ کرتے ہوئے لڑکے کی والدہ نے عریشہ کو پسند کر کے ندیم اور بہو سے اس کی بابت دریافت کیا اور پرپوزل دے دیا۔''

''اس ہفتہ کو وہ لوگ ندیم کے ساتھ رشتہ باضابطہ ڈالنے کے لئے ہمارے ہاں آ رہے ہیں۔'' لمحہ بھر کے توقف سے پاپا نے سلسلہ کلام جوڑا اور انبساط و مسرت سے معمور آواز میں تفصیل فراہم کرنے لگے۔

گلے میں لگے پھندے کی بدولت کھانسنے سے عریشہ کی آنکھوں میں ڈھیروں ڈھیر پانی جمع ہو گیا تھا وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر باہر نکل گئی نمکین پانی کے بے شمار قطرے آنکھوں کی دہلیز پھلانگ کر اس کے عارضوں پر بہنے لگے۔

''ہاہاہا شرما گئی۔'' سعد بھائی نے جاندار قہقہہ لگایا اور قریب بیٹھے زوہیب کے کندھے پر ہاتھ مارا وہ ناسمجھی سے مسکرا دیا، کھڑکیوں پر ٹکے کتنے ستارے چپ چاپ ٹوٹ کر بکھر گئے تھے، ہوا ہنوز دم سادھے کھڑی تھی۔

نجانے کیوں پھپھا جان کی بات سن کر زوہیب کے اندر یکلخت ویرانیاں اور اندھیرے چھا گئے تھے، اپنی کیفیت وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر تھا اسے صرف حاضرین کے ہلتے لب اور مسکراتے چہرے دکھائی دے رہے تھے، اس کے سوا اس کا گم صم ذہن کچھ بھی سمجھنے سے انکاری تھا، وہ خالی الذہنی سے فرنی کے پیالے میں چمچ ہلانے لگا۔

وقت رخصت خالہ نے اسے اچھے نصیب کی بے شمار دعاؤں سے نوازا تھا اور تو اور آج تو ماما کے چہرے پر اسے ڈھیروں ڈھیر طمانیت کے آثار نظر آ رہے تھے انہوں نے محبت سے اس کے سر پر دست شفقت رکھا تھا۔

''آپ اتنی اداس کیوں ہو گئیں؟'' تحریم کی بات پر وہ چونک گئی اس نے تو حتی الامکان اپنے آپ کو کمپوز کر کے رکھا تھا اور یہ گلے سے لگی تحریم نے اس کی آنکھوں کی اداسی کو پا لیا تھا۔

''میں ماما، پاپا کو تنہا چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتی اس لئے۔'' اس نے بوجھل سی سانس خارج کی۔

''اوہ تو یہ بات ہے جناب عنقریب ندیم بھائی کی ٹرانسفر چکوال میں ہو رہی ہے پھپھا جان نے آپ کے دکھ سے فرار ہونے کے بعد یہ خبر

سنائی تھی کہ اب جلدی سے خوش ہو جائیں۔'' اسے مطمئن کرنے کے لئے عریشہ نے بدقت تمام اذیتوں کے پل صراط سے گزرتے ہوئے مسکراہٹ کے انداز میں لب پھیلا دیئے یہ اور بات کہ آنکھ کا گوشہ چپکے سے نم ہوا تھا۔

یوں تو میں ہنس پڑا ہوں تمہارے لئے مگر
کتنے ستارے ٹوٹ پڑے ہیں اک ہنسی کے ساتھ

وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے قریب جا کھڑی ہوئی اور ذرا سا پردہ سرکا کر پورچ کی جانب دیکھا سلطانہ خالہ کے ہمراہ ان کا قافلہ گاڑیوں میں روانہ ہو چکا تھا اور وہ دشمن جاں مین گیٹ بند کر کے چھوٹا سائیڈ ڈور کھول کر ماموں مامی کے سنگ، ماما پاپا سے اجازت طلب کر رہا تھا، اس کے دل میں ہوک سی اٹھی بے ساختہ پردہ برابر کر کے وہ کھڑکی سے ٹیک لگا کر رو دی، کچھ ہی دیر میں جب ماما پاپا کے اپنے کمرے کی اور جانے کا یقین ہو گیا تو چپکے سے دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل آئی۔

اس کے اندر عجیب سی وحشت، بے کلی اور اضطراب نے مل کر اک قیامت برپا کر رکھی تھی، وجود میں پھڑ پھڑاتا زخمی پنچھی با آواز بلند بین کر رہا تھا، اس کا اپنا آپ بھربھری مٹی کی مانند ٹوٹ کر بکھرتا جا رہا تھا۔

وہ لرزتے قدموں کپکپاتے وجود کے ہمراہ لان میں چلی آئی اور پاگلوں کی مانند لان میں ایک شجر سے دوسرے شجر تک بھاگتی ہنوز آسمان کی جانب نگاہ کیے چندا ماما کو تلاشتی رہی۔

آسمان کے تھال میں سجے ستاروں نے بغور اس کی تشنگی ملاحظہ کی تھی، گلاب، موتیا، چمپا، بیلا اور گیندے کے سفید، زرد اور سرخ پھولوں سے لدے پودے دم سادھے کھڑے تھے، املتاس، شیشم، کیکر کے پیڑ ساکن تھے، ہوا ہو لے ہولے سے سیب اور لیچی کے بور سے لدے درختوں سے کچی بور کی مہک فضا میں پھیلا رہی تھی۔

آنسوؤں سے تر بتر چہرے اور پھولی سانسوں سمیت وہ شکست خوردہ انداز میں لان میں رکھے جھولے پر آ بیٹھی اور گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر بازوؤں کے حلقے میں اپنا چہرہ چھپائے ہچکیوں سے رونے لگی۔

محبت جیت ہوتی ہے
مگر یہ ہار جاتی ہے
کبھی بے کار رسموں سے
کبھی تقدیر والوں سے
کبھی مجبور قسموں سے۔
مگر یہ ہار جاتی ہے
محبت جیت ہوتی ہے

اگلے ہی پل اس نے جھٹکے سے اپنا چہرہ اونچا کیا اور اس کی نگاہوں کے عین سامنے رات کی ہتھیلی پر نمودار ہوتا ہلال پوری طرح سے اس کی اور متوجہ تھا۔

''چندا ماما۔'' اس نے سسکاری بھری۔

''آپ تو جانتے ہیں ناں چندا ماما میری رگ رگ میں زوہیب احمد بستا ہے میں اپنے دل میں موجود اس کے لئے یک طرفہ محبت کو زادراہ بنا کر جینا چاہتی ہوں، میں...... میں زوہیب کے نام پر تمام عمر تیاگ دینے کو تیار ہوں لیکن کسی اور کی ہونا مجھے گوارا نہیں ہے، میں کسی کو دھوکا نہیں دے سکتی اور اپنے اندر سے زوہیب احمد کو کھینچ کر باہر بھی نہیں نکال سکتی میری نس نس میں لہو بن کر گردش کرتا ہے میں لہو لہو ہو کر بھی نہیں نکال سکتی اسے اپنے وجود سے، وہ میری سانسوں میں بستا ہے۔'' سسکیوں کے درمیاں اپنے بچپن کے ہمراز کے سامنے حال دل بیان کرتے ہوئے یکدم اس نے آنکھیں بند کر کے سبک خرامی سے

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ،
سرگزِشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

چلتی معطر ہوا میں گہری سانس بھری۔
''زوہیب!'' اگلے ہی پل اس کے لبوں نے سرگوشی کی اور وہ جھولے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور چونک کر دائیں جانب نظر دوڑائی۔
''زوہیب!'' وہ خود کلامی کرتی سیب کے درخت کے قریب آ کھڑی ہوئی اور بوجھل سانس کھلی فضا کے سپرد کر کے تھکے ہوئے انداز میں درخت کے تنے سے ٹیک لگالی۔
''وہ یہاں نہیں ہے مگر یہ ہوائیں مسلسل اس کی موجودگی کو بیان کر رہی ہیں ہوا میں اس کے لمس کی خوشبو بے حد نمایاں ہے جیسے یہ جھونکے مجھ تک آنے سے پہلے اسے ہولے سے چھو کر آئے ہیں ناں، چندا ماما یہ ہوائیں تو میں جہاں جاؤں گی اسی آسماں کی چھت تلے مجھے آ کر ستائیں گی اس کی خوشبو لائیں گی، محبت کیسے انسان کو جیتے جی تڑپا تڑپا کر مارتی ہے کوئی مجھ سے پوچھے۔'' کربناک لہجے میں آنسوؤں کی روانی کے درمیاں بکھرتی آواز میں وہ چاند سے مخاطب تھی۔
بور سے لدے سیب کے درخت کی گھنی شاخیں قدرے نیچے کو جھکی اپنے سائے میں تنے سے ٹیک لگائے بھیگی آنکھوں، بہتے آنسوؤں بوجھل لہجے اور بکھری ذات کی حامل اس لڑکی کو یک ٹک ملاحظہ کر رہی تھیں۔
اور اسی شجر کے دوسری جانب تنے سے ٹیک لگائے دم سادھے ششدر انداز میں دم بخود سا زوہیب کھڑا تھا جبکہ عریشہ اس کی وہاں موجودگی سے یکسر بے خبر تھی۔
ماں جی اور بابا جی کے ہمراہ پھپھا جان سے رخصت لے کر عین دروازے سے نکلتے سے اچانک سے اسے یاد آیا تھا کہ وہ اپنا موبائل تو اندر ہی کہیں بھول آیا ہے اور اپنی یہ سوچ پریشانی کی صورت با آواز بلند اس نے سب کی سماعتوں کی نذر کی۔
''اپنا ہی گھر ہے موبائل یہیں کہیں ہوگا، تم ایک بار اندر جا کر دیکھو ہم چلتے ہیں اچھا بھائی صاحب۔'' اس کی بوکھلاہٹ پر بابا جی نے دلاسہ دیا پھر پھپھا جان پر الوداعی نگاہ ڈال کر ماں جی کے ہمراہ باہر نکل گئے جبکہ وہ پھپھو پھپھا جان کی معیت میں ڈرائنگ روم کی اور بڑھ گیا جس کے ایک حصہ کو ڈائننگ روم کی شکل دی ہوئی تھی۔
بڑے سے ہال نما کمرے پر طائرانہ اک نگاہ ڈالتے ہوئے اسے دائیں طرف کے ٹو سیٹر صوفہ پر اپنا سیل فون پڑا نظر آگیا۔
''مل گیا چلو اچھا ہے۔'' پھپھا جان نے سکون بھری سانس خارج کی اور اپنا موبائل واپس واسکٹ کی جیب میں رکھ لیا جو انہوں نے زوہیب کو مس کال دینے کے لئے اسی لمحہ باہر نکالا تھا۔
وہ لوگ مطمئن ہو کر اپنے کمرے کی جانب چلے گئے اور زوہیب نے باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔
اس نے ٹھٹک کر لان میں وہ نظارہ دیکھا اس کی کم گو سی کزن عریشہ ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ تک دیوانگی کے عالم میں بھاگ رہی تھی اس کی متلاشی نگاہیں اوپر ستاروں سے بھری شیال میں لپٹے سیاہ آسمان پر مرکوز تھیں سیاہ کاٹن کی آتشی گلابی کڑھائی والی لمبی قمیض پر کڑھائی سے ہم رنگ چوڑی دار پاجامہ اور بڑی سی چادر اپنے شانوں پر پھیلائے پھولی ہوئی سانسوں اور پیشانی پر چمکتے پسینے کے قطروں سے بے نیاز وہ آسمان پر نجانے کیا کھوجنے کی جستجو میں ہلکان تھی۔
پھر اسی عجلت و وحشت کے عالم میں وہ تھکے ہارے انداز میں جھولے پر بیٹھ کر گھٹنوں میں چہرہ

چھپائے سسکنے لگی تھی وہ اچنبھے کے سے عالم میں
چلتا ہوا دھیرے سے اس کے قریب آیا پیشتر اس
کے کہ وہ اس سے کچھ دریافت کرتا آنسوؤں سے
تر بتر چہرہ اٹھا کر بھیگی آواز میں اس نے پھر سے
اوپر آسمان پر نگاہ کی اور افق کے اس پار کنارے
سے ابھرتے ہلال پر نظر پڑتے ہی اپنے درد کی
الفاظ کی صورت دینے لگی۔

چونکہ زوہیب کی جانب اس کی پشت تھی وہ
اس کی موجودگی جان نہیں پائی اور اس پر طاری
جنوں نے اسے گردوپیش سے آگاہ کب ہونے
دیا تھا۔

لیکن اس کے پہلے جملے نے ہی زوہیب پر
حیرتوں کے پہاڑ توڑ ڈالے تھے وہ نت نئے
انکشافات کی زد میں شب کے سناٹوں کو چیرتی
اس کی درد بھری آواز کے طلسم میں جکڑا کھڑا تھا۔

اور اس کے لبوں سے سرگوشی کی صورت اپنا
نام سن کر وہ یکلخت غیر ارادی طور پر جھولے سے
کچھ ہی قدم کے فاصلے پر ایستادہ سیب کے پیڑ کی
اوٹ میں چھپ گیا تھا۔

ایک پل کے لئے عریشہ کو اس پیڑ کے
مقابل دیکھ کر اسے گمان گزرا کہ وہ اس سے
مخاطب ہے اور اس کی موجودگی بھانپ چکی مگر پھر
اس کے اگلے جملوں نے اس کا گمان غلط ٹھہرا دیا،
وہ دنگ رہ گیا وہ لڑکی چلتی ہواؤں میں اس کی
خوشبو محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اس کی
سمندروں جیسی گہری محبت اس کے وجود کے گرد
کھڑی خود ساختہ دیواریں گرا کر زوہیب کے جسم
وجاں کو پانی پانی کر گئی تھی۔

اور اس طوفان میں موجود محبت نام کے اک
جزیرے پر کھڑا وہ بے یقینی سے ہرے بھرے
خوابوں کے پیڑوں پر اک نام اک چہرہ بے حد
واضح دیکھ رہا تھا اس کے نڈھال وجود میں اب
اس چہرے کو اپنے تخیل کے پردوں سے جھٹلانے
کی اور سکت نہیں تھی سالہا سال وہ اس عکس کو
اپنے دل و دماغ سے کھرچنے کی خود ساختہ
کوششیں کر کے اپنے تئیں مطمئن ہو جاتا تھا، مگر وہ
تو نجانے کب سے اس کے اندر اس کی ذات
کے کسی گوشے میں چھپی بیٹھی تھی۔

ہم بھی کیا لوگ تھے خوشبو کی روایت سے الگ
خود پر ظاہر نہ ہوئے تجھ کو چھپانے کے لئے

مگر اب وہ ہار گیا تھا اپنی ذات سے اس کی
محبت میں جو اس سے انجان تھی لیکن یہ شکست
اسے عجیب سی کسک عجب سے میٹھے میٹھے درد سے
آشنا کر رہی تھی، اس نے تھکے تھکے انداز میں اک
بوجھل سانس پھولوں کی ملی جلی مہک سے لدے
ہوا کے جھونکے کے سپرد کی اور تنے کی پشت سے
سر ٹکا دیا۔

اچھا تھا جو وہ اس کی موجودگی سے بے خبر تھی
وہ اس کا سامنا کر کے اس پر کچھ بھی ظاہر کر کے
اس کی انا اور نسوانی وقار کو ہر گز ٹھیس نہیں پہنچانا
چاہتا تھا۔

کبھی یہ پھول جیسی ہے
کبھی یہ دھول جیسی ہے
کبھی یہ چاند جیسی ہے
کبھی یہ دھوپ جیسی ہے
کبھی مسرور کرتی ہے
کبھی مجبور کرتی ہے
کبھی یہ روگ دیتی ہے
کبھی یہ رول دیتی ہے
کسی کا چین بنتی ہے
کسی کو روند دیتی ہے
کبھی یہ یار جانی ہے
کبھی یہ مار جانی ہے
محبت جیت ہوتی ہے

مگر یہ ہار جاتی ہے!!!

"کتنی بڑی غلطی کرتے ہیں ہمارے بڑے جب وہ بچوں کو نا سمجھ اور چھوٹا سمجھ کر ان کے سامنے بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں، یہ جانے بنا کہ ان کی محض اک سوچ اک خیال اک بات بچے کے سادہ سے ذہن میں بیٹھ کر اس کی تمام زندگی پر محیط ہو جاتی ہے وہ سمجھ نہیں پاتے کہ اک معصوم ذہن ان کی بدولت زندگی بھر اذیت سے دو چار رہتا ہے اور یہ محبت کا روگ کسی اذیت سے کم ہے کیا۔"

"نانو! کاش مدت پہلے کلر کلہار کے کوہساروں کے درمیاں بہتی خوبصورت جھیل سے کچھ پرے سبزہ زار پر آپ نے مامی سے زوہیب کی دلہن عریشہ کو بنانے کی خواہش کا اظہار میرے سامنے نہ کیا ہوتا۔"

"یا پھر اے کاش میں شرما کر وہاں سے فرار ہونے کے بجائے مامی کی زبانی اسی لمحہ آپ کی اس سوچ کی تردید ہوتے ملاحظہ کر لیتی، لیکن شعور کی دہلیز پر قدم رکھ کر مامی کا گریز اور اس کی وجہ بھانپتے ہوئے بہت دیر ہو گئی، بظاہر میں بے نیازی کے خول میں لپٹی ان سے اور زوہیب سے اک فاصلے پر رہی کہ میں زبردستی اپنا آپ ان پر ان کی زندگیوں پر مسلط نہیں کرنا چاہتی یہ رشتے زبردستی کے نہیں ہوتے ناں چندا ماما۔"

"لیکن میں خود کو زوہیب سے محبت کرنے سے نہیں روک سکتی میں بے بس ہوں، لاچار ہوں۔" وہ بری طرح سے بلکتی پشت پر درخت کا تنا تھا اور اس کی اوٹ میں بے بسی سے لب کچلتا ہاتھ مسلتا زوہیب، آسمان پر جھکے ستارے بغور انہیں ملاحظہ کر رہے تھے اور فضا میں عجب سا سوز اور بیقراری پھیلتی جا رہی تھی، سبک خرامی سے چلتی ہوا شوریدہ سری پر اتر آئی تھی اور درختوں کی شاخوں کو ہلاتی بین کرتی مسلسل زوہیب کے وجود سے ٹکرا کر عریشہ کی دراز چوٹی سے نیچے جھولتے بالوں پر کچی بور گراتی اس کے چہرے پر بکھری لٹوں کو اڑاتی نجانے کیا کہنے کی سعی میں یہاں وہاں کی کیاریوں میں کھلے پھولوں کے ساتھ سر پھوڑنے میں مگن تھی۔

زوہیب کو کلر کلہار کے مرغزاروں میں بلکتی چار سالہ کانچ سی گڑیا یاد آئی، جسے اس نے اپنی چاکلیٹ دے کر بہلایا اور جھولا جھلا کر اس کے آنسوؤں کو ہنسی میں بدل دیا تھا، اسے گڑیا کا بعد میں اس سے گھبرانا شرمانا یاد آیا آج اسے اس کے اک بہت پہلے کیے گئے سوال کا جواب ملا تھا جو وہ دھڑلے سے اس کی کلائی تھام کر کیا کرتا تھا، آسمان پر دکھائی دیتا ادھورا چاند اپنی زرد آنکھوں سے زوہیب کی آنکھوں میں چمکتے اور عارضوں پر بکھرتے ستارے دیکھ رہا تھا۔

زوہیب نے ذرا رخ موڑ کر نیچے گھاس پر سسکیاں بھرتی عریشہ کو ملاحظہ کیا اور بے بسی سے کتنے بے آواز آنسو بن بلائے اس کے خوبصورت چہرے کا حصہ بن کر بہنے لگے۔

آج وہ اس روتی ہوئی لڑکی کو چاکلیٹ تھما کر چپ نہیں کروا سکتا تھا وہ مجبور تھا اور اس کی بے بسی اس کی نگاہوں سے نمکین پانی کی صورت بہہ رہی تھی، وہ خاموشی سے بنا کسی آہٹ کے وہاں سے پلٹ کر آ گیا، پیچھے ہوا ماتم کرتی اس کے قدموں سے لپٹتی رہی، ہوا کی زد سے کتنے پھول بکھر گئے تھے۔

☆☆☆

میرے سینے میں صحرا ہے سلگتا
مگر آنکھوں میں ساون کی لڑی ہے
چلے آتے تمہارے پاس لیکن
جدائی راستہ روکے کھڑی ہے

وہ ایک شریف اور فرمانبردار بیٹا تھا اور شریف لوگ تو ہوتے ہی بزدل ہیں، چپ چاپ اپنی محبت کو اپنے ہاتھوں سے کھو دینا تو گوارا کر لیتے ہیں لیکن اس کی تشہیر کرنا اور اس کے لئے زمانے سے ٹکرانے کا حوصلہ ان میں نہیں ہوتا ایسی بدنام زمانہ محبتیں اس کے لئے کبھی متاثر کن نہیں رہی تھیں۔

وہ اپنی ماں جی کا دل نہیں دکھا سکتا تھا اور پھر وہ لڑکی جسے اپنا پندار اپنی محبت سے زیادہ عزیز تھا اس پر کوئی کسی کی اٹھتے دیکھنا اس کی محبت کی توہین تھی اور وہ خواہ کوئی تاویل تراش بھی لیتا تب بھی ماں جی کا ذہن پھپھو اور عریشہ کو شک کی نگاہ سے ہی دیکھتا اور کیا اس میں ماں جی سے اختلاف کرنے ان کی خواہش کے خلاف جانے انہیں رلانے کا حوصلہ تھا۔

نہیں یقیناً نہیں وہ تو اک فرمانبردار بیٹا تھا وہ ماں جی کا مان نہیں توڑ سکتا تھا۔

دو گلیوں کی تنہا مسافت ذہنی خلفشار اور کشمکش میں مبتلا کب تمام ہوئی اسے قطعاً خبر نہ تھی دور آسمان پر چمکتے ادھورے چاند نے چپکے سے اس کے ساتھ راستوں پر سفر کیا تھا۔

محبت جیت ہوتی ہے
مگر یہ ہار جاتی ہے
کبھی تقدیر والوں سے
مگر یہ ہار جاتی ہے

اپنے گھر کے لان میں ہنوز سابق انداز میں براجمان عریشہ کے کپکپاتے لب انہی چار مصرعوں کی مسلسل گردان کیے جا رہے تھے۔

اور اپنے کمرے میں باوضو ہو کر مصلے پر دو نفل نماز برائے حاجت کی ادائیگی کے بعد سجدے کے عالم میں گڑگڑا کر تقدیر والے سے اسے مانگ رہا تھا، بے تحاشا روتے ہوئے یقین واثق کے سنگ، پہلی بار اسے اپنے لئے طلب کر رہا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ عریشہ نے اسے پانے کی تمنا نہیں کی اس لئے دعا میں کبھی مانگا بھی نہیں ہوگا، لیکن وہ اپنے رب کے حضور دعا جیسی عبادت سے محروم نہیں رہنا چاہتا تھا، بھیگی رات، ادھورا چاند اور ستارے اس کے کمرے کی کھلی کھڑکیوں پر شب بھر براجمان رہے، ہوا گلیوں میں شور مچتی رہی سجدے میں روتا زوہیب بے خبر تھا کہ دور آسمانوں پر چمکتے ادھورے چاند نے کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے دودھ کا گلاس ہاتھ میں تھامے پتھر کے بت کی مانند ساکت کھڑی ماں جی کو بہت خاموشی سے بنا کسی آہٹ کے واپس پلٹتے دیکھا تھا۔

اگلی صبح ایک عجیب سا واقعہ رونما ہوا، ماں جی نے فجر کی نماز کی ادائیگی کے بعد تسبیح کے دانے پھیرتے ہوئے معمول کے انداز میں واک کی غرض سے پچھلے صحن میں جانے کی نیت سے ٹی وی لاؤنج کا کوریڈور کی جانب کھلنے والا جالی دار دروازہ کھولا تو ماں جی کی لاڈلی وہ گرے کلر کی سیاہ دھاری دار بلی جو اسکن کلر کی ٹائلز سے مزین کوریڈور کی دیوار کے ساتھ بنی طویل کیاری کے قریب سر جھکائے براجمان تھی یکلخت ہی ماں جی کے دائیں جانب سے گزر کر بھاگتی ہوئی ٹی وی لاؤنج کے اندر داخل ہو گئی اور بیقراری سے ٹی وی لاؤنج کے ایک کونے میں بنے سٹور روم کے بند دروازے سے سر ٹکرانے لگی، وہ بے بسی سے ماں جی کی طرف دیکھ کر میاؤں میاؤں کرتی اور پھر سے دروازے کو ٹکریں مار کر انہیں دیکھتی۔

ماں جی حق دق رہ گئیں کوریڈور کی منڈیر کے اس پار آسمان پر صبح کی سپیدی رات کے اندھیرے کو اپنے اندر جذب کر رہی تھی، اوائل

بارچ کی خوشگوار باد صبا کے جھونکوں میں ہلکی سی خنکی اور سر سبز بیلوں پر جا بجا کھلے سفید، پیازی، نیلے، گلابی، کاسنی پھولوں کی ملی جلی مہک تھی، پرندے اپنے آشیانوں سے نکل کر صبح کے گیت گاتے چمکتے آسمان پر محو پرواز تھے اور یہ بلی نجانے کیوں سٹور روم کے اندر جانے کی ضد پر مصر تھی، اسی لمحہ زوہیب اور بابا جی معمول کے انداز میں سلام کرتے اندر داخل ہوئے اور عجلت میں باہر کی جانب لپکے جہاں قریبی مسجد سے آتی موذن کی آواز اور نماز باجماعت کے لئے بلاوا فضا میں بہت مقدس سا شور گونج رہا تھا۔

''بیگم کیا پتا اندر اس نے بچے نہ دے دیئے ہوں، ساری رات کوریڈور میں بھی بولتی رہی ہے، آپ اسے سٹور روم کا دروازہ کھول دیں، کہیں انجانے میں کوئی گناہ نہ سرزد ہو جائے۔''

بابا جی نے بلی کو سٹور روم کے دروازے سے سر ٹکراتے دیکھا تو جاتے سمے تاکید کرنا نہ بھولے۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے، اگر اس کے بچے اندر ہوتے تو یہ دل دہلا دینے والے بین کرتی اور غصہ میں میرا دامن نوچ لیتی، جبکہ اس کے انداز میں محض التجا ہے، چند دن سے سٹور روم میں بہت آنا جانا ہے بس جانور ایک جگہ دیکھ لیں تو آسانی سے کہاں چھوڑتے ہیں۔''

ماں جی بلی کو وہاں سے پیار سے باہر کی اور نکالنے کی سعی میں مگن لاپروائی سے گویا ہوئیں۔

''ماں جی ہو سکتا ہے یہ آپ کی محبت میں آپ کا لحاظ کر رہی ہو اور بابا جی کا خدشہ درست ہو۔'' بابا جی کی معیت میں نکلتے زوہیب نے سنجیدگی سے یہ جملہ ادا کیا تھا۔

''ہونہہ ایسا نہیں ہوتا۔'' اس کی بات کو رد کر کے ماں جی نے باہر جاتے زوہیب پر اک گہری نگاہ کی رات کی کسی کیفیت کا اس کے چہرے پر کوئی عکس نہ تھا، ان کا دل ایکدم سے مطمئن سا ہو گیا اور بلی کو زبردستی باہر کوریڈور میں نکال کر اس کے پیالے کو دودھ سے بھرا اور پچھلے صحن کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

☆☆☆

''ہائے تحریم! اللہ مجھے معاف کر دے میں نے تو دو نفل توبہ کے پڑھ کے رو رو کے معافی مانگی ہے اللہ سے، یہ سب انجانے میں ہوا وہ تو صبح جب سٹور روم سے بچوں کے بولنے کی آوازیں آئیں تب مت پوچھو کتنی ندامت ہوئی مجھے شاید بھوک سے بلبلا کر ماں کو پکار رہے تھے اور ماں بچاری کئی گھنٹوں تک کوریڈور میں چپ چاپ دودھ کے بھرے پیالے کو خاموش نظروں سے دیکھتی رہی ایک بار بھی مجال ہے مجھے غرا کر دیکھا ہو، وہ تو میں نے فوراً لاونج کا جالی کا دروازہ کھولا تب بھی اندر نہیں آئی مجھ سے خفا ہو گئی تھی شاید مگر جب میں نے سٹور روم کا دروازہ کھول کر اسے آواز دی تو فوراً اندر بھاگ گئی۔'' دوپہر کو ماں جی تحریم کو موبائل پر ساری تفصیل فراہم کر رہی تھیں۔

''ہاں تحریم میں حیران ہوں جانور ہو کر اس نے اتنے صبر رواداری کا مظاہرہ کیا محض میری محبت و لحاظ میں اور پتا ہے بچے کہیں اور لے گئی ہے لیکن دوپہر کو اپنے مخصوص وقت پر آئی ہے اور مجھے پیار سے دیکھتی ابھی گئی ہے۔''

زوہیب کھانا کھاتے ہوئے خاموشی سے ماں جی کی گفتگو سنتا رہا، واقعی بہت عجیب بات تھی بلی ماں جی سے واقعی بہت شدید محبت کرتی تھی۔

''ہاں ٹھیک کہا تم نے، ہم آج کے دور کے انسان اشرف المخلوقات ہو کر ان صفات سے محروم ہیں جن کا مظاہرہ اس جانور نے کیا، اسلام

بھی تو رواداری اخلاص اور صبر کا درس دیتا ہے، مگر ہم جانوروں سے بھی بدتر ہیں دل میں کینہ رکھ کر ملتے ہیں، کسی کو معاف نہیں کرتے کبھی۔''
زوہیب نے ماں جی کی آنکھوں کو بھیگتے دیکھا تھا، ان کی آواز کپکپا گئی تھی، اس بظاہر معمولی سے واقعہ کا اس کی حساس طبع ماں جی نے بہت گہرا اثر لیا تھا اور حساس تو وہ خود بھی بہت تھا خصوصاً ان کے لئے ''ماں جی آپ بہت اچھی اور عظیم خاتون ہیں، جن انسانوں کی آپ بات کر رہی ہیں آپ کا شمار ان میں نہیں ہوتا آپ کیوں اتنا سوچے جا رہی ہیں خواہ مخواہ چھوڑیں آپ کا بی پی لو ہو جائے گا ایسے۔''
انہیں دلاسہ دیتا عقیدت سے ان کے ہاتھ چومتا زوہیب تحریم کی کال پہلے ہی اسے ڈپٹ کر بند کر چکا تھا۔
''ماں جی پہلے پریشان اوپر سے تم ایموشنل ڈرامہ آگے سے آگے جذباتی تبصرے ماں جی سیر تو تم سوا سیر، اب بڑی ہو جاؤ۔''
ماں جی جانے کیوں اس کی باتوں پر کچھ اور نادم ہو گئی اور فخر و انبساط سے اس کا بے اختیار ماتھا چوم لیا۔

☆☆☆

کلینک سے واپسی پر رات کو راستوں پر پھیلی چاندنی میں اس دشمن جاں کی یاد اس کے ساتھ سفر کرتی رہی گھر پہنچ کر یادوں کو سمیٹ کر احتیاط سے دل کے نہاں خانوں میں رکھ کر وہ اپنے روتے دل کی آواز کو نظر انداز کرتا ماں جی کے حضور پہنچا گھر کے ماحول پر اک نامحسوس سی خوشی اور رونق طاری تھی، ماں جی اور بابا جی خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔
''لو برخودار مٹھائی کھاؤ۔'' اسے دیکھتے ہی بابا جی نے اس کے منہ میں رس گلے ٹھونسا اور بے حد جوش سے اسے گلے لگا لیا۔
''خیریت کوئی خوشخبری ہے۔'' رس گلہ نگلتے ہوئے بمشکل اس نے یہ جملہ ادا کیا بہت عجیب سی آواز میں، ماں جی تمکنت سے مسکرا دیں۔
''ارے ڈبل خوشخبری ہے۔''
''میاں یہ لو ایک اور گلاب جامن بھی کھاؤ۔'' بابا جی نے اب کی بار گلاب جامن زبردستی اس کے منہ میں دھکیل دیا۔
''بچے کو سانس تو لے لینے دیں۔'' ماں جی نے مداخلت کی۔
ٹی وی لاؤنج کی کھلی گلاس ونڈوز کے اس پار سرسبز بیلوں پر کھلے رنگ برنگے پھولوں سے کچھ پرے منڈیر پر چاند جھکا ہوا تھا اور ہوا فضا کی معطر کر رہی تھی۔
''اپنی عریشہ کی آج شام میں بات پکی ہو گئی ہے، ندیم تو نہیں آیا ابھی لیکن لڑکے والے بہت بے صبرے ہیں اسے انگوٹھی پہنا کر ہاتھ پر شگن رکھ دیا ہے اور......'' زوہیب کا سارا تجسس ہوا ہو گیا گلاب جامن اس کے حلق میں پھنس گیا، کھلے شیشوں سے ستارے جھانک کر اسے دیکھ رہے تھے، دل کچھ اور شدت سے رونے لگا جسم سے جیسے جان نکلی جا رہی تھی، وہ بے اختیار صوفے پر ڈھے گیا۔
''دوسری خوشخبری کا تو بتائیں وہ زیادہ اہم ہے میں بتاتی ہوں۔''
''نہیں میں بتاؤں گا۔'' اس کی کیفیت سے بے نیاز وہ دونوں آپس میں بے صبری سے بچوں جیسے اشتیاق سے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی سعی میں لگے تھے۔
''تمہاری ماں جی کو بالآخر تمہارے لئے لڑکی پسند آ گئی ہے ہاجرہ باجی کے ہاں ہی مل گئی تھی سچ پوچھو تو مجھے تو بہت ہی پسند آئی تمہاری ماں

جی نے کمال کی بہو منتخب کی ہے۔"

"اور میں نے ڈائریکٹ نکاح کی تاریخ مقرر کر دی ہے مجھے تم پر مان ہے کہ تم میری کسی بات سے انکار نہیں کرو گے بس اسی لئے سب کچھ بنا تم سے پوچھے اچانک سے طے کر دیا مجھے گھر میں بہو لانے کی جلدی ہے اتنی مشکل سے تو ملی ہے۔" ماں جی مسکرا کر بے حد مان سے اسے تفصیل فراہم کر رہی تھیں۔

"اس جمعہ کو نکاح کر کے لے آئیں گے ہاں ولیمہ دھوم دھام سے ہوگا۔" زوہیب کے کان سنسنا رہے تھے اس نے وحشت زدہ ہو کر چاند کو دیکھا تو وہ بے نیازی سے قریب سے گزرتے ابر کی اوٹ میں دبک گیا، دل نے بے اختیار ہوک بھری یہ سب تو ہونا ہی تھا بزدل۔

"بیگم زوہیب سے پوچھنا تو چاہیے تھا کم از کم ایک بار، اسے کوئی اعتراض نہ ہو۔"

"مجھے اپنے بیٹے کی پسند کا علم ہے اس کے حساب سے ہی چنی ہے لڑکی، ادھر آؤ میں تمہیں تصویر دکھاؤں میری پسند سے اختلاف نہیں کر سکتا میرا بیٹا۔" ماں جی صوفے پر کشن ہٹا کر اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر تصویر ڈھونڈنے لگیں، بابا جی کو زوروں سے ہنسی آ گئی، ماں جی نے بمشکل مسکراہٹ ضبط کی، دھیمے سروں میں چلتی ہوا بھی پر اسراریت سے مسکرا کر پھول گرانے لگی۔

"آپ کو پسند ہے تو ٹھیک ہے تصویر سے کیا فرق پڑتا ہے (وہ نہیں تو کوئی بھی ہو کیا فرق پڑتا ہے)۔" بمشکل تمام یہ لفظ ٹوٹ کر اس کے لبوں سے ادا ہوئے جیسے پھول ٹوٹ کر کوریڈور میں بکھر رہے تھے اور وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا آیا۔

جبکہ اس کی اس درجہ فرمانبرداری پر ماں جی صدقے واری ہو گئیں تھیں۔

☆☆☆

میری دیوانگی پر اس قدر حیران ہوتے ہو
میرا نقصان تو دیکھو محبت گمشدہ میری

اسے رہ رہ کر عریشہ کے دکھ کا خیال مارے ڈال رہا تھا، اس نازک سی لڑکی نے یہ اذیت نجانے کیسے برداشت کی ہوگی، زوہیب کے دل کو جیسے کوئی آرے سے چیر رہا تھا، دو نفل پڑھ کر اس نے عریشہ کے لئے سکون قلب مانگا تھا اور اس کی دائمی خوشیاں، اور خود اس کا دل بے سکون ہو رہا تھا، کھڑکی پر ٹکا چاند دلکشی سے چمک رہا تھا اور ستارے حیران سے اسے دیکھ رہے تھے، چاند کی چاندنی میں زوہیب کی آنکھوں سے ٹوٹتے ستارے کتنے اجلے اور خالص تھے۔

"عریشہ مجھے معاف کر دینا، میں دکھ کے سوا تمہیں کچھ نہ دے سکا۔" وہ بری طرح بکھر رہا تھا، حالانکہ اس نے اس سے نہ کبھی عہد و پیمان باندھے تھے ان کے درمیاں کوئی سلسلہ رہا، مگر یہ ظالم محبت کیسے چپکے سے ستم ڈھاتی ہے اسے بے قصور ہوتے ہوئے بھی اپنا آپ مجرم لگ رہا تھا۔

"میرے یار کی شادی ہے؟ میرا یار بنے گا دولہا؟" اختر سوالیہ انداز میں بے یقینی سے گنگناتا ہوا اس کے سر پر آ موجود ہوا، وہ پھیکی ہنسی ہنس دیا۔

"کہاں تو آنٹی کو کوئی لڑکی پسند نہیں آتی تھی کہاں اچانک سے حادثاتی طور پر لڑکی مل گئی پسند کی اور تین دن کے اندر شادی، مجھے کچھ مشکوک نہیں لگ رہا یہ سب معاملہ، کون ہے وہ ہشیار لڑکی جس نے آنٹی کا بہت ضدی دل جیتا ہے؟" اختر خوشی میں سوال پر سوال اور اٹ پٹانگ ہانکنے میں لگا تھا۔

"دیکھ ویسے یار ہے تو موسم بہار اور چنار کے پتے ہرے بھرے ہو گئے ہیں تو مجھے لگتا ہے

کسی پنچھی نے چنار کی شاخوں پر اپنا گھر بنالیا ہے
ناممکن بات ممکن ہوگئی تیری شادی ہے پگلے۔“

اس نے شرارت سے اسے چپت لگائی مگر زوہیب ہنوز کلینک کے گلاس ڈور کے اس پار تارکول کی سیاہ سڑک کے اطراف میں لگے درختوں اور پھولوں پر پڑتی دھوپ اوران کے سائے ملاحظہ کرتا رہا۔

”چپ چاپ بیٹھے ہوضرور کوئی بات ہے، گھر میں شادی کے ہنگامے زوروں پر اور تم یہاں بولو کیا راز ہے جی بولو کیا راز ہے؟“ اختر شوخی سے گنگناتے ہوئے استفسار کرنے لگا۔

”یار بس سب کچھ اس قدر اچانک ہوا ہے کہ کچھ سمجھ نہیں آرہا۔“

”اچھا اس لیے تو نے پردہ کرنا شروع کردیا ہے تصویر بھی نہیں دیکھی لڑکی کی ویسے اچھا ہوا نہیں دیکھی سنا ہے انکل سے موٹی ہے کالی بھجنگ ہے اور بد دماغ ہماری بھابھی لگتا ہے چپکے سے دیکھی ہے تو نے اور تبھی ڈر گیا ہے بتا نہیں رہا۔“

”اب جیسی بھی ہے ٹھیک ہے جو ماں جی کی پسند وہ میری۔“ اس کی اٹ پٹانگ باتوں اور چھیڑ خانی پر اس نے جبراً مسکرا کر بات سمیٹی، آج کل کچھ اچھا نہیں لگتا تھا، گھر میں تحریم اور سلطانہ پھپھو وغیرہ کے ڈیرے تھے ماں جی اور تحریم بری کی تیاریوں میں غرق تھیں، مانو بابا جی اپنی کپڑے کی پوری دکان ہی جیسے گھر اٹھا لائے تھے۔

اوپر سے تحریم، اسد بھائی، سعد اور علیزہ وغیرہ نے چھیڑ خانیاں کرکے ناک میں دم کر رکھا تھا، عریشہ کی شادی بھی جلد ہی ہو رہی تھی سلطانہ پھپھو اور علیزہ وغیرہ ادھر ہی مصروف تھے۔

ندیم بھائی نے الگ فون کرکے واویلا مچایا تھا کہ تم دونوں کی شادی کی اتنی کیا جلدی ہے۔ عریشہ کا دولہا کہیں بھاگا جارہا تھا یا تمہاری دلہن؟ ایسی باتیں اس کا درد اور بڑھا دیتی تھیں، نارسائی کا کرب دل کو کچوکے لگاتا تھا اور عریشہ کے سکون قلب کی دعا ہمہ وقت لب پر مچلتی تھی، ندیم بھائی جمعرات کو پہنچ رہے تھے۔

ماں جی مہندی جیسی فضولیات کے حق میں نہیں تھیں انہوں نے نکاح سے ایک دن قبل مہندی کے بجائے محفل میلاد منعقد کروائی تھی اور یہ آئیڈیا سب کو ہی پسند آیا تھا، یہ اور بات کہ ہاجرہ پھپھو کے ہاں عریشہ کی شادی کے سلسلے میں ڈھولک رکھی جا چکی تھی اور رات گئے تک تحریم سعد اسد بھائی اور علیزہ وغیرہ خوب محفل جماتے تھے اور تو اور بڑے بھی شریک محفل ہو جاتے، اک آدھ بار اسے بھی شامل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ معذرت کرکے نیند کا بہانہ بنالیتا، تو سب مسکرا دیتے۔

☆☆☆

نکاح کے روز جب مولوی صاحب نے اس سے نکاح میں ایجاب وقبول کے مراحل طے کروانے کے لئے لڑکی کا نام بمعہ والد کے نام کے ساتھ لیا تو وہ جو روبوٹ کی مانند خالی الذہنی کی کیفیت میں بیٹھا تھا ایکدم چونک گیا اور جب انہوں نے دہرایا تو سب کچھ سمجھ کر بھی وہ کچھ سمجھ نہیں پارہا تھا، بدحواسی میں نکاح کے مراحل طے کروا کے پہلی فرصت میں اسٹیج پر قریب ہی کھڑی ماں جی کے مقابل جا کھڑا ہوا۔

”ماں جی وہ میری شادی ع...... ع...... عریشہ ہاجرہ پھپھو کی عریشہ۔“ خوشی و بدحواسی کی کیفیت میں اٹکتے ہوئے بیٹے کے استفسار پر ماں جی شفقت سے مسکرائیں اور اثبات میں سر ہلا دیا وہ فرط مسرت سے ماں جی سے لپٹ گیا۔

ماں جی نے اس رات زوہیب کو عریشہ کے

لیے بلکتے دیکھا تھا لیکن انہیں بیٹے کا دکھ گوارا تھا مگر پرانی کدورتیں بھلا کر نئے رشتے جوڑ کر ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

وہ تو جب اس بلی کو انجانے میں ماں جی نے دکھ پہنچا دیا تھا اس واقعے نے ماں جی کی کایا پلٹ دی اور فیصلہ بس لمحوں میں ہو گیا تھا اور زوہیب کے دل کی خوشی کو اپنا کر ان کا دل خود مسرتوں سے معمور ہو گیا تھا۔

''جی تو کیسا لگا ہمارا سرپرائز۔'' تحریم، سعد، اسد بھائی علیزہ اور تو اور اختر اور ندیم بھائی سب کے سب کورس میں استفسار کر رہے تھے، تو یہ سب کا مشترکہ پلان تھا، لیکن اگر وہ اپنی ذات کے دکھ سے نکل کر ذرا غور کرتا تو یہ سب سمجھنا کوئی مشکل بات نہ تھی، اس نے تو کسی سے کچھ شیئر بھی نہیں کیا تھا پھر بھی سب جانتے تھے، وہ کھل کر مسکرا دیا۔

''دیکھو اب کیسے دانت نکلے ہیں موصوف کے اتنے دن سے منہ لٹکائے پھر رہا تھا۔'' اسد بھائی گویا ہوئے۔

''سچی میں تو کہتی تھی بتا دو۔'' علیزہ منمنائی۔

''ترس بہت آتا تھا ویسے تم پر۔'' اختر چہکا۔

''بھائی مجھے تو بتا دیتے کہ آپ کے دل میں عریشہ آپی ہیں۔'' تحریم ٹھنکی وہ ٹھٹک گیا۔

''تمہیں کیسے پتا؟''

''کیونکہ ماں سب جانتی ہے۔'' ماں جی نے اس کا ماتھا چوم لیا، ہاجرہ پھپھو اور سلطانہ پھپھو ہنسنے لگیں اور میرون کامدار عروسی لہنگے طلائی زیورات پھولوں اور بیوٹیشن کے ہاتھوں سے سجی سنوری عریشہ بھی زیر لب مسکرا دی۔

جب مامی اور ماموں نے اس دن اچانک آ کر ماما پاپا کے آگے عریشہ کے لئے دست دراز کیا تھا۔

اور زوہیب کی پسند کے مطابق بھی آگاہ کیا تو عریشہ کو اپنی خوش نصیبی پر اور اپنی بصارت و سماعت پر یقین نہیں آیا تھا، وہ ساکت بی شادی مرگ کی کیفیت میں تمام کاروائی ہوتے دیکھتی رہی۔

اور ان چند دنوں میں چندا ماما اسے یقین دلاتے رہے لیکن وہ خواب اور حقیقت کے مابین فرق نہیں کر پا رہی تھی حقیقت خوبصورت و دلفریب خواب کی مانند لگ رہی تھی، خواب جو پورے ہو گئے تھے محبت کا پنچھی اپنی خوش گلو آواز میں دلکش نغمے بکھیر رہا تھا چودھویں رات کا مکمل چاند آسمان پر ستاروں کی کہکشاں کے مابین رقص کناں تھا۔

☆☆☆

کمرے کی آرائش حقیقی پھولوں سے کی گئی تھی فضا میں گلاب اور موتیا کی دلفریب مہک پھیلی ہوئی تھی وہ پوری تاریخوں کے خوب روشن چندا ماما سے دل کی باتیں کر رہی تھی چندا ماما کھڑکی پر آ ٹکے تھے، جب زوہیب نے حجلہ عروسی میں قدم رکھا، عریشہ کا دل اس کی آہٹ سے زور و شور سے دھڑکنے لگا، شرم سے چھوئی موئی ہوتی وہ اپنے آپ میں سمٹ گئی۔

''تم مجھ سے اتنا شرماتی کیوں ہو؟'' اس کی نازک سی مہندی و چوڑی سے سجی کلائی میں رونمائی کا تحفہ کنگن کی صورت پہنا کر جذبات سے چور محبت سے بھرپور بے حد شوخ انداز میں اس کی کلائی تھام کر زوہیب نے اچانک سے بہت بچپن میں کیا گیا سوال دہرایا۔

شرم و گھبراہٹ و بوکھلاہٹ میں عریشہ بے اختیار اپنی کلائی چھڑانے لگی۔

''ہاہاہا گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے مجھے اس سوال کا جواب چند روز قبل مل گیا تھا۔'' لمحہ

کے توقف سے وہ گویا ہوا۔

''مبارک ہو عریشہ آج ''ہماری'' محبت کی تکمیل ہو گئی اور یہ سب اس پروردگار کے کرم کی بدولت ہے۔''

عریشہ ناسمجھی سے اس کی باتیں سن رہی تھی لفظ ''ہماری'' پر گھبراہٹ و شرم سے اس کا دم اٹکنے لگا۔

''ہاں میں تمہاری خاموش محبت اور اس کے گواہ چندا ماما سے واقف ہوں۔'' زوہیب کی شوخیاں عروج پر تھیں۔

''(اف یہ تو سب جانتے ہیں مگر کیسے؟)

عریشہ نے بے ساختہ مسکارے، لائنز اور آئی شیڈ سے سجی بڑی بڑی قیامت خیز آنکھیں ذرا کی ذرا اٹھائیں اور حیاء کے بوجھ سے پھر سے جھکا لیں، وہ وارفتگی سے یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔

''سب کچھ بتاؤں گا حکایت دل پوری سناؤں گا مگر پہلے اپنا یہ پیارا سا روپ تو دل بھر کے دیکھنے دو۔'' وہ جیسے اس کی ہر سوچ سے واقف تھا، عریشہ کے دل کی دھڑکن مزید بڑھ گئی اس نے سر کو مزید جھکا لیا، زوہیب کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

''چندا ماما! آپ ہمارے کمرے کی کھڑکی میں کیا کر رہے ہیں آپ سے آپ کی لاڈلی نے بہت باتیں کر لیں اب ذرا ہمیں دل کی باتیں کرنے دیں۔'' زوہیب نے شوخی سے کھڑکی سے جھانکتے چاند کو مخاطب کر کے کہا، انہیں مخاطب کیا تو وہ مسکرا کر آگے بڑھ گئے اور فوراً بدلی کی اوٹ میں چھپ گئے، عریشہ اور زوہیب کی چاند جیسی اجلی شفاف، نرم و پاکیزہ محبت کی چاندنی زمین پر دور تک پھیلتی جا رہی تھی اور پنچھی چہچہاتے ہوئے چاند سی محبت کے ترانے گا رہا تھا، آسمان پر چمکتے ستاروں نے ان کی دائمی خوشی کی دعا کی تو چلتی ہوا نے بے ساختہ آمین کہا تھا۔

☆☆☆

دل سمندر
طیبہ ہاشمی

"صبح کاذب"، کسی بھی گاؤں میں یہ وقت دھیرے دھیرے لوگوں کے اٹھنے کا ہوتا ہے، منہ اندھیرے اٹھنا یہاں لوگوں کی پرانی عادت ہے، شام کو جلد سونا اور صبح سویرے اٹھ جانا صدیوں سے ایسی ہی زندگی جیتے آرہے ہیں لوگ۔

رات جو اندھیرے کی راجدھانی ہے جو دن کے تھکے ہاروں کو بڑے پیار سے بڑے مان سے پناہ دیتی ہے اسی رات کے اندھیرے میں دن کے اجالے نے چپکے سے پہلا پتھر پھینک کر مانو شرارت کی جرأت کی تھی، یہ پتھر روشنی کا نہیں، ویسے ہی لوگوں کو ہلانے جلانے کی پہلی کوشش ہے۔

پورے گاؤں پر ایک سکوت سا طاری تھا، گاؤں کی ساری گلیاں سنسان پڑی تھیں مگر اس پتھر سے اٹھنے والے ارتعاش کے نتیجے میں گھر کے بڑے بوڑھے اپنے اپنے گھروں میں بیدار ہو چکے ہیں۔

سب سے پہلا دروازہ جس گھر کا کھلا ہے وہ اس گاؤں کی واحد مسجد کا امام ہے جو اذان دینے کے لئے پہلے ہی مسجد کی طرف چل پڑا ہے یا کہ اذان سے پہلے مسجد کا دروازہ کھل جائے اور اذان سے پہلے بھی اپنے رب کی عبادت کر سکے اس کے بعد وہ گاؤں کو نماز کی طرف بلانے کی غرض سے پہلے سپیکر میں درودو سلام اور نعتیں پڑے گا۔

روز اندھیرے میں گلیوں کی ٹوٹی پھوٹی اینٹوں پر بڑے دھیان سے اپنی اسٹک پکڑ کر چلنے کی کوشش کرتا وہ راستہ تلاش کرتا ہے، گلیوں میں پھرنے والے آوارہ کتے بھی اب اس اسٹک کی ٹک ٹک کے عادی ہو چکے ہیں اس لئے اندھیرے کے باوجود ان پر بھونکتے نہیں، روز کی بات ہے اس لئے اپنی جانی پہچانی جگہوں پر چلتے

مکمل ناول

ہوئے وہ مسجد تک پہنچ جاتے ہیں۔

سپیکر سے اٹھنے والی درود و سلام کی آواز کے ساتھ ہی اب اور گھروں کے دروازے بھی کھلنا شروع ہو گئے ہیں، جس کو اللہ نے نماز پڑھنے کی توفیق دی، وہ نماز کی تیاری میں لگ جائے گا۔

دھیرے دھیرے گھروں کی کچی چار دیواری میں سے حقہ گڑگڑانے کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئی ہیں، گاؤں کے لوگ خالی پیٹ حقہ پینا صحت کے لئے اچھا سمجھتے ہیں۔

ہر انسان صبح کا آغاز اپنے طریقے سے کرتا ہے اور جس طرح وہ اس کی ابتداء کرتا ہے اس کا سارا دن ویسے ہی گزرتا ہے، ہیں تو یہ دقیانوسی باتیں مگر بعض لوگ ان پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔

کچھ لوگ اگر نماز سے اپنے دن کی شروعات نہ کریں تو انہیں لگتا ہے کہ آج ان کا خدا سارا دن ان سے ناراض رہا ہے اور ہوتا بھی ایسا ہی ہے، خدا کا پسندیدہ عمل چھوڑ دو تو وہ ناراض نہیں ہو گا تو کیا ہو گا، مگر اسی گاؤں کے رہنے والے، میاں قادر بخش، ان کی کوئی بھی صبح گائے بغیر نہیں ہوتی، وہ اپنے دن کا آغاز ہمیشہ ''اہیر بھیروں'' کے میٹھے سروں سے کرتے ہیں۔

بھیروں جو سفید لباس پہنے، سانپوں کا زیور اور آدمیوں کے سر کی مالا پہنے چندر ماں کی کلا کا تلک ماتھے پر لگائے ہے چوبیس گھنٹے میں گائے جانے والے تمام راگوں میں اس کا نمبر پہلا ہے اور اسے اکثر صبح منہ اندھیرے خدا کی تعریف میں گایا جاتا ہے، یہ اپنے میٹھے سروں سے اپنے سننے والوں کو مدہوش کر دیتا ہے، انہی سروں کو میاں قادر بخش اپنے طریقے سے اپنے سریلے گلے سے نکالتے خدا کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔

رام کلی، ٹوڑی، ہنڈول، للت، جوگیا، بسنتر کا ٹھنڈا پانی اپنے پروں پر سر کے نگینے سجائے آگے ہی آگے بڑھتا رہتا ہے قدرت کے ہاتھوں مجبور، ورنہ ان کی آواز کا جادو سن کر کون کم بخت ہے جو آگے کو بڑھنا چاہے گا۔

سورج کی سنہری کرنیں زمین کے سینے پر پڑنے سے پہلے پہلے للت اور ہنڈول کے سر فضاؤں میں خوشبو کی مانند بکھر بکھر جاتے ہیں یوں لگتا ہے جیسے اک سماں سا ہے جو بندھ گیا ہے جادو سا ہے جس نے ہر چیز کو جکڑ لیا ہے۔

بسنتر کے دوسری طرف دور تک پھیلا جنگل ہلکی ہلکی ہوا میں درختوں کے کھنکتے پتے جیسے سر کا ساتھ دیتے سنائی دیتے ہیں، درختوں کی شاخوں پر بیٹھے پرندے خاموش پروں میں چونچیں دیئے سر کی اس مست پھوار میں خود کو بھیگتا پاتے ہیں۔

جنگل بسنتر (چھوٹی ندی) کا کنارہ اور ان کی سریلی آواز اب کون ہے وہ بدذوق جو جادو کی اس نگری سے باہر نکلنا چاہے گا۔

☆☆☆

''چل پتر اٹھ ریاض کا وقت نکلا جا رہا ہے۔'' چاچے کی آواز سن کر بھی وہ کسمساتے ہوئے کروٹ بدل گئی، کتنا سوہنا خواب تھا جو ٹوٹ گیا تھا، کھلے کچے ویڑے میں (جہاں اک طرف جامن کے پیڑ پر بیٹھے پرندے چوں چوں کا شور کرنے لگے تھے) بان کی بغیر بستر کے پچھی منجی (چارپائی) پر لیٹی وہ جانے کیسا سفنہ دیکھ رہی تھی من ذرا بھی اٹھنے کو چاہ نہیں رہا تھا پر چاچے کا سوچتی وہ ہولے ہولے اپنی مندی مندی آنکھیں کھولنے کی کوشش کرنے لگی، صبح کے اولین اجالے کو رات کے جادو نے ابھی اپنے قابو سے باہر نہیں کیا تھا یہ وقت فجر سے پہلے کا ہے۔

''اٹھ جا پتر۔'' آج ان کا ارادہ گھر پر ہی

ریاض کرنے کا تھا، ورنہ آگے پیچھے وہ زیادہ تر گھر سے باہر بنستر کے کنارے ریاض کرتے تھے، لاجو (ان کی سوہنی شروموں والی دھی، نام تو اس کا نجو تھا مگر وہ اسے لاجوں والی دھی کہتے تھے، اس لئے نجو سے نام بھی اس کا لاجو ہی پڑ گیا) ستاروں کی مدھم ہوتی الوداعی روشنی میں مخمور آنکھیں لئے آگے پیچھے قدم اٹھاتی اندر کو بڑھ گئی، جھینگروں کے بولنے کی آوازیں ہولے ہولے مدھم پڑنے لگی تھیں، رات کا آخری پہر اپنے انجام کو پہنچ رہا تھا، خاموشیوں کے آنچل میں چھید ڈالتی نذیراں کے چاچے (لاجو کی سہیلی) کرم دین کے حقے کی گڑگڑاہٹ صاف سنائی پڑ رہی تھی، چاچی خالدہ کے گھر سے بھی بھینسوں کی آوازیں آ رہی تھیں اندر وہ پھر سے سونے آئی تھی مگر پھر چاچے کے غصے کا سوچتی واپس باہر آ گئی آگے چاچا اپنی ستار کو ہاتھ میں پکڑے اس پر گری گرد جھاڑ رہا تھا۔

''کتنی وار تجھے سمجھایا ہے، ستار کو ڈھک کے رکھا کر، ساری دھول مٹی اس پر گرتی رہتی ہے، ساز کو جتنا پیار اور سنبھال کر رکھو اس کی اتنی ہی عمر بڑھتی ہے، ساز پر گرد پڑ جائے تو اس کے سر ٹھیک نہیں رہتے۔'' چاچے کی باتیں سنتی وہ کھرے (غسل خانہ) میں چلی گئی اور پھر ہاتھ والے نلکے سے پانی نکال کر منہ ہاتھ دھوتی باہر نکل آئی اپنے منہ کو دوپٹے کے پلو سے صاف کرتی وہ ستار پکڑ کر ان کے قریب بیٹھ گئی۔

''ساز ور انسان میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا، ساز کو اگر گرد سے پاک رکھو تو دیر تک اس کے سر ٹھیک رہتے ہیں اور انسان کا دل بھی بری باتوں سے پاک رکھو تو دیر تک زندہ رہتا ہے۔''

چاچے کی ایسی باتیں وہ بڑے دھیان سے سنتی تھی حالانکہ چاچا اتنا پڑھا لکھا نہیں تھا پھر بھی وہ ایسی باتیں کرتا تھا کہ دیر تک ذہن ان میں الجھا رہتا۔

پا لطیف (چاچے کا شاگرد) بھی منہ اندھیرے ہی آ گیا تھا وہ چاچے کا بڑا اچھا شاگرد تھا۔

پریتم درس دکھاۃ
تجھ بن رو رو رین بسائی
بھور بھئی گھر آؤ آؤ

چاچے کے گلے سے رحیر بھیروں کے سر کیا نکلے ایسے لگا جیسے ساری دنیا مسرت کے رنگوں میں لپٹ گئی، سر کیا تھا مانو موتیے کے سفید سفید پھول تھے جو چاروں طرف سے ان پر برسنے لگے تھے، پا لطیف طلبہ بجاتے ہوئے مبہوت سا اپنے استاد کی طرف دیکھ رہا تھا۔

رات کا اندھیرا آنے والے دن کے اجالے سے خوف کھاتا اور ان سروں کے ریشمی تاروں میں الجھا اپنے آپ میں سمٹتے جا رہا تھا، لاجو بھی اپنے چاچے کی طرف بڑی محبت سے دیکھ رہی تھی جو کتنی خوبیوں کا مالک تھا۔

فجر کی نماز ہونے والی تھی اور کچھ مولوی صاحب بھی سپیکر میں نعتیں پڑھ رہے تھے اس لئے چاچے نے بہت جلد ریاض ختم کر دیا تھا آخر کو وہ بھی ایک مسلمان تھا۔

پنڈ سے باہر بنستر کے کنارے ریاض کرنے کا ایک یہ بھی مقصد تھا کہ لوگ ان کی وجہ سے پریشان نہ ہوں۔

☆☆☆

''دھوپ، کنداں کو ٹھے پھلانگتی اندر بھاگی چلی آ رہی ہے مگر اس لڑکی کی آنکھ ہے کہ جندرے (تالہ) لگی قسمت کی طرح کھل ہی نہیں رہی، پتہ نہیں کون سا نشہ پی کر سوتی ہے۔'' کوٹھری اور برآمدے میں جھاڑو لگا چکنے کے بعد وہ ویڑہ صاف کرنے نکلی تو اسے دیوار کے سائے میں

چارپائی پر لیٹی دیکھ کر وہ تپ گئیں اور اونچا اونچا بولنے لگیں مگر وہ تو پتہ نہیں کانوں میں روئی دے کر سو رہی تھی مجال ہے جو کروٹ بدلی ہو، گرمیوں کی تیز دھوپ نے آدھے سے زیادہ ویڑے کو اپنی تپش سے جلانا شروع کر دیا تھا۔

''بچھی، اٹھ جا اب، دیکھ کتنی سویر چڑھ آئی ہے۔''

بچھی اس پنڈ کے مسجد کے امام کی اکلوتی بیٹی، سوہنی اور ہیلی مٹیار، سال پہلے اس کا بیاہ ہوا تھا منیر سے جو دوسرے پنڈ کا تھا بیاہ سے دو مہینے بعد بے چارہ شہر کسی کام سے گیا اور گاڑی کے نیچے آ کر مر گیا اور یہ کرم جلی پھر ماں باپ کی چوکھٹ پر آن بیٹھی، ماں باپ کی وہ اکلوتی اولاد تھی، زمین تھی کوئی نہ، باپ بھی بس مسجد میں نماز پڑھاتا تھا، ماں کو بڑی عزت کے ساتھ نمبردار نے اپنے گھر میں صرف ہانڈی روٹی پکانے کے لئے رکھا ہوا تھا، ماں اب اکثر بیمار رہتی تھی اس لئے اس نے بچھی کو نمبردار کے ہاں کام پر رکھوا دیا تھا اب وہ نمبردار کی ہانڈی روٹی کرتی تھی۔

ماں کی آواز سنتی وہ اپنے جسم میں ٹوٹتی انگڑائیوں کو سنبھالتی کروٹ بدل گئی۔

''اٹھتی ہوں بے بے۔'' نشہ سا تھا جو بدن کو توڑ مروڑ رہا تھا۔

مرد کی قربت کا نشہ ایک دفعہ منہ کو لگ جائے تو چھوٹے نہیں چھوٹتا، بچھی بھی ایک مرد کے ساتھ پورے دو مہینے گزار چکی تھی اس نشے کو چکھ چکی تھی اور بارہا اس کی ضرورت کو محسوس بھی کرتی تھی، منیر کے مرنے کے بعد وہ اکیلی ہو چکی تھی کچھ لوگوں کو اپنے اندر اٹھے طوفان کو دبانا آتا ہے وہ اس منہ زور گھوڑے کو لگام چڑھا لیتے ہیں مگر بعض لوگ اپنے اندر اٹھے آگ کے اس طوفان کو اپنے دونوں ہاتھوں سے ہوا دیتے ہیں، نمبردار افضل الہی عمر کے جس حصے میں داخل ہو چکا تھا وہاں ایک خاص قسم کا اکیلا پن تنہائیوں کا کشکول ہاتھ میں لئے کھڑا ہوتا ہے جس میں اگر کوئی اپنی قربت کے چند لمحے پھینک جائے تو زندگی کی میں گزری بہاریں پھر سے لوٹتی نظر آتی ہیں۔

نمبردار افضل الہی کے چاروں بیٹوں میں سے تین شادی شدہ تھے، بیوی بہوؤں کے چکر میں گھری ہوئی تھی ایسے میں بچھی اور افضل الہی اپنی اپنی تنہائیوں کو دور کرنے لگے۔

نمبردار کو اس کی عیاشی اور بچھی کو نشہ اور پیسوں کا لالچ پستیوں میں دھکیلنے لگی، آنکھوں پر اگر ان دو چیزوں کی پٹی باندھ جائے تو پھر زمین والوں پر سوائے آفتوں کے اور کچھ نہیں اترتا پھر لوط کی قوم کی طرح آندھیاں پتھر برساتی بھاگنے کا موقع بھی نہیں دیتیں۔

☆☆☆

جیٹھ کی پگھلا دینے والی گرمی نے ذرے ذرے کو تپا کر رکھا تھا، دور دور تک کھیتوں پر سورج کے سنہری ذرات اچھل کود کر رہے تھے، گرمی، اف اللہ۔

گرمی یا سردی یہ دو ایسی کیفیات ہیں جو انسان کو اندر سے تنگ کر دیتی ہیں اکتا دیتی ہیں اور وہ ان سے بچنے کے طریقے سوچتا رہتا ہے، لیکن واحد محبت کرنے والے لوگ ہیں جو ان دونوں کیفیات سے بے نیاز صرف اپنی محبت کے بارے میں سوچتے ہیں اور پھر اپنی محبت سے ملنے کے لئے کسی بھی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتے۔

لاجو جھلسا دینے والی گرمی میں پانی کا چھوٹا مٹکا ہاتھ میں اٹھائے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ گرم زمین پر تیز تیز قدم اٹھاتی ٹاہلی کے پیڑوں کے جھرمٹ کے نیچے آن رکی، گرم ہوا

کے تھپڑے منہ پر سہنے کے بعد وہ پسینے میں نہائی ہوئی نیچے زرد گھاس پر بیٹھ گئی۔
ٹاہلی کی چھاؤں میں چند منٹ بیٹھ کر اس نے سکون کا سانس لیا ٹھنڈک کا احساس جو ہوا تھا، پسینے سے بھیگے ہوئے بدن سے ٹکرا کر ہوا سکون دینے لگی تھی، چاروں طرف پھیلے گرم سناٹے میں کسی انسان کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا یہ جگہ گاؤں سے کافی باہر تھی شہر سے آنے والا راستہ اس سے تھوڑا ہٹ کر تھا افضل نے خط میں اسی جگہ پر آنے کے لئے کہا تھا نذیراں کے پتے پر وہ اسے خط لکھتا تھا پنڈ میں وہ اس سے کھلم کھلا مل نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ نمبردار فضل الٰہی کا بیٹا تھا اور وہ ایک غریب گانے والے کی لڑکی۔
اسے یہاں بیٹھے کافی وقت ہو چلا تھا گرمی میں اٹی اس دوپہر میں اسے اڈیکتے اڈیکتے گئی واری اس کی یادوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے کہیں ماضی میں نکل گئی تھی۔
بچپن سے دل میں سانپ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھی افضل کی محبت جوانی کی چوکھٹ تک ساتھ چلی آئی تھی۔
نجانے یہ محبت کب اور کیسے اس کے دل میں آن بسی تھی، بے جی کے گھر وہ بھی اس کی طرح سپارہ پڑھنے آیا کرتا تھا، اکھڑ، بات بات پہ غصہ کرنے والا، اس کے دل میں دھیرے دھیرے اترنے لگا جس کو چکھتے چکھتے وہ جوانی کے گلابی باغ میں پہلا قدم رکھ چکی تھی۔
درگاہ پر نیاز بانٹتے ہوئے، گاؤں میں چلتے پھرتے، وہ نظر آ جاتا تو سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگتی، قدم چلتے چلتے سست پڑ جاتے، دل چاہتا وہ یونہی سامنے رہے اور وہ پگلی بنی اسے دیکھتی رہے، وہ تھا ہی ایسا، اونچا لمبا، گھنی سیاہ مونچھوں والا، گورے رنگ پر بڑی بڑی سیاہ مخمور آنکھیں دیکھنے والے کو مست کرنے والی۔
محبت اگر سچی ہو تو اس کا جواب محبت میں مل ہی جاتا ہے، افضل کے دل میں بھی وہ جانے کب کی سما چکی تھی۔
گرم ہوا کے ایک زوردار جھونکے نے یادوں سے باہر لا پٹخا، وہ چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی، جانے وہ کیسے اتنا بڑا دل کر کے یہاں تک آ گئی تھی یا محبت ہی انسان کو بے خوف بنا دیتی ہے کہ اسے کسی شے کا خوف نہیں رہتا صرف محبوب کی اک جھلک چاہیے ہوتی ہے اس کے لئے چاہے اسے فرہاد کی طرح کوہکن ہی بننا پڑے سورج اس کے سر سے تھوڑا آگے کو سرک گیا تھا اس نے چندھائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھنے کی کوشش کی، کافی وقت ہو چلا تھا، افضل ابھی تک نہیں آیا۔
اس نے ٹاہلی کے ساتھ اپنی کمر ٹکا دی دل دکھی سا ہونے لگا، سورج کی تمازت نے آنکھیں چندھیا دی تھیں جو اپنے آپ بند ہو رہی تھیں اور آنکھیں بند ہوتے ہی ایک بار پھر افضل کی یادیں میدان میں کود پڑیں۔
تائی بشیراں کی بیٹی کی مہندی پر اس نے لاجو کو گھر کے پچھواڑے بلا کر اپنے دل کی بات کہہ دی اور وہ جو کب کا اسے اپنا مان چکی تھی اس کے اظہار پر اسے حیران سی دیکھتی رہی جیسے وہ جو بول رہا ہے اسے سمجھ نہیں آ رہا، وہ جو مہندی پر آئی تھی، افضل کی بات سن شادی والے گھر جانے کی بجائے واپس اپنے گھر آ گئی، اپنے دل کی خوشی کے آگے اسے کسی کی خوشی کا جیسے احساس ہی نہ رہا۔
تب سے لے کر اب تک افضل اس کی زندگی بنا ہوا تھا اور وہ اس کی، وہ شہر میں اپنی پڑھائی کر رہا تھا اب اس نے چودھویں جماعت

پاس کرلی تھی اس لئے وہ پنڈ واپس آرہا تھا۔
وہ جہاں کھڑی تھی وہاں سے تھوڑی دور آموں کا بہت بڑا باغ تھا افضل نے اسے ٹاہلیوں کے جھرمٹ میں اس لئے بلایا تھا اور آموں کے باغ میں اس لئے نہیں بلایا تھا کہ باغ کا مالی وہاں موجود ہوگا اور اس کی موجودگی میں وہ مل نہیں سکتے، باغ میں ٹھنڈے پانی کا ہاتھ والا نلکا تھا مگر وہ وہاں جا نہیں سکتی تھی اس لئے اپنے ساتھ پانی کا مٹکا لائی تھی افضل کو پیاس بہت لگتی تھی۔
دھوپ کے سنہرے رنگ والی مٹیار اپنی سنہری زلفیں کھیتوں کے سینوں پر ڈالے مست سی راج کر رہی تھی، اڈیک کا کالا ناگ جیسے اب ڈسنے لگا تھا، انتظار بھی کتنی بری بلا ہے، وہ بار بار بے چین سی اس راستے کو دیکھ رہی تھی جہاں سے اس نے آنا تھا۔
''کہاں رہ گئے ہو افضل۔'' اس نے دل ہی دل میں بڑے دکھی سے انداز میں اسے پکارا۔
دیر ہوگئی تو چاچا بھی گھر آجائے گا جو کسی کام سے دوسرے پنڈ گیا تھا وہ اپنا سر گھٹنوں پر رکھے سوچنے لگی تبھی اسے جیسے ٹھنڈی ہوا سی جسم کو چھوتی محسوس ہوئی، اس نے چونک کر سر اوپر اٹھایا اور سکون سا اندر اترتے آنکھیں بند کرلیں۔
بادل سے تھے جو چار سو پھیل گئے تھے، سیاہ بدلیاں آسمان کو سیاہ کرتی چلی آرہی تھیں اور پھر میگھ ملہار کے سر سارے میں پھیل گئے۔
کون تھا جو ان ساری چیزوں کی تصویر بنا اس تک چلا آرہا تھا، ابھی تو دھوپ تھی پھر یہ کیسے بادل تھے، اک خوشبو تھی جو اس کے آس پاس گول چکر کی طرح اس کو گھیر کر کھڑی ہوگئی تھی، سوندھی سوندھی سی، کچی مہک، اس نے بند آنکھیں کھول دیں۔

آنکھیں کیا کھلیں اسے لگا جیسے آسمان اس کے قدموں میں جھک آیا ہے چاند تارے ہیں جو ٹوٹ کر اس کے سامنے زمین پر بکھر گئے ہیں رنگ سے ہیں جو فضاؤں کو رنگین کر گئے ہیں، افضل بادلوں کا روپ لئے اک ٹھنڈک سی بن کر اس کے اوپر چھا گیا۔
''یوں جھلی بنی مجھے دیکھتی رہو گی یا بولو گی بھی۔'' افضل کی آواز اسے جیسے خوابوں کے دیس سے واپس اس ماحول میں لے آئی جہاں اس کا افضل حقیقت میں اس کے سامنے کھڑا تھا پورے سات مہینے کے بعد۔
''جھلی ہی تو کر دیا ہے تو نے مجھے، کوئی سمجھ دار تھوڑی ہی اتنی دھوپ میں پاگلوں کی طرح آ کر بیٹھے گا یہاں۔'' اس نے ہاتھ سے دور دور تک پھیلے سناٹے کی طرف اشارہ کیا۔
''تیرا یہ احسان میں ساری زندگی اپنے سینے میں چھپا کر رکھوں گا۔'' افضل مسکراتا ہوا اس کا ہاتھ پکڑے نیچے زمین پر بیٹھ گیا۔
''گرمی اخیر کی ہے۔'' وہ اپنی قمیض کے بازو اوپر کو چڑھاتے ہوئے بولا تو لاجو کو یاد آیا کہ وہ تو اس کے لئے مٹکے میں پانی لائی تھی، اس نے گلاس میں پانی بھر کر اس کے آگے کر دیا۔
''مجھے پتہ ہے تجھے بڑی ترے (پیاس) لگتی ہے۔'' گلاس پکڑاتے ہوئے وہ شرم سے نظریں نیچے کر گئی۔
محبت بھی درجہ بدرجہ آگے بڑھتی ہے پہلے وہ آنکھوں سے دل میں اترتی ہے اک دوسرے کے جذبات کا احترام سکھاتی ہے، یوں دھیرے دھیرے اس مقام تک آ جاتی ہے جہاں اک دوسرے کی پسند ناپسند کا اپنے آپ پتہ چل جاتا ہے، یہ محبت کی بڑی ہی خوبصورت منزل ہوتی ہے کوئی بولے بھی نہ اور دل سب جان لے، ایسا

سوائے محبت میں اور کہیں نہیں ہوتا اور محبت بھی وہ جو ہر غرض سے پاک ہو۔

"ترے لگی تو بہت تھی پر تم سے تجھے دیکھ کر بجھ گئی ہے دل کرتا ہے بس تیرا یہ سوہنا من موہنا چہرہ دیکھتا رہوں۔" افضل کی بات پر وہ لجا کر سر نیچے کر گئی۔

"مجھے ہی دیکھتے رہو گے تو شام ادھر ہی ہو جائے گی اور پھر میرے چاچے کو پتہ لگ گیا تو میرے تو وہ ٹوٹے ہی کر دے گا۔" نجو کی بات پر پہلے وہ ہنسا پھر اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔

"تجھے کوئی ہاتھ تو لگائے، دیکھ لوں گا۔"

"وہ میرا چاچا ہے۔"

"اور تو میری جند جان ہے، چاہے کوئی بھی ہو، تمہاری طرف اٹھنے والی آنکھیں نہ پھوڑ دوں تو افضل نہ کہنا۔" افضل کے لہجے سے چھلکتی مضبوطی پر وہ اطمینان سا محسوس کرتے ہوئے اس کی طرف بڑی محبت سے دیکھ کر بولی۔

"اتنی گرمی میں ایسی باتیں، غصہ تو جیسے ناک پر ہی دھرا رہتا ہے۔" دو چار پرندے اڑے ہوئے ٹاہلی کے اوپر آن بیٹھے تھے۔

"پتہ نہیں کیا بات ہے لاجو تمہارے سامنے آتا ہوں تو سارا غصہ غائب ہو جاتا ہے ورنہ میرے گھر والے کہتے ہیں میں غصے کا بڑا تیز ہوں خاص کر میری بھرجائیاں۔"

وہ گرم کھردری گھاس کو نوچتے ہوئے ہنس دی، دوپہر کی تیز دھوپ سہ پہر کے زرد رنگ میں ڈھلنے جا رہی تھی، ہولے ہولے گرم ہوا اوپر کو اٹھ رہی تھی پھر جانے کیا ہوا کہ لاجو خاموش سی ہو گئی اور گرم ہوا کو اوپر اٹھتا دیکھنے لگی افضل بھی اس کی نظروں کی سمت دیکھنے لگا جہاں سوائے ویرانوں کے کچھ بھی نہ تھا۔

"کیا ہوا چپ کیوں ہو گئی ہو۔" افضل نے بازو سے ہلاتے ہوئے اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور وہ جو ویرانیوں کے سنہری خلا میں جانے کیا تلاش کر رہی تھی چونک گئی اور بازو کے اس حصے کو دیکھنے لگی جسے افضل نے چھو کر گلاب کر دیا تھا۔

"ڈر لگتا ہے مجھے، کہیں مجھے کوئی تجھ سے چھین نہ لے۔" اس کی بات سن کر افضل کھلکھلا کر ہنس دیا۔

"تو اتنی دیر سے یہی سوچ رہی تھی، جھلی، ایسا کوئی مائی کا لال پیدا نہیں ہوا جو ایسا کر سکے۔" اس نے ہولے سے اس کی تیکھی ناک کو چھوا تو وہ کسمسا گئی۔

"تمہاری ناک بہت سوہنی لگتی ہے مجھے، لونگ سے جگمگ جگمگ کرتی۔" اس نے اپنی طرف سے اس کی اداسی کم کرنے کی کوشش کی اور لاجو جو یکدم اداس سی ہو گئی تھی اس کی بات سن ہنس دی تو وہ ہنسی دیر تک ان گرم سانسوں میں گونجتی رہی۔

☆☆☆

پنڈ واپس جاتے ہوئے اس نے زرد دھوپ کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے اپنے پیروں کی رفتار میں اضافہ کر لیا، وہ جلد ہی گھر پہنچنا چاہ رہی تھی اور دل تھا کہ افضل سے ہوئی ملاقات کا مزہ لینا چاہ رہا تھا وہ دھیرے دھیرے چلنے کو کہہ رہا تھا اس کی باتوں کی چاشنی سے اپنے ہونٹوں کو میٹھا کرنا چاہ رہا تھا، دل بھی عجیب شے ہے کیسے کیسے تقاضے کرتا ہے۔

سہ پہر ہو چکی تھی، راستہ زیادہ رونق والا نہیں تھا، اسے کوئی بھی چلتا پھرتا نظر نہیں آ رہا تھا اس لئے وہ بے خوف چلی جا رہی تھی۔

اپنے دل کی بات ماننے کو جی تو چاہ رہا تھا کیونکہ وہ تو دوسرے رستے پنڈ چلا گیا تھا مگر اس کی باتیں ابھی بھی اس کے اوپر بادل اوڑھے

کھڑی تھیں جو چمکتی دھوپ میں بھی ٹھنڈک کا احساس دے رہی تھی، محبوب کا خیال ہر طرح کے احساس سے عاری کر دیتا ہے اور وہ بھی تو اس وقت ہر احساس سے عاری تھی جس میں افضل کی محبت شامل نہ تھی۔

اب وہ بسنتر (ندی) کے قریب قریب آ گئی تھی جس کے ایک طرف گھنا جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا اب پنڈ زیادہ دور نہیں تھا اسی بسنتر کے پاس آ کر چاچا اکثر ریاض کرتا تھا، بسنتر کا پانی بڑی سست روی سے آگے بڑھ رہا تھا ابھی برسات شروع نہیں ہوئی تھی ورنہ بارش کے دنوں میں بسنتر کا پانی باہر رستے تک آ جاتا تھا۔

برسات کے دنوں میں جب ساری ساری رات بارش برستی تو سویرے سویرے پتہ چلتا کہ فلاں کی حویلی کی دیوار گر گئی ہے، فلاں کی چھت ٹوٹ گئی، یوں تو بارش رحمت ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی زحمت بھی بن جاتی ہے اور وہ غریب لوگ جن کی زندگی پہلے ہی مصیبتوں سے گھری ہوتی ان کے لئے چھوٹا نقصان بھی کسی بڑے صدمے سے کم نہیں ہوتا۔

دل کے کہے کو فی الحال ٹالتی وہ تیز تیز چلنے لگی تبھی اس کے کانوں میں جیسے کسی نے کوئی میٹھا رس ڈال دیا اس کے پیر یکدم رک گئے، کوئی نسوانی آواز تھی جس نے اس کے پیروں میں زنجیر ڈالی تھی، اس نے اپنے آس پاس سے نظر ڈالی۔

"یہاں کون ہے ایسا؟" اس نے حیرت سے سوچا۔

وہ آواز دوبارہ اس کے کانوں سے ٹکرائی، راگ ملتانی کے درد بھرے سر تھے جن کو کوئی نسوانی آواز اپنے گلے سے نکال رہی تھی۔

"کیسا درد تھا اس آواز میں، کون ہے۔" وہ بے چین سی ہو گئی اور پھر ادھر ادھر دیکھا تو خود سے کافی فاصلے پر بسنتر کے دوسرے کنارے پر بیٹھی ایک لڑکی نظر آئی جس کا منہ اسی کی طرف تھا مگر وہ تھی دور اس لئے وہ پہچان نہ پائی کہ وہ کون ہے۔

"راگ ملتانی، جسے بریا راگنی بھی کہا جاتا ہے۔" اسے چاچے کی باتیں یاد آئیں چاچا یہ راگ اکثر گنگناتا تھا، چاچے کی یہ عادت تھی وہ جب بھی کوئی راگ گاتا اس کے بارے میں لاجو سے بات کرتا کہ یہ راگ کیسا ہے اسے کب گایا جاتا ہے اور اسے یاد آیا کہ یہ راگ سہ پہر کے وقت پھیلی زرد دھوپ میں گایا جاتا ہے، زرد دھوپ جو دکھ کی علامت سمجھی جاتی ہے، چاچا تو راگ کی شکلیں بھی بتاتا تھا ایک دفعہ اس نے راگ ملتانی کی شکل یوں بتائی تھی کہ، پیلے رنگ کا کپڑے پہنے اس پر تان پورا ہاتھ میں پکڑے اداس اور ویران آنکھوں والی لڑکی، جس کے چہرے پر ہر وقت زردی چھائی رہتی ہے، اس کے موسم کو دکھ کا موسم کہا جاتا ہے۔

وہ اس درد بھری آواز میں پوری طرح ڈوبی ہوئی تھی، بسنتر کا پانی آواز سنتا خود بھی مست سا ہو گیا تھا جیسے وہ آگے کو بڑھنا نہیں چاہ رہا۔

چاچے نے یہ بھی بتایا تھا کہ راگ ملتانی سات بہنیں ہیں، ملتانی، مدھوونتی، پہاڑی، باگیشری، اساوری، راگیشوری، بھوپالی اور ان کا ایک بھائی ہے، پوریا جس کے گانے کا وقت شام کا ہے۔

وہ دیر تک اس کے سروں کو اپنے دل پر محسوس کرتی رہی پھر دیر ہو جانے کے ڈر سے دل نہ چاہتے ہوئے بھی واپس ہو گئی۔

گھر آ کر اس کا دل چاہا کہ وہ چاچے سے اس لڑکی کا ذکر کرے کیونکہ اسے پتہ تھا کہ چاچے

کو سر والے لوگ بہت پسند ہیں پر چاہ کر بھی وہ
چاچے کو نہ کہہ سکی کیونکہ پھر چاچے کو اسے اور بھی
بہت کچھ بتانا پڑ جانا تھا۔

☆☆☆

"فریب" انسان نے جیسے اس لفظ کے اندر
پناہ لے لی ہے اسے رتی برابر بھی اس لفظ کو
برتنے میں خوف نہیں آتا، لیکن کیوں، کیوں وہ
اتنا بے خوف اتنا نڈر ہو گیا ہے کیوں اسے اس لفظ
میں خوشی نظر آتی ہے۔

لچھی اسے بھی تو نمبردارنی بلقیس کو فریب
دیتے ہوئے خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا، اک
عورت دوسری عورت کو فریب دے رہی تھی،
رشتوں کو مان دینے والے لوگ کہاں جا چھپے تھے
دنیا فریب کے اس چنگل سے کیوں باہر نہیں
نکل پا رہی تھی، کیوں...... کیوں...... اس کیوں کا
اتنا بڑا نشان کسی کو دکھائی نہیں پڑ رہا۔

"لچھی، تو روٹی پکانے سے ویلی ہو گئی ہو تو
میرے ساتھ ذرا ملکاں دی حویلی تو چل۔"
نمبردارنی سجی سنوری جیسے لچھی کے دل پر گرم گرم
کوئلہ رکھ گئی، کتنا کچھ پہن رکھا تھا اس نے،
آنکھیں سونے کی چمک سے چندھیا گئیں تھیں،
دل کی بھوک چمک اٹھی۔

لچھی نے اپنے گیلے آٹے سے چمٹے ہوئے
ہاتھوں کی طرف دیکھا اور حسرت کے ساتھ
پیاری (باورچی خانہ) کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا
لی، نمبردارنی اب بنو کے ساتھ کسی بات پر الجھ
رہی تھی، اپنے گیلے ہاتھ سے گیلا آٹا مڑور مڑور کر
نیچے زمین پر پھینکتے ہوئے اس کا ذہن کئی سوچوں
میں بٹ گیا تھا، نمبردارنی کی بڑی بہو ولایت گھر
کے پچھواڑے سرخ مرچیں دھوپ میں ڈالنے گئی
تھی، بیگاں کے ساتھ، منجھلی ریحانہ اپنے میکے گئی
تھی اور سب سے چھوٹی زلیخا سدا کی نکمی اپنے

کمرے میں پڑی بھی توڑ رہی تھی، نمبردار ا
ابھی باہر سے لوٹا تھا، نمبردارنی گھر سے باہر
رہی ہے، اگر ایسے میں میں گھر سے باہر چلی گئی تو
موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔

اس کے لال مکھڑے پر کچھ سوچ کر ہی
لالیاں سی دوڑ گئیں، کل میں نے بڑی ہی سوہنی
چنی دیکھی تھی منظور کی دکان پر، پر پیسے نہیں تھے،
آج میں نے وہ چنی ضرور لینی ہے۔

اک سفاک سی سوچ اس کے ذہن میں
کوندی، لالچ اور بے شرمی اسے دور کھڑے
انتہائی قدم اٹھانے پر اکسانے لگے اور وہ
نمبردارنی کو فریب دینے کے لئے تیار ہو گئی۔

"وہ جی میرے سر میں بڑی پیڑ (درد) ہو
رہی ہے، سوچ رہی ہوں کہ کام سے ویلی ہو کر
تھوڑا آرام کرلوں۔" بناوٹ اور فریب کے رنگوں
میں لپٹی وہ نمبردارنی کو ذرا بھی بے ایمان نہ لگی،
شاید جو لوگ دل کے سچے ہوتے ہیں انہیں ہر
رشتہ ہی سچا اور کھرا لگتا ہے۔

"اچھا چل ٹھیک ہے جا اندر جا کے منجھی پر
لیٹ جا، آرام آ جائے گا تو کام کر لینا۔" وہ نیک
بخت فوراً اس کی باتوں پر یقین کر گئی۔

"اور سن نمبردار جی کو اندر کھانا بھجوا دینا۔"
لچھی تو خوشی سے جھوم اٹھی تھی، اس وقت لچھی کو
نمبردارنی بڑی بھولی اور خود کو وہ بڑی بے ایمان
لگی تھی ایسی بے ایمانی جس پر وہ ذرا بھی شرمندہ
نہیں تھی۔

چہرے پر جیسے لالیاں سی دوڑ گئیں اور انہی
لالیوں پر تو وہ فدا تھا سوہنی تو وہ بہت تھی اس پر
لہک لہک کر نمبردار کے سامنے پھرنا اسے پاگل ہی
کر دیتا تھا وہ عمر کے اس حصے میں اس پر مرمٹا تھا
جب لوگ ایسی باتوں سے توبہ کر لیتے ہیں۔
روٹی لا کر اس نے نمبردار کے آگے رکھ دی

وہ اسے آتا دیکھ کر کھل اٹھا تھا اور اب بڑی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

نارنجی رنگ کے کپڑوں میں وہ اندر باہر سے آگ بنی ہوئی تھی اس کے اوپر ناک میں پہنی ہوئی تھلی جیسے نمبردار کے بڈھے جسم میں بجلیاں گراتی اسے جوان بنانے لگی، گوراچٹا گداز بدن، بھری بھری گوری کلائیاں، نمبردار کی نظروں کی زد میں تھیں۔

وہ بڑی ادا کے ساتھ چلتی ہوئی اس کے سامنے آن رکی اور پھر پاس رکھے موڑھے پر بیٹھ گئی، چنی نیچے کو ڈھلکی، نمبردار نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا وہ اس کی حالت پر بڑی ادا سے مسکرائی جیسا چاہ رہی تھی ویسا ہو رہا تھا۔

''پہلے مارتی ہو پھر ہنستی ہو۔'' نمبردار فضل الٰہی نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا گوری کلائی میں چوڑیاں کھنکنائی۔

''تیرے ہاتھ میں لال لال چوڑیاں، سمجھ نہیں آئی۔'' فضل الٰہی ہاتھ مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا اور اس نے بھی ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہ کی۔

''میرے سینے میں بھی دل ہے۔'' وہ بڑے معنی خیز انداز میں اسے دیکھ کر ہنس رہی تھی، نمبردار کی آنکھیں کسی خیال سے چمک اٹھیں۔

''تیرے ارادے مجھے نیک نہیں لگ رہے۔'' وہ بڑی بدمعاشی سے ہنسا تو وہ بھی زور سے ہنس دی، نمبردار کو بھی پتہ تھا کہ اس کی گھر والی گھر نہیں ہے، بہویں اپنے اپنے جھمیلوں میں پڑی ہیں لڑکے باہر ہیں صرف افضل ہے جو اپنے کمرے میں سو رہا ہے اور ویسے بھی وہ باپ کی بجائے ماں کے زیادہ قریب تھا اس کی وجہ یہی تھی کہ باپ زیادہ توجہ نہیں دیتا تھا اسے ویل ہی نہیں ملتی تھی۔

نمبردارنی کی غیر حاضری کا دونوں نے خوف فائدہ اٹھایا تھا، لالچ کے ساتھ ساتھ اس نے اپنا نشہ بھی پورا کر لیا تھا۔

☆☆☆

لاجو نے اپنی اور چاچے کی چارپائیاں چھت پر بچھا دی تھیں جو بغیر چار دیواری کے تھی اور گاؤں میں اکثر چھتوں کی چار دیواری نہیں تھی ان کی چھت کے ساتھ اور بہت سی چھتیں تھیں جن میں ہر چھت پر چارپائیاں بچھ چکی تھیں انہی میں سے ایک چھت نذیراں کی بھی تھی جو بستر بچھا کے نیچے جا چکی تھی۔

چھتوں پر بستر بچھ چکے تھے مگر ابھی سونے والے اوپر نہیں آئے تھے اس کی وجہ تھی کہ ابھی سونے میں کافی ویلا پڑا تھا۔

ہوا گرم جھولے اوڑھے ہولے ہولے پنڈ کی گلیوں میں مٹر گشتی کرتی نظر آ رہی تھی اور گرمی سے ستائے ہوئے لوگوں کو وہ ہوا بھی جنت سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ پہلے لوگ اپنے اپنے صحنوں میں آرام سے سو جاتے تھے مگر گرمی نے تو یکدم زمین والوں پر ہلا بول دیا تھا اک عذاب ہی تھا جو اتر آیا تھا زمین والوں پر گرمی کی صورت میں۔

پہلے پہلے جو قومیں خدا کی نافرمانی میں حد سے بڑھ جاتی تھیں تو کسی نہ کسی صورت میں خدا ان پر اپنا عذاب اتارتا تھا، بارش کی فراوانی کی صورت میں آندھی کی صورت میں۔

آج کا انسان بھی نافرمانی کی ساری حدیں توڑ چکا ہے بلکہ وہ کون سی برائی نہیں ہے جس کی طرف انسان نہیں جا رہا، ہمیں پتہ نہیں چلتا، عذاب ہم پر بھی تو اترتا ہوگا، کبھی بہت گرمی کی صورت کبھی گرہوں کی شکل میں مرنے کی صورت میں اور اگر ایسی چیزوں کا نام عذاب ہے تو ہم

اس کے حق دار ہیں۔
گرمی بہت بڑھ گئی تھی اس لئے لوگ چھتوں پر چارپائیاں بچھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔
اپنی چارپائی بچھا کر وہ خود بھی تھکی ہاری اس پر بیٹھ گئی اور اس طرف دیکھنے لگی جہاں افضل کی اونچی اور سوہنی لال چھوٹی اینٹوں سے بنی حویلی غریب ترسے ہوئے دلوں پر اپنی دھاک بیٹھا رہی تھی، وہ بھی اپنی چھت پر موجود تھا اسے تو وہ بند آنکھوں سے بھی دیکھ سکتی تھی وہ دونوں اب محبت کی جن اونچائیوں کو چھو رہے تھے وہاں پہچان آنکھوں سے ہٹ کر روح کے قدموں میں ڈھیر ہو جاتی ہے، روح جو سانس ہے زندگی ہے جسم ساتھ چھوڑتا ہے روح نہیں اور روح سے تعلق بندھ جائے تو کسی اور تعلق کی ضرورت نہیں رہتی، لیکن کبھی کبھی وہ بہت اداس اور غمگین ہو جاتی، افضل کی پکی اینٹوں سے بنی حویلی جسے اسے خود پر اور اس کی غربت پر ہنستی محسوس ہوئی، وہ تو اسے ہر طرف سے اپنی محبت کا یقین دلا چکا تھا پھر بھی دل کی کسی نکڑ میں کنڈلی مارے بیٹھا ڈر شور مچانے لگتا تو وہ خود بھی پریشان ہو جاتی، دل ڈوبنے ابھرنے لگتا۔
مٹی کے کچے مکان میں رہنے والی، حویلیوں کے خواب بننے لگی تھی، خواب کی دنیا تو جواری کے کھیلے ہوئے جوئے کی طرح ہوتی ہے لگ گیا تو ٹھیک ورنہ خالی ہاتھ۔
افضل نے تو اس کے خوابوں کو خوبصورت بنانے کے سارے مان اسے دیئے تھے، لیکن کیا پتہ، کیسی سوچ تھی جو کبھی کبھی اس کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لیتی اور بار بار اسے کہتی رک جا آگے نہ جانا جانے کیسے کیسے کھڈے تمہارے انتظار میں ہیں۔
انہی سوچوں میں ابھی وہ چھت سے نیچے آ گئی چاچا ابھی گھر نہیں لوٹا تھا اس نے ایسے ہی لکڑی کے باہری دروازے کی طرف دیکھا، خاموش دروازہ جیسے کسی جانی پہچانی دستک کا منتظر تھا، وہ بڑے بے بسی والے انداز میں ہنسی، یہ کیسے ہو سکتا ہے، وہ ویڑے میں بچھی چارپائی پر بیٹھ گئی، جامن کے پیڑ پر پرندے شور مچا چکنے کے بعد خاموش ہو چکے تھے کیونکہ اب اندھیرا پھیل چکا تھا، خالی صاف ستھرے ویڑے میں خاموش بیٹھی خود کو کتنی اکیلی لگ رہی تھی، آنکھوں سے پانی کی نمی اتر آئی تھی، افضل کا خیال پل کے لئے بھی اس کے ذہن کے پردے سے اِدھر اُدھر نہیں ہو رہا تھا اپنے اور اس کے درمیان بچھے فاصلے کو سوچتے ہوئے دل کے اندر اک پیڑ سی اٹھی دل جیسے سینے سے نکل کر اس کی مٹھی میں آ گیا اور اتھرو، جیسے کوئی بالٹیاں بھر بھر کے آنکھوں کے ڈونگوں سے باہر نکالنے لگا۔
شام کا وقت، خاموش ماحول اور اس کی ہچکیاں، قدرت بھی ملول ہو کر اس کے غم میں شریک اسے دیکھنے لگی۔
"میں تیرے بغیر اک پل نہیں جی سکتی افضل، میں جانتی ہوں کہ تم میرے ہو، پر وہموں میں لپٹی خوشیاں مجھے خوش نہیں ہونے دیتیں۔"
اپنے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے وہ خوب جی بھر کے روئی، دل تو جیسے پانی کا بلبلا بنا ہوا تھا جسے افضل کے خیال نے پھوڑ دیا تھا۔
کافی دیر وہ یونہی بیٹھی روتی رہی اور پھر چاچے کے آنے کا سوچتی نل کے پاس چلی آئی اور منہ دھویا چاچے کے سامنے کیسے وہ رو سکتی تھی، منہ دھونے کے بعد وہ کھرے (غسل خانہ) سے باہر نکل آئی تو دروازے کے پاس چاچے کے کھانسنے کی آواز سنتی جلدی سے منہ صاف کرتے دروازے تک چلی آئی اور کنڈی کھول دی۔

''تو آ گیا چاچا۔'' دوسری طرف منہ کر کے جیسے اس نے خود کو ہشاش بشاش ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی، شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا چاچے نے زیادہ غور نہیں کیا، آنکھوں کی لالی جیسے دن کا اجالا چھپا نہیں سکتا تھا اسے شام کے اندھیرے نے اپنے سیاہ آنچل میں چھپا لیا تھا۔

''بڑی ترے (پیاس) لگی ہے پتر۔'' چاچا بولتا ہوا چارپائی پر بیٹھ گیا، جس کا سرو (پایا) ایک طرف کو مڑ کر ٹوٹ گیا تھا، نیچے اینٹیں رکھ کر اسے سہارا دیا گیا تھا، چاچا بے دھیانی میں گرمی کا مارا پورے زور سے بیٹھا تو کھڑاک سے ایک اینٹ نیچے گر گئی پر چارپائی گری نہیں چاچا گرتے گرتے بچا لاجو نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا اور دوبارہ اپنی جگہ پر رکھنے کے بعد چاچے کو واپس چارپائی پر بیٹھا دیا، نئی بات نہیں تھی ایسا ہوتا ہی رہتا تھا، لاجو جلدی سے پیتل کے بڑے سے گلاس میں پانی بھر کر لائی، چاچا ایک ہی سانس میں پانی پی گیا۔

''اوے توبہ، گرمی نے جانے کس جگ کا بدلا لینا ہے، ہم غریب انسانوں سے۔'' وہ چارپائی سے اٹھتا بولا۔

''لے پتر۔'' چاچے نے خالی گلاس لاجو کی طرف بڑھایا جو ابھی تک چاچے سے اپنی سوجی آنکھیں چھپا رہی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد چاچا اوپر سونے کے لئے چلا گیا جاتے جاتے اس نے لاجو سے ہاتھ والا پنکھا مانگا تھا اور نیچے سے کام ختم کرنے کے بعد وہ پنکھا پکڑے اوپر آ گئی۔

''لے چاچا۔''

''ہلا پتر، رب تیری حیاتی دے، تجھے سکھی رکھے۔'' وہ لیٹے لیٹے اسے دعائیں دینے لگے، نیچے کی نسبت چھت پر سکون تھا ہوا بھی چل رہی تھی اس نے سرسری سا قریبی چھتوں کی طرف دیکھا تقریباً سبھی لوگ سونے کی غرض سے اوپر آ چکے تھے پرسکون سا ماحول سارے میں پھیلا ہوا تھا بس کبھی کبھی چھتوں سے اٹھنے والی آوازیں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ مدھم مدھم سنائی دیتیں، رات دھیرے دھیرے گہری ہونے جا رہی تھی، وہ جو نیچے سے اتنا پریشان اور رو کر آئی تھی موسم کی اتنی فیاضی دیکھ کر بھی خوش نہ ہو سکی۔

وہ چپ چاپ ہی اپنی چارپائی پر بیٹھ گئی اور اندھیرے میں بھی افضل کی حویلی کو دیکھنے لگی، ذہن وہاں کہیں افضل کو کھوج رہا تھا دل کو کسی بھی پل قرار نہیں آ رہا تھا۔

چاچا اپنی چارپائی پر سونے کی کوشش کر رہا تھا مگر لاجو کی نیند جیسے اس سے ناراض ہو کر کہیں دور افضل کی حویلی کے گرد چکر کاٹ رہی تھی، اس کی آنکھوں میں پھر پانی بھر آیا پھر لمبا سا ہوکا بھرتے ہوئے وہ چارپائی پر چت لیٹ گئی، تاروں بھرا آسمان خاموش سا تھا، اس نے آنکھیں موند لیں لیکن سونے کو دل نہ مانا اس نے پھر آنکھیں کھول دیں، بند آنکھوں کھلی آنکھوں وہی چہرہ اس کے سامنے تھا، بارعب سفید رنگت والا چہرہ جیسے اس کے پاس آنے لگا، کھلی آنکھوں وہ خواب دیکھ رہی تھی، کیا یہ خواب پورا ہو گا؟

ایک بار پھر یہ سوال اس کے آسے پاسے چکر کاٹنے لگا، دل برداشتہ سی وہ لیٹ گئی پھر وہیں چارپائی پر اس کے ساتھ کسی کے لیٹ جانے پر وہ سہم سی گئی۔

''نذیراں!'' آنے والی کو پہچان کر اس کے منہ سے نکلا۔

''کیا بات ہے بڑی چپ چپیتی روسیاں ڈال رہی ہو۔''

''جھلی نہ ہو تو ڈرا دیا مجھے۔'' وہ بڑی آہستہ

آہستہ بولی کہ کہیں چاچا نہ سن لے۔

''لے اتنے جی دار بندے کے ساتھ دل لگایا ہے تو نے، پھر بھی ڈرتی ہو۔'' نذیراں نے لیٹے لیٹے اس کی کمر میں مکا مارا۔

''جندرا لگا منہ کو۔'' لاجو نے اس کے منہ کے آگے ہاتھ رکھ دیا۔

''چاچا نہ سن لے میں پہلے بڑی پریشان ہوں۔'' وہ بہت ہولے ہولے بات کر رہی تھی کیونکہ رات کی خاموشی ذہن میں رینگنے والے خیالوں کو بھی زبان دے دیتی ہے۔

''را نجھے سے ملے لگتا ہے بڑے دن ہوئے ہیں اس لئے ہیر کا منہ ماڑا ماڑا ہو گیا ہے۔''

''ڈر لگتا ہے مجھے نذیراں، یہ سب اگر اک سفنہ ہوا تو۔'' نذیراں جو بڑی شوخی میں بات کر رہی تھی اس کی بات پر خاموش سی ہو گئی۔

''یہ بات مجھے بہت دکھی کرتی ہے، میرا بس نہیں چلتا میں کروں۔''

''کیا افضل کے پیار پر تجھے یقین نہیں۔''

''خود سے بھی زیادہ یقین ہے، لیکن میں کہاں وہ کہاں۔'' اس نے رندھی ہوئی آواز کے ساتھ لیٹے لیٹے اک حسرت بھری نگاہ اس کی حویلی پر ڈالی جہاں رات کے سیاہ سناٹے منڈلا رہے تھے فرق تو بہت زیادہ تھا، زمین آسمان کا، لاجو کا چہرہ کسی مزار کے بجھے ہوئے دیئے کی طرح اداس و ویران تھا۔

''لاجو وہ تم سے پیار کرتا ہے جب اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تو، تو کیوں سوچ سوچ کر جھلی بن رہی ہے۔'' نذیراں نے پیار سے اسے سمجھایا۔

''وہ مرد ہے شاید اسے یہ باتیں چھوٹی چھوٹی لگتی ہیں، پر میں اپنے دل کا کیا کروں۔'' وہ منہ میں کپڑا ٹھونسے رونے لگی تو نذیراں کا دل بھی پسیج گیا۔

☆☆☆

وہ حویلی کے اندر داخل ہوئی تو سامنے افضل اپنے کسی کامے سے بات کرتا نظر آیا چہرے سے ہلکی ہلکی، ہنسی چھلک رہی تھی اور وہ ہنسی اس کے سفید چہرے پر کتنی سوہنی رہی تھی بچھی اک لحظے کے لئے ٹھٹک گئی، کیا تھا اس گزرتے لمحے میں کہ وہ افضل کو یوں دیکھنے پر مجبور ہو گئی تھی شاید وہ جب سے اسے جانتی تھی آج پہلی بار اسے یوں ہنستے دیکھا تھا اس کے اندر کوئی چیز مڑوڑا (کسمسا) کھا کر رہ گئی۔

''کتنا سوہنا جوان ہے۔'' بے اختیار اس کے دل نے سوچا۔

بھرپور مرد، مضبوط، توانا، طاقتور، جوان، اس کا چوڑا چکلا سینہ، قمیض کے اندر سے بھی نمایاں ہو رہا تھا، چھ فٹ قد پر توانا جسم، بچھی کو خود کو سنبھالنا مشکل ہو گیا، وہ اسے دیکھ کر اک ٹھنڈا ہوکا سا بھر کے رہ گئی۔

افضل نے اس کی طرف دیکھا نہ تھا وہ ویسے ہی باتوں میں لگا ہوا تھا بچھی نے اس کے غصے کا سن رکھا تھا اس لئے چاہنے کے باوجود وہ وہاں سے ہٹ گئی اور پساری میں چلی آئی۔

پساری میں کام کرتے ہوئے بھی اس کا ہنستا مسکراتا چہرہ اس کے آگے گھومتا رہا پھر اس کے خیال کو ذہن کے پردے سے جھٹکتی وہ نمبردار کو کھانا دینے اس کے کمرے میں چلی آئی، آگے نمبردارنی بھی وہاں موجود تھی وہ نواڑی پلنگ پر صاف ستھرے بستر پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا تھا نمبردارنی اس کا بازو دبا رہی تھی، بچھی ان دونوں کو دیکھ دروازے میں ٹھٹک گئی، یکدم اسے اپنی حیثیت یاد آ گئی۔

''آجا اندر آجا۔'' نمبردارنی سدا کی بھولی بڑی محبت سے بولی۔

''لا یہاں روٹی رکھ دے۔'' وہ کھانے کی چنگیر اٹھائے نمبردار کی طرف دیکھتی آگے کو بڑھ آئی تو اس کے پیچھے ہی بنتو بھی اجازت لیتی اندر آ گئی۔

''نمبردارنی جی وہ وڈے صاحب کہہ رہے ہیں آپ تیار ہیں تو آ جائیں۔'' نمبردار نے بنتو کی بات پر ان کی طرف دیکھا۔

''لو، میں تو پل (بھول) ہی گئی، میں ولایت اور دلاور کے ساتھ اس کے میکے جا رہی ہوں اس کی ماں ٹھیک نہیں ہے بتاتے تو میں یہی آئی تھی مگر بھول گئی۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''ہلا، چل ٹھیک ہے جاؤ۔'' نمبردار نے ایسے کہا جیسے اسے جلد جانے کو کہہ رہا ہو اور وہ ان دونوں کے مقصد سے بے خبر باہر نکل گئی، نمبردار نے پچھی کو ہلکا سا دروازہ بند کرنے کو کہا۔

''میں صدقے جاؤں، میری پھلجھڑی کہاں تھی اتنی دیر سے، میں تو تجھے اڈیک اڈیک کے سکھ کے کانا ہو گیا۔'' نمبردار نے اس کے ہاتھ کو ہاتھوں میں لے لیا اور چومنے لگا پچھی کا دل لال بمبیری بنا پر لگا کر اڑنے لگا اس لڑکی کا دل جانے موم کا بنا تھا جو ہر مرد کی گرمی کے آگے پگھلنے لگتا تھا۔

''جی تو چاہتا ہے تیرے ساتھ گل نہ کروں۔'' وہ ادا سے تھلی والی ناک سکوڑتے بولی۔

''تو گل کی بات کرتی ہے تجھے دیکھ میرا تو انگ انگ اس عمر میں بھی کٹے مرغے کی طرح پھڑ کنے لگتا ہے۔'' وہ اس کے اور قریب آ گیا تو پچھی کے گال لال ہونے لگے۔

''تو ہے ہی اتنی سوہنی، جی تو چاہتا ہے۔'' وہ اور قریب آنے لگا تو وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''تیرا پتر افضل ابھی گھر ہی ہے۔'' افضل کا نام سنتے ہی وہ وہیں رک گیا۔

''سارا مزہ کرکرا کر دیا۔'' وہ ٹھنڈی آہ سی سینے سے نکالتا پلنگ کی پشت کے ساتھ لگ کے بیٹھ گیا، پچھی کے ہونٹوں پر ہنسی مچلنے لگی وہ اس کے اندر لگی جذبات کی آگ کو بھڑ ہاوا دینے کے لئے بڑے لہک لہک کر اس کے سامنے پھرنے لگی۔

''بڑی خبیث ہے تو، آگ کو لگانا بھی خوب آتا ہے اور بھڑکانا بھی۔'' وہ بڑی بے بسی سے اسے اپنے سامنے پھرتا دیکھ رہا تھا۔

''لے اس میں میرا کیا قصور جو وہ گھر ہے۔''

''سارا قصور ہی تیرا ہے۔'' اس نے آگے بڑھ کر اسے پکڑنے کی کوشش کی جو جان بوجھ کر شرارتاً اس کے بہت قریب آ گئی تھی مگر ناکام رہا۔

''شام کو باہر والی حویلی آنا نہ بھولنا۔'' وہ ہار کر کھانے کی طرف بڑھا جو پڑا پڑا ٹھنڈا ہونے لگا تھا۔

''باہر والی حویلی، نہ بابا مجھے ڈر لگتا ہے۔'' وہ ایسے بولی جیسے کوئی بڑی بھولی معصوم بچی ہو۔

''رات کو بدروحیں باہر پھرتی ہیں، میں نئی آتی۔'' وہ جیسے اوپر اوپر سے انکار کر رہی تھی نمبردار بھی سمجھ رہا تھا۔

''تو، تو خود ایک بدروح ہے، خون پینے والی۔'' نمبردار نے بڑی شرارت سے آنکھ دبائی تو وہ غصے سے آنکھیں نکالنے لگی۔

''اچھا بابا تو وہ جادوگرنی ہے جس نے میرے جیسے بڈھے کو اپنے جادو سے سب کچھ بھلا دیا ہے، سب کچھ۔'' اتنا کہتے ہوئے نمبردار کی آنکھوں کے آگے ایک سایہ سا لہرایا شمشاد جان

کا، جسے سال پہلے وہ آئے دن بلاناغہ ملا کرتا تھا جسے ایک دن نہ دیکھتا تو جان جاتی تھی وہ لاہور کی بڑی مشہور ناچنے والی تھی۔

"کیا ہوا؟" کچھی نے آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا۔

"کچھ نہیں اب جا اور رات کو جلدی آنا۔" نوالہ ہاتھ میں پکڑے پکڑے وہ کچھ سوچتے بولا۔

"اماں اور ابا کو کیا بتا کر آؤں گی۔"

نمبردار، کچھی کی بات سن فیر کسی سوچ میں ڈوب گیا اور پھر کھانا چھوڑے پلنگ سے نیچے اتر کر الماری کے پاس گیا اور اس سے کچھ نکالنے لگا۔

"یہ لے نیند کی گولیاں ہیں، پانی میں ڈال کر دینا ساری رات بے خبر سوتے رہیں گے۔" نمبردار کے ہاتھ سے گولیاں لیتے ہوئے وہ خود کو کتنی کمینی لگی تھی۔

☆☆☆

ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں وہ راستہ تلاش کرتی چھوٹے جنگل کی طرف جارہی تھی، حویلی پنڈ سے کافی باہر تھی، رات اور جنگل کا راستہ، جنگل ابھی شروع نہیں ہوا تھا، وہ پگڈنڈیوں پر سنبھل کر چل رہی تھی ڈری ڈری سہمی، آج پہلی دفعہ وہ نمبردار کی اس حویلی میں جا رہی تھی یہ حویلی جسے وہ رنگ محل کہتا تھا اس نے اپنے اوباش کاموں کو سرانجام دینے کے لئے گھنے جنگل میں عین درمیان میں بنوائی تھی شمشاد بائی کو بھی وہ اسی حویلی میں بلواتا تھا، شمشاد سے اس کا تعلق زیادہ پرانا نہیں تھا پچھلے سال جب وہ میلے میں لگنے والی نوٹنکی میں آئی تو نمبردار پر دل و جان سے مرمٹی، نمبردار بھی کچھ ایسا ہی چاہتا تھا وہ تو پہلے ہی تنہائیوں کا مارا تھا، پیسہ اس کے پاس بے بہا تھا جسے وہ بوریاں بھر بھر کر لے گئی، پھر جب نمبردار کی پیاس بھڑکتی وہ شہر کا رخ کرتا، لیکن اب کچھی گھر بیٹھے اسے وہ سب کچھ دینے لگی تھی جس کے لئے وہ شہر جاتا تھا، دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا، فرق تھا تو صرف گھر اور کوٹھے کا، لالچ کسی بھی انسان کو نڈر اور بے خوف بنا دیتی ہے، آنکھوں پر اک عجیب سی پٹی بندھ جاتی ہے، ہوس کا میدان بہت کھلا اور ہرا بھرا ہوتا ہے جہاں روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں ہوتا لیکن جو بھی اس میدان میں قدم رکھتا ہے وہ یہ نہیں جانتا کہ بظاہر حسین نظر آنے والا میدان اپنے اندر ایسی دلدل لئے ہوتا ہے جو دھیرے دھیرے بنا بتائے اپنی طرف آنے والوں کو اپنے آپ میں سمو لیتا ہے اور کچھی بھی اس دلدل میں قدم رکھ چکی تھی۔

افضل کا خیال بھی چپکے سے کسی خاموش سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا پر نمبردار کے خوف سے اس نے بہت جلد اس خیال کو جھٹک دیا۔

نمبردار کی ہدایت کے مطابق باہر کا بڑا سا لکڑی کا دروازہ کھلا ہوا تھا وہ اندھیرے سے خوف کھاتی بڑے بڑے قدم اٹھاتی جلدی سے اندر آ گئی دروازے کے پاس بھی بڑا اندھیرا تھا ڈرانے والا، روشنی کا انتظام ہوگا مگر ایسے لگ رہا تھا جیسے جان بوجھ کر بند کی گئی تھی، ڈری ڈری سی وہ اندرونی دروازہ کے پاس آ گئی، اندھیرے کی وجہ سے کچھ خاص نظر نہیں آرہا تھا، دروازہ بند تھا وہ کھڑی ہو گئی، دروازہ پتہ نہیں کھلا ہے یا بند ہے، کیا کروں کھولوں یا؟

وہ ابھی اسی کشمکش میں تھی کہ دروازہ اپنے آپ کھٹ سے کھل گیا وہ بری طرح کانپتی ڈر گئی اندر سے نکلنے والا بڑی تیزی سے باہر نکلا تھا اور بے دھیانی میں وہ بری طرح کچھی کے ساتھ ٹکرا گیا، اس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی، کچھی کے حواس جانے کو تھے اس نے ہاتھ سے دیوار کو

تھام لیا، بوکھلاہٹ میں آدھے چہرے سے نقاب اتر گیا تھا، تھلی کی چمک نقاب کے اندر سے بھی جھانک رہی تھی۔

ہوش پکڑتے ہوئے پچھی نے جلدی سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا تو اک عجیب سی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی جو بڑی تیز سی تھی، اندر سے نکلنے والا بھی جسے پچھی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا کچھ لمحے وہاں کھڑا رہا تھا پھر جلدی سے باہر نکل گیا۔

نمبردار کا خاص ملازم اسے نمبردار کے کمرے تک چھوڑ گیا اور یہ وہ جگہ تھی جہاں دونوں کے لئے کوئی روک ٹوک نہ تھی نہ نمبردارنی کا ڈر اور نہ زمانے کا، پچھی کو جو چاہیے تھا وہ ڈھیرے ڈھیرے حاصل کر رہی تھی اور نمبردار اپنے ہوس کے گلشن میں نئے پھول اگا رہا تھا۔

نمبردار پوری طرح اس کے جادو کے زیر اثر تھا اور یہی وقت تھا جب پچھی اس سے اپنے مطالبے منوا سکتی تھی اور وہ سب کچھ کرنے کو بھی تیار تھا پچھی نے بازار میں دو دکانیں تھیں جن کی اس سے مانگ کی تھی، وہ بھی مفت میں نمبردار سے تعلق نہیں رکھے ہوئے تھی وہ پاگل نہیں تھی جو جوانوں کو چھوڑ کر اک بڈھے پر اپنی محبتیں لٹا رہی تھی اور نمبردار بھی منجھا ہوا کھلاڑی تھا جو فی الحال اسے لارے ہی لگا رہا تھا۔

صبح ہونے سے کافی پہلے نمبردار کا خاص کاما بدرا اسے گاؤں کے اندر تک چھوڑ آیا تھا۔

ابھی اذان کا وقت نہیں ہوا تھا ابا تو اس وقت اٹھ جاتا ہے اس نے ڈرتے ڈرتے ابے کی چارپائی کی طرف دیکھا مگر وہ سو رہا تھا، ''ابھی تو تھوڑی دیر میں اذان ہونی ہے'' اور اسے یاد آیا کہ اس نے تو دونوں کو نیند کی گولیاں دی تھیں، آج کیا نمازی اذان کے بغیر نماز پڑھیں گے، لیکن وہ گندگی کے جس ڈھیر کو اپنی جھولی میں بھر کر لائی تھی وہ اذان کی برکت کی اہمیت کو سمجھ نہیں سکتی تھی، وہ لالچ اور ہوس کے کنوئیں میں کود دی تھی ڈوبنا تو یقینی تھا۔

بشیر احمد (امام مسجد) اتنے عرصے میں آج پہلی دفعہ انہوں نے اذان نہیں دی تھی، مینہ ہو آندھی ہو، اذان دینا وہ جیسے سانس لینے سے بھی زیادہ ضروری سمجھتے تھے، کیا ہوا آج، یہ لفظ پنڈ کے ہر بندے کی زبان پر تھا کئی تو سویرے سویرے ان کے گھر آ گئے کہ خدانخواستہ انہیں کچھ ہو تو نہیں گیا اور وہ خود حیرت کی تصویر بنے سب کا منہ دیکھ رہے تھے۔

''کیا ہو گیا؟ میری آنکھ کیوں نہ کھلی؟''

لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی بیٹی انہیں پاتال کی جن گہرائیوں میں پھینک رہی ہے وہاں سے نکلنا مانوں سفنے دیکھنے والی بات ہے، پورے پنڈ میں یہ بات کمن کیئریاں کھا رہی تھی۔

☆☆☆

لاجو نذیراں کے ساتھ آپا جی کے گھر جا رہی تھی وہ پنڈ کے لڑکیوں کے سکول کی بڑی ماسٹرنی تھی انہوں نے لاجو کو ضروری کام کے لئے بلایا تھا، لاجو نے افضل کے کہنے پر پنڈ کے سکول سے دسویں پاس کی تھی چاچا تو انکار کرتا رہا مگر افضل کے کہنے پر اس نے چاچے کی ایک نہ سنی، سکول پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس نے سلائی کڑھائی، نالے بننے، پراندے ہر کام وہ کر لیتی تھی۔

''گرمی تو جان نہیں چھوڑ رہی۔'' نذیراں نے اپنے چہرے پر آیا پسینہ صاف کیا، دوپہر کا وقت تھا گرمی کے مارے لوگ برگد کے بڑے سے پیڑ کی چھاؤں میں چارپائیاں بچھائے حقہ پینے میں مصروف تھے، جانور بھی برگد کے مضبوط تنے کے ساتھ بندھے جگالی کر رہے تھے۔

برگد کے سبز سبز پتے گرم ہوا کے ساتھ شوخیاں کرتے جیسے گرمی کے احساس کو کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے، گرمی تو سب کے لئے جان لیوا تھی۔

''کوئی کیا سوچے گا کیسی بے آرام کڑیاں ہیں۔'' نذیراں کی بات پر اسے بھی ہنسی آ گئی تو یکدم اسے لگا جیسے وہ ہنسی کسی کی مضبوط گرفت میں آ گئی ہے وہ جلدی سے تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔

اور پھر جب وہ آپا جی کے گھر سے واپس جا رہی تھی تو افضل آپا جی کے بیٹے نوید کے ساتھ کھڑا نظر آیا جو افضل کا دوست اور ہم جماعت تھا، افضل نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے لاجو کو دیکھا تھا جیسے اسے یوں اس وقت اس کا باہر نکلنا پسند نہیں آیا تھا، وہ سہم سی گئی، نذیراں نے لاجو کی طرف دیکھا جو افضل کو دیکھ ڈر گئی تھی اور پھر شام کو وہ دوبارہ جا رہی تھی تو راستے میں افضل نے اسے روک لیا۔

''آپا جی نے کام کے لئے بلایا تھا۔''

''تم کسی کی کامی ہو، کیوں گئی تھی تم، مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔'' افضل غصے سے بول رہا تھا اور وہ خاموشی سے سن رہی تھی، افضل کو بہت غصہ تھا جو اس نے لاجو پر نکال دیا تھا لاجو کی آنکھوں میں موٹے موٹے اتھرو، افضل کا دل پسیج گیا۔

''مجھے معاف کر دو، میں پھر نہیں جاؤں گی اس کے گھر۔''

''اس کے گھر جانے کی بات نہیں، بس مجھے اچھا نہیں لگتا۔'' اس کا غصہ جھاگ ہونے لگا۔

''اچھا یہ رونا بند کرو اب۔'' اسے لاجو کے اتھرو اپنے دل پر گرتے محسوس ہوئے۔

''تو جیسے کہے گا میں ویسے ہی کروں گی۔'' کتنی سچی لگی تھی اسے وہ، وہ چند لمحے خاموش اسے دیکھتا رہا، نشے کی پڑی، وحشت کرنے والی، راہ چلنے والے کو راہ سے بھٹکانے والی، سوچ کے پروں کو کاٹ کر بے وسعت خلا میں بے خود چھوڑ دینے والی، شراب کے نشے کو توڑ کر خود کے نشے میں ڈبونے والی، املی سے زیادہ کھٹی، گڑ سے زیادہ میٹھی، ساون کے مہینے میں باغوں میں کوکنے والی کوئل سے زیادہ سریلی، جو چلے تو ذرہ ذرہ اس کا ہمقدم ہونے کو ترسے، ایسے میں وہ اس پر کسی اور کی نظریں کیسے برداشت کر سکتا تھا، بارش کے صاف شفاف قطروں سے زیادہ سچی اور کھری لگی تھی وہ افضل کو۔

☆☆☆

لال رنگ کی ستاروں والی چنی لئے وہ نمبردار کی حویلی میں داخل ہوئی، نمبردار کی پیاسی نظریں بڑی دیر سے اسی کو ڈیک رہی تھیں مگر اس کا دھیان نمبردار کی طرف نہیں اس کے پاس بیٹھے ہوئے شخص کی طرف تھا جو بڑی حیرت اور غور سے بچی کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اسے پہچان رہا ہو۔

لشکارے مارتی اس کی چنی نیچے کو ڈھلکی تو نمبردار کے ساتھ ساتھ اس شخص کا دل بھی جیسے دھڑکنا بھول گیا، وہ چنی اس پر غضب ڈھا رہی تھی۔

نمبردار نے جانے کیا سوچ کر دانتوں تلے ہونٹ دبا لیا، آنکھوں کے آگے کیا کیا نہ آیا، وہ بڑی ادا سے لہک لہک کر چلتی پیاری کے پاس آن رکی اور مڑ کر ان دونوں کی طرف دیکھا دونوں ابھی بھی بت بنے اسے ہی دیکھ رہے تھے، گورا چٹا بھرا بھرا سا بدن چنی کے اندر سے انہیں گدگدانے لگا، نمبردار کی سانسیں بھولنے لگیں اور کچھ ایسی ہی حالت ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کی بھی تھی جو اس حویلی میں نیا نیا منشی بھرتی ہوا تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

وہ اپنی نتھلی والی ناک کو سکوڑتے ہوئے سر کو جھٹک کر پساری کے اندر چلی گئی اور پھر تھوڑی دیر بعد شربت کے دو ٹھنڈے گلاس اٹھائے باہر آ گئی، نمبردار کے ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے بھی گلاس اٹھا لیا، دھیان اس کا پوری طرح لچھی کے چہرے کی طرف تھا جہاں لالیوں کا راج تھا۔

نمبردار نے ٹھنڈے لال شربت کی طرف دیکھا، اس کی مٹھاس اس سے کہیں کم تھی، اس نے گلاس سے نظریں اٹھا کر لچھی کی طرف دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں اسے گزرا وقت یاد دلایا۔

''لچھی یہاں آ کر بڑی الجھن میں پڑ گئی تھی یہ خوشبو میں نے کہا محسوس کی ہے اسے جیسے یاد نہ آیا، کہاں بھلا۔'' اسے پتہ نہیں چل رہا تھا۔

''پر یہ خوشبو میں نے محسوس ضرور کی ہے۔'' شاید وہ ذہن پر زیادہ زور ڈالتی تو یاد آ جاتا مگر نمبردارنی کے بلانے پر وہ خالی گلاس پکڑے اندر کو بڑھ گئی اور جاتے جاتے وہ دونوں پر کیسا جادو کر گئی تھی، جادوگرنی۔

اس کی ساس بھی اسے جادوگرنی ہی کہا کرتی تھی جب منیر سارا سارا دن اس کے پیچھے پاگل کتے کی طرح دم ہلاتا ہانپتا رہتا

''میرا پتر تو شیدائی ہو گیا لوگو۔'' ساس کی باتیں سن کر وہ اندر ہی اندر اپنی جیت پر ہنستی رہتی، جو جادو اس نے کیا تھا اس کا کوئی توڑ نہیں تھا حسن کا، دلربائی کا اور مرد کو کیا چاہیے ہوتا ہے عورت پر مکمل حکومت، جب چاہے جہاں چاہے، سو وہی جادو پھر اس کے کام آ رہا تھا۔

☆☆☆

جیٹھ کے بعد ماہ اساڑھ کی گرمی نے تو ویسے ہی لوگوں کی توبہ کرا دی تھی، گرد و غبار کے ایسے طوفان اٹھتے کہ میلوں گدلی فضا کے علاوہ کچھ بھی دکھلائی نہ پڑتا، آئے دن شام کے وقت آندھی سی آسمان کے سینے سے اٹھتی پھر چار چھینٹے بارش کے گرتے موسم کسی حد تک ٹھیک ہو جاتا مگر دوسرے ہی پل پھر گرمی اپنی کڑی آنکھوں سے گھور رہی ہوتی۔

کچی در و دیوار اور کچی چھتوں کا ایک فائدہ ہوتا ہے شدید گرمی کے باوجود گرمی کا زیادہ احساس نہیں ہوتا مٹی ٹھنڈی ہوتی ہے۔

''لاجو پتر!'' چاچا دروازے کے باہر سے اسے آوازیں دیتا اندر آ گیا، وہ برآمدے میں چارپائی کھڑی کر کے اس پر نالا بننے کے لئے چھوٹے چھوٹے کانے اکھٹے کر کے مٹی کے مٹکے میں رکھ رہی تھی۔

''کیا بات ہے چاچا؟'' وہ مٹکے کو ایک طرف کچی دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے خود بھی کھڑی ہو گئی۔

سہ پہر ختم ہونے کو تھی آج سارا دن گرمی نے حد کر دی تھی اور قدرت کا قانون ہے کہ خدا حد سے زیادہ اپنے بندوں کا امتحان نہیں لیتا جب بہت زیادہ گرمی پڑتی ہے تو شام کے وقت آندھی سے چلنے لگتی ہے اور پھر اس ریت اور گرد کے طوفان کے بعد بارش کے چار چھینٹے اس گرمی کی شدت کو کم کر دیتے ہیں، اب بھی فضا گدلی گدلی سی لگ رہی تھی تھوڑی دیر میں پھر آندھی کا طوفان اٹھنا تھا۔

''یہ لے پکڑ۔'' چاچے نے کپڑے کا تھیلا سا اس کی طرف بڑھایا۔

''اس میں کیا ہے چاچا۔'' لاجو نے تھیلا کھولتے ہوئے پوچھا اور پھر خود ہی بولی۔

''کریلے۔''

''ہاں بھر کے مصالحے والے پکانے ہیں۔''

چاچے کو کریلے بڑے پسند تھے۔

''تو کہاں چلا گیا تھا، میں تو تیری راہ بڑی دیر سے دیکھ رہی تھی۔'' وہ تھیلا پکڑے پساری میں چلی آئی، جامن کے پتے ہولے ہولے سے ہلنا شروع ہو گئے تھے، سورج گدلی فضاؤں کے پیچھے چھپ چکا تھا فضا میں مٹی کی خوشبو بسی ہوئی تھی، ہوا کے ساتھ ریت کے ننھے ننھے ذرات بھی فضا میں تیر رہے تھے۔

''پتر کیا بتاؤں میں اس وقت کہاں تھا۔'' چاچا اک ہوکا سا بھرتے ہوئے چارپائی پر بیٹھ گیا وہ بھی پساری سے باہر آ گئی اور پتوں کو ہلتے دیکھنے لگی۔

''لگتا ہے نیری (آندھی) پھر آنے والی ہے۔'' وہ جلدی سے ویڑے میں بکھری چیزیں اٹھا کر برآمدے میں رکھنے کے بعد چاچے کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی۔

''پتر دوپہر کا وقت ہو اور راگ ملتانی کے سر ہوں تو کون کم بخت ہے جس کا دل آگے بڑھنے کو چاہے گا۔''

''ایسا میٹھا سر، میں نے ایسی آواز کبھی نہیں سنی۔'' وہ حیران ہو کر چاچے کی طرف دیکھنے لگی کہ چاچا کس کا ذکر کر رہا ہے، پھر چاچے نے خود ہی اس سے اس بنجارن کا ذکر کیا۔

''اس کے گلے سے نکلتے سر تھے کہ موتی، میرا دل چاہا وہ یونہی گاتی رہے اور میں سنتا رہوں۔''

اس حقیقت کو تو لاجو بھی سمجھتی تھی وہ واقعی اس قابل تھی کہ اس کی اتنی ہی تعریف کی جائے، اب لاجو چاچے کو کیا بتاتی کہ تیرے سے پہلے میں اسے سن چکی ہوں۔

''میں تو ایسے ہی بستر کے کنارے کنارے جا رہا تھا میرے کانوں میں وہ آواز پڑی اور پھر میں اس آواز کا پیچھا کرتے کرتے ان بنجاروں کے گھروں تک چلا گیا، وہی وہ لڑکی گا رہی تھی، سبحان اللہ۔'' لاجو چاچے کے سامنے ایسے سر ہلا رہی تھی جیسے انہی کی زبان سے اس کا ذکر سن رہی ہو۔

ہوا میں پہلے سے زیادہ تیزی آ گئی تھی نیری نے ہر طرف گرد کی دیواریں سی کھڑی کر دی تھیں، جامن کے پیڑ پر لگا بور ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گرنے لگا، گلی میں بکھرے کاغذ اڑ اڑ کر ان کے گھر کی چھوٹی سی دیوار سے اندر کود رہے تھے، لاجو نے جلدی سے اٹھ کر دونوں کمروں کے دروازے بند کر دیئے، چاچا بھی سر اور منہ کو لپیٹے برآمدے میں آ گیا۔

ہوائیں بہت تیز ہو گئیں تھیں، شائیں شائیں کی آوازیں کانوں پڑی آواز سننے نہیں دے رہی تھیں، پرندے ہوا کے زور کے آگے بے بس خود کو اس کے حوالے کیے دے رہے تھے۔

لکڑی کے باہری دروازے کے پٹ آپس میں زور زور سے بج رہے تھے لاجو کو وہم سا ہو چلا تھا کہ اگر یہ یونہی آپس میں بجتے رہے تو ٹوٹ جائیں گے گھر میں تو اتنے پیسے نہیں کہ انہیں دوبارہ مرمت کروا سکیں۔

یہ بیٹیاں بھی خدا کی عجیب مخلوق ہوتی ہیں ماں باپ کے لئے محبت، احساس ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے، جب ماں باپ کے گھر میں ہوتی ہیں ہر طرح سے وہ ان کا خیال رکھتی ہیں، چھوٹی چھوٹی چیزوں چھوٹی چھوٹی باتوں کی پروا کرتی ہیں۔

اس نے دوپٹے سے اپنے کپڑوں کے اوپر گری گرد جھاڑتے ہوئے چاچے کی طرف دیکھا، اپنے باپ کے لئے اس کے دل میں بے پناہ محبت تھی وہ کیسے اس کا نقصان چاہ سکتی تھی سو خود کو

آندھی کے سپرد کرتی وہ باہر دروازے کی طرف بڑھ گئی اور پھر اس کی کنڈی چڑھا کر واپس برآمدے میں آ گئی، لیکن تب تک اس کے بالوں سے لے کر کپڑوں تک کا رنگ بدل چکا تھا۔

''ہاں چاچا۔'' وہ اپنے چہرے سے گرد جھاڑتی چاچے کی طرف دیکھنے لگی۔

''پتر تو نہ ہو تو میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔''

''پر وہ کیوں چاچا۔'' وہ ہنستے ہوئے چاچے کے پاس آ گئی اور اسے کندھے سے پکڑ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔

''اتنا خیال جو رکھتی ہے تو میرا، اس گھر کا۔'' وہ آنکھوں میں نمی لئے بول رہا تھا۔

''میں کوئی احسان تھوڑا کرتی ہوں، تو میرا باپ ہے، یہ میرا بھی تو گھر ہے۔'' اس نے چاچے کے بکھرے ہوئے بال محبت سے ایک طرف کر دیئے، چاچے کی طرف دیکھ اس کا بھی دل بھر آیا تھا۔

''تجھے بھیج کر میں کیسے رہوں گا اس گھر میں اکیلا۔'' چاچے نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے گلے سے لگا لیا تو لاجو بھی تڑپ کر اس کے گلے سے جا لگی، باپ کی محبت کا کوئی بدل نہیں ہوتا۔

''تیرے بعد کون میرا خیال کرے گا۔'' جھریئوں سے اٹے چہرے پر پانی کی نمی ٹھہر گئی تھی، لاجو نے آج پہلی دفعہ چاچے کو اس حالت میں دیکھا تھا اور اک لمحے کے لئے اسے لگا کہ میں نہ ہوں تو چاچے کا خیال کون رکھے گا، دل جیسے مٹھی میں آ گیا، ماں باپ اپنی بیٹیوں کے لئے کیا نہیں کرتے مگر وہ بدلے میں کیا دیتی ہیں۔

''جدائی۔''

''تجھے کس نے کہا ہے چاچا کہ میں تجھے چھوڑ کر جاؤں گی تو بھیجے گا تو بھی نہیں جاؤں گی، ہاں۔'' وہ اس کے گلے سے لگی خود بھی رونے لگی۔

☆☆☆

پساری میں کام کرتے ہوئے بھی بار بار اس کا دماغ افضل کی طرف جا رہا تھا، آج پھر حویلی میں آتے اسے وہ نظر آ گیا تھا وہ اپنی ماں کے ساتھ کسی بات پر الجھ رہا تھا، اس لڑکے کو بھی ہر وقت غصہ چڑھا رہتا ہے۔

''جو بھی ہے وہ تیرا باپ ہے۔'' نمبردارنی کہہ رہی تھی، وہ کاٹن کی سفید کلف لگی شلوار قمیض پہنے غصے سے بھرا کتنا سوہنا لگ رہا تھا۔

''ان کے کاموں کی وجہ سے باہر جاتے مجھے شرمندگی ہوتی ہے، لوگ منہ پر نہیں پر پیچھے باتیں کرتے ہیں۔'' نمبردارنی نے اس کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا جسے اس نے غصے سے جھٹک دیا تھا۔

''نہ میرا پتر ایسے نہیں کہتے۔'' ماں کی بات پر اس نے غصے سے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا جہاں ولایت بھر جائی مرغیوں کے ڈربے میں بیگاں سے پانی رکھوا رہی تھی۔

''اتنا غصہ نہ کیا کر، تیری گھر والی کیسے گزارہ کرے گی تیرے ساتھ، غصہ ہر وقت ناک پر دھرا رہتا ہے۔'' بھر جائی کی بات سن کر بھی اس کا غصہ کم نہ ہوا ہاں نمبردارنی کے ہونٹوں پر ہنسی آ گئی۔

''ہوں، کیسے گزارہ نہیں کرے گی، اتنا سوہنا میرا پتر ہے۔'' نمبردارنی نے آگے بڑھ کر اسے اپنے پاس چارپائی پر بیٹھا لیا۔

''چاچی میں سوہنے کی نہیں اس کے غصے کی بات کر رہی ہوں، کبھی پیار سے بولتا ہی نہیں۔'' زلیخا افضل کے چاچے کی بیٹی تھی اسی لئے وہ اس کے ساتھ ہنسی مذاق کر لیتی تھی، ریحانہ اور ولایت برادری میں سے تھیں اس لئے دونوں اس طرح

کھل کر بات نہیں کرتی تھیں اور اوپر سے اس کی عادت بھی ایسی تھی کہ گلا بندہ بڑا سوچ سمجھ کر بات کرتا تھا۔

''میں اپنے پتر کے لئے لاؤں گی ہی ایسی جو اس کے غصے سے پیار کرے۔'' نمبردارنی کی بات پر افضل کے ماتھے کے بلوں میں اپنے آپ کمی آگئی، نمبردارنی نے اسے پیار سے گلے لگا لیا وہ ان کا سب سے چھوٹا اور لاڈلا بیٹا تھا۔

''چاچی اس سے بھی پوچھ لو، کیا پتہ اس نے خود ہی کوئی دیکھ رکھی ہو۔'' وہاں موجود ساری ہی عورتیں ہنسنے لگیں سوائے لچھی کے۔

''ایسا کیوں ہوا۔'' وہ خود سے سوال کرنے لگی، میں افضل کے بارے میں ایسا کیوں سوچنے لگی ہوں، کیا میرا دل؟ اس نے چونکتے ہوئے ڈر کر اپنے اردگرد دیکھا جیسے اس کے دل کی کہی ہوئی بات کسی نے سن تو نہیں لی، زمین پر بیٹھتے ہوئے اس نے ڈر کر آنکھیں بند کرلیں اور جب کھولیں تو اسے لگا جیسے پیاری کے اوپر سیاہ رنگ کا بڑا سا شہتیر اس کے اوپر ہی آن گرا ہے، دل سے نکلتی بات اسے سچ ہوتی نظر آرہی تھی اور اسی سچ میں نمبردار کا خوف ناک چہرہ کسی سیاہ ناگ کی طرح پھنکارے مارتا ڈسنے کو آگے بڑھ رہا تھا، سینے میں مچلتا دل جیسے دبک کر بیٹھ گیا، افضل، افضل الٰہی کا بیٹا ہے، اسے جیسے خود سے گھن سی آئی۔

وہ ڈری سہمی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور باہر ویڑے میں چلی جہاں سے سب لوگ جا چکے تھے، نمبردار اس وقت گھر سے باہر ہوتا ہے، سینے میں دبک کر بیٹھا دل جیسے پھر سے اٹھ کھڑا ہوا اور افضل کو دیکھنے کے لئے مچلنے لگا، وہ ڈری ڈری سی اس کے کمرے کے پاس آئی، یہ سینے میں مچلتے کیسے جذبات تھے جن میں ڈر بھی تھا اور اس طرف بڑھنے کی چاہ بھی۔

اس نے کھڑکی کے رستے اندر جھانکا آگے اتفاق سے وہ کھڑکی کی طرف ہی دیکھ رہا تھا، لچھی اس کی نظریں اپنی طرف پا کر جلدی سے پیچھے کو ہٹ گئی مگر پھر افضل کی آواز پر اس کے پیر جہاں تھے وہیں جم گئے، وہ باہر آگیا اور بڑے درشت لہجے میں بولا۔

''کیا بات ہے یوں کمرے میں کیوں جھانک رہی تھی۔'' لچھی سے کچھ بھی بولا نہیں جا رہا تھا، زبان جیسے تالو سے جا چپکی تھی، وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بس اسے دیکھی جارہی تھی۔

''بولتی نہیں، گونگی ہو۔'' افضل کو اس کا یوں جھانکنا سخت برا لگا تھا، بغیر مقصد کے یہ کون سا طریقہ ہے

''وہ......وہ......جی۔'' لچھی تو حواس باختہ سی مجرم بنی کھڑی تھی اتنی دیر میں نمبردار جانے کس کام سے اندر آگیا، ان دونوں کو دیکھ وہیں رک گیا، افضل کے بتانے پر اس نے بڑی گہری نظر سے لچھی کو دیکھا، منجھا ہوا کھلاڑی تھا وہ، افضل کو ٹھنڈا کرنے کے بعد اس نے لچھی کو بھی وہاں سے بھیج دیا پھر بڑے پرسوچ انداز میں وہ اپنے کمرے میں آگیا آگے نمبردارنی پلنگ پر بیٹھی تھی۔

''آپ اس وقت۔'' وہ حیران ہوئی، ورنہ وہ اس وقت باہر ہی ہوتا تھا۔

''کچھ نہیں، جاؤ میں نے لیٹنا ہے۔'' غصے سے اس کی رگیں تنی ہوئی تھیں، لچھی کے رویے نے اسے پریشان کر دیا تھا، نمبردارنی اس کا غصہ دیکھتے ہوئے کچھ بھی بولے بغیر وہاں سے جانے لگی تو وہ پیچھے سے بولا۔

''لچھی کے ہاتھ لسی کا ٹھنڈا گلاس بھیجو۔'' لسی تو بہانہ تھی اسے اندر بلانے کا، جسے لچھی بھی سمجھ گئی تھی اس لئے خود کو اس کے سوالوں کے

لئے تیار کرتی وہ لسی کا ٹھنڈا گلاس پکڑے اندر آ گئی، نمبردار غصے سے بھرا بیٹھا تھا، کچھی اس کے علاوہ کسی اور کے بارے میں (چاہے وہ اس کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو) سوچے، یہ اسے منظور نہیں تھا اس نے کچھی کی خاطر شمشاد کی گلیاں چھوڑ دی تھیں کچھی پر صرف اس کا حق تھا اور اس حق کو پانے کے لئے وہ کچھی کو ہر طرح خوش رکھتا تھا، روپیہ پیسہ، اس نے کچھی کو سر سے لے کر پیروں تک دیکھا، وہ اس کے دیکھنے پر اندر تک کانپ گئی۔

''میں بوڑھا ضرور ہوں مگر میں نے کبھی تمہیں اس بڑھاپے کا احساس نہیں ہونے دیا، ہمیشہ تجھے جوانوں سے زیادہ پیار دیا ہے، پھر۔'' وہ غصے میں بولتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تو کچھی ڈر کر دو قدم پیچھے کو ہٹ گئی۔

کچھی آتے آتے دروازہ بند کر آئی تھی اس لئے وہ بے خوف ہو کر غصہ نکالنے لگا۔

''ہوا کیا ہے میں نے تو کچھ نہیں کیا۔'' وہ سہمی سی بولی۔

''افضل میرا پتر ہے اور تو میری جتی (جوتی) کے نیچے پڑا ہوا وہ گندا کیڑا ہے جسے میں جس وقت مرضی مسل سکتا ہوں، اس لئے اپنی آنکھوں میں پیدا ہونے والے سفنوں کو اپنے ہاتھوں ہی مٹی میں دفن کر دے ورنہ۔''

''تو ایویں اتنا غصہ کھا رہا ہے، بھلا میں ایسا سوچ سکتی ہوں۔'' وہ ہاتھ جوڑتے اس کے سامنے کھڑی تھی، نمبردار کا غصہ قابو میں نہیں آ رہا تھا ''اس وقت کسی کام کے لئے میں اندر نہ آتا تو۔'' اس نے پھر غصے سے کچھی کی طرف دیکھا۔

''میں نے تیرا نمک کھایا ہے، میں کیوں تجھے دغا دوں گی۔'' کچھی نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے یہ فقرہ بولا تھا۔

''میں تو تیرے ساتھ پیار کرتی ہوں، اپنا سب کچھ تو تجھے دے چکی ہوں، اب کسی کو میں نے کیا دینا ہے، تو بتا بھلا کچھ بچا ہے میرے پاس۔'' اس نے مصنوعی ہنستے ہوئے نمبردار کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی جس میں وہ کامیاب بھی ہو گئی تھی۔

''مجھے تیرے اوپر یقین نہیں ہے پر میں پھر بھی یقین کرتا ہوں، کسی اور کو دل میں لانے کا سوچنا بھی نہ چاہے وہ میرا پتر ہی کیوں نہ ہو، چل جا اب یہاں سے۔'' نمبردار نے بڑے غصے سے اسے سمجھاتے ہوئے باہر جانے کے لئے کہا، لسی ایک طرف کو پڑی گرم ہو رہی تھی۔

کچھی واپس پساری میں آ گئی، اس کا سارا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا، اس وقت تو اس نے خود کو بچا لیا تھا تو کیا آگے وہ ایسا کر پائے گی۔

☆☆☆

چاچا پا لطیف کے ساتھ ایک دفعہ پھر اسی بنجارن کی کٹیا میں موجود تھا۔

''سر والے ہی سر کو پہچان سکتے ہیں۔'' خورشید پیڑی پر بیٹھی تھی، چاچا اور پا لطیف بامشکل اس ٹوٹی ہوئی بان کی چارپائی پر بیٹھے تھے جو اس کٹیا کی واحد چارپائی تھی، چاچے کی بات پر خورشید نے نظریں اوپر اٹھائیں، خورشید کا باپ چارپائی کے بالکل سامنے زمین پر پیروں پر وزن ڈالے بیٹھا تھا۔

''ہم تو غریب لوگ ہیں ہمارے پاس سوائے سر کے اور کیا ہے، کچھ بھی نہیں۔'' کمزور لاغر غریب بنجارہ، ماں بھی ساتھ ہی تھی۔

''سر والے سب سے زیادہ دھنی ہوتے ہیں کیونکہ دل کی دولت ہر کسی کے پاس نہیں ہوتی۔'' چاچے سے زیادہ سر والوں کی قدر کون کر سکتا تھا، خورشید چپ چاپ بیٹھی تھی، نہ بول رہی تھی اور نہ سن رہی تھی۔

''یہ تو ہم اور آپ جیسے لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں ورنہ یہ سر آج کل دو وقت کی روٹی بھی نہیں کھلا سکتا۔'' معاشرے کی بے قدری کی وہ زندہ مثال تھے، تھیٹر اور میلوں پر گانا، اب کون سنتا تھا ایسے لوگوں کو۔

ہمارے معاشرے میں یہ واحد ایسا ذریعہ معاش ہے جسے عزت کی نگاہ سے دیکھا نہیں جاتا اس لئے اب اس کی قدر بھی کم ہوگئی ہے۔

پالطیف بہت غور سے خورشید کا چہرہ دیکھ رہا تھا، اس کی آنکھوں میں عجیب سی زردی چھائی تھی اداس، اداس، ویران سی۔

''تو بھی تو کچھ بول پتر۔'' چاچے کی بات پر اس کے ہونٹوں پر بڑی بے کیف سی مسکراہٹ آ کر دم توڑ گئی، آنکھوں میں نامعلوم سی نمی لئے اس نے نظریں نیچے کو جھکا دیں پالطیف کو اس کا یہ انداز جانے کیوں بھایا تھا، موسم خزاں کی ڈھلتی سہ پہر میں گائی جانے والی بریا راگنی ''ملتانی'' کی جیتی جاگتی تصویر لگی تھی وہ۔

''مجھے تو تیرے سر ادھر کھینچ لائے، میں تو اپنی دھی لاجو سے بھی تیری گل کر رہا تھا کہ ایسا گاتی ہے کہ بندہ روح تک راضی ہو جاتا ہے، اس کے گلے میں تو فرشتے بولتے ہیں۔'' چاچے کی بات پر پھر وہی بے کیف سی مسکراہٹ آئی اور چلی گئی۔

''بس جی یہ اس کی نانی کی محنت کا صلہ ہے جو یہ ایسا گاتی ہے۔'' اب کے جواب اس کی ماں نے دیا تھا جو خورشید کی طرف دیکھ رہی تھی جو بڑی بجھی بجھی سی لگ رہی تھی، سب بڑے اداس اور پر ملال سے بیٹھے تھے، پالطیف کے ساتھ ساتھ چاچے نے بھی محسوس کیا پر بولا کچھ نہیں۔

''نانی کہاں ہوتی ہے اس کی۔'' چاچے کی بات پر خورشید کے چہرے پر پھیلی اداسی مزید گہری ہوگئی مگر اس کے باپ نے بڑے غصے سے اس کی ماں کی طرف دیکھا تھا جیسے وہ اس کی نانی کا ذکر نہ چاہ رہا ہو، ماں جیسے باپ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس کے بارے میں بتانے لگی۔

''سیالکوٹ کے پاس ہمارا پنڈ ہے اس نے زیادہ وقت اپنی نانی کے ساتھ ہی گزارہ ہے، وہ خود بھی بہت اچھا گاتی ہیں۔'' چاچے نے سراہنے والے انداز میں سر ہلایا۔

گھر آ کر چاچا کتنی دیر لاجو سے اس کی باتیں کرتا رہا۔

☆☆☆

نمبردار نے اپنے کامے بدر کے ہاتھ چار گلاس لسی کے منگوائے تھے، بیٹھک میں، چھمی نے ''اوے'' کہہ کر اسے بلایا اور چار گلاس لسی کے ٹرے میں رکھ کر پکڑا دیئے، بدر کامے کو اس کا ''اوے'' کہہ کر بلانا پسند نہ آیا تھا اس لئے وہ بات کرنے کے لئے ٹرے پکڑے کھڑا ہو گیا۔

''میں کاما ہوں تو، تو بھی نمبردار کی کامی ہے بس ذرا کام میں فرق ہے۔'' بدر کی بات سن کر چھمی شرم سے پسینے میں نہا گئی۔

''فرق۔'' وہ نمبردار کا خاص راز دار بھی تھا اس کے سارے کاموں سے واقف تھا اور چھمی نمبردار کے لئے کون سا کام کرتی تھی وہ سب جانتا تھا۔

''میں اپنی وفاداری سے اسے خوش کرتا ہوں اور تو......'' بات پوری کرنے سے پہلے وہ کچھ سوچ کر رک گیا۔

''اتنی تو سمجھ دار ہو تم۔'' اک قہر آلود نظر اس پر ڈالتا وہ پیاری سے باہر نکل گیا اور چھمی چپ کم گھڑی سنتی رہی اور پھر بنتو کے آ جانے پر دوپٹے سے پسینہ صاف کرتی کسی کام میں لگ گئی۔

''چھمی!'' بنتو بولی۔

"یہ لسی کا گلاس بیٹھک میں پکڑا آنا۔"

"ابھی تو چار گلاس بھیجے ہیں۔"

"تو ایک اور لے جا، انہوں نے مانگا ہے۔" وہ اپنے کام میں مگن سی بولی تو وہ جو بدر کی باتوں سے دلبرداشتہ سی ہو گئی تھی پھر بیٹھک میں جانے کے خیال سے الٹے سیدھے منہ بنانے لگی پر مجبوری تھی، گلاس پکڑے اس نے بیٹھک کے دروازے پر آواز لگائی، بیٹھک کا دروازہ بند تھا مگر آواز سن کر کھل گیا، منشی اکبر آنکھوں میں حیرت لئے اس کی طرف دیکھنے لگا، پچھی بھی اسے دیکھ سٹپٹا سی گئی تھی، ہاتھ میں پکڑا گلاس یونہی ہاتھوں میں پکڑے وہ اس کے قریب سے اٹھنے والی خوشبو میں الجھ گئی تھی جو اس کے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔

"یہ خوشبو میں نے......" وہ نظریں نیچی کیے سوچنے لگی تبھی اس نے گلاس پکڑنے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ اپنی بے وقوفی پر شرمندہ سی اسے گلاس پکڑا کر واپس مڑ آئی۔

"میں بھی کتنی سودائن ہوں گلاس ہاتھ میں ہی پکڑے رکھا۔" اس نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے اپنے حواس پر ماتم کیا۔

"پر یہ کیسی خوشبو ہے، مجھے کیوں لگتا ہے کہ میں نے پہلے بھی اس خوشبو کو کہیں محسوس کیا ہے۔" یونہی اپنی سوچوں میں گم وہ واپس پساری میں آ گئی۔

☆☆☆

"کتنے دن ہو چلے ہیں افضل سے ملے ہوئے۔" چارپائی کھڑی کر کے وہ اس پر نالا بن رہی تھی، نالا تنے بھی کتنے دن ہو گئے تھے مگر وہ پورا ہی نہیں ہو رہا تھا، اب بھی افضل کو یاد کرتے ہوئے اس کے ہاتھ اپنے آپ ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

وہ کانا ہاتھ میں پکڑے منہ بسورے باہر جامن کے پیڑ پر بیٹھے پرندوں کو دیکھنے لگی۔

"تیرے بغیر کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔" اس نے افضل کے خیال کو آواز دی، کتنا پیار آیا تھا اسے افضل کے خیال پر، گرم دوپہر میں ٹھنڈا خیال، گرم تپتی دوپہر میں جو دل کو سکون دے تم وہ خیال ہو، اپنے آپ سے شرماتی وہ کانوں کو مٹی کے مٹکے میں رکھنے لگی اور بھیم پلاسی میں کچھ گنگنانے لگی، خاموش گھر میں گونجتے بھیم پلاسی کے سر، اک سماں سا باندھنے لگا تھا۔

جامن کے پتے کبھی کبھی آنے والی ہوا کے ساتھ ہولے ہولے آنکھیں موند مانو جھولے پر بیٹھے جھولا جھول رہے تھے، شاخوں پر بیٹھے کوے خاموش بیٹھے خود کو اسی جھولے پر بیٹھے پا رہے تھے۔

صاف ستھرے ویڑے (صحن) میں ہر چیز بڑے سلیقے سے رکھی گئی تھی، گھر بے شک کچا تھا مگر صفائی ستھرائی کا تعلق کچے یا پکے سے نہیں ہوتا یہ بات تو اپنی اپنی فطرت پر ختم ہوتی ہے۔

باہر دروازے کے ساتھ بنی کچی سیڑھیاں چھت کی طرف جاتی تھیں جن پر پڑتی جامن کے پتوں سے چھن کر آتی دھوپ بہت سارے پھل بوٹے بنا رہی تھی۔

نالا بننے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا اس لئے وہ یونہی گنگناتی اٹھ کر ویڑے میں چلی آئی اور جامن کی چھاؤں میں بچھی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

دن کے ڈیڑھ دو کا وقت تھا، ہوا کے کبھی کبھی آنے والے جھونکے بے شک گرم تھے مگر پھر بھی اسے اچھے لگ رہے تھے کیونکہ گرم اور سردی محسوس کرنے والا دل جو وہاں موجود نہیں تھا وہ تو افضل کی حویلی کے آس پاس سے چکر کاٹ رہا تھا۔

دل واراں تینھوں او میرے ڈھول سپاہیا

وہ یونہی گنگناتی چارپائی پر لیٹ گئی، پھر اٹھ کر ویڑے میں پھیرنے لگی، دل اک جگہ ٹکنے ہی نہیں دے رہا تھا۔

ہوا پہلے سے کچھ تیز چلنے لگی تھی، اس کا بھی پتہ نہیں چلتا اس نے دل میں سوچا، کبھی ایسے چپ ہو جاتی ہے جیسے کوئی نئی نویلی دلہن اپنے پیا سے روٹھی ہو اور کبھی اس کے مزاج میں اتنی شوخی آ جاتی ہے جیسے اس سے مل کر آئی ہے بھاگتی دوڑتی، کبھی ہاتھ نہ آنے والی۔

وہ پھر چارپائی پر لیٹ گئی، پتوں سے چھن کر آتی دھوپ اس پر بھی گرتی نقش بنانے مٹانے لگی، ابھی اسے وہاں لیٹے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ چاچے کی آواز پر اٹھ کر بیٹھ گئی، چاچا باہر کھڑا کنڈی کھٹکھٹانے کی بجائے اس کا نام لے کر اسے بلا رہا تھا، وہ اس وقت اپنی اس خوبصورت تنہائی میں کسی کی سانجھ پسند نہیں کر رہی تھی اس لئے بڑی بد دلی سی اٹھ کر دروازے تک آئی اور ہاتھ اوپر کر کے کنڈی کھول دی۔

''تیری خیر ہووے۔'' چاچا دروازے سے اندر آتا بولا اور پھر اپنے پیچھے کھڑے لوگوں کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

''آ جا پتر، آ جا، لاجو دیکھ میں کسے لایا ہوں۔'' چاچا بڑا خوش خوش سا اندر آ گیا اور پھر چاچے کے پیچھے ایک لڑکا اور ایک لڑکی بھی اندر آ گئے، وہ دونوں اپنے پہناوے سے اس پنڈ کے نہیں لگ رہے تھے اور نہ اس نے انہیں پہلے دیکھا تھا اس لئے وہ اپنی نظروں میں اک اجنبی پن لئے اک طرف کھڑی رہی۔

''آ...... جاؤ۔'' چاچے نے انہیں ویڑے میں بچھی چارپائی کی طرف بلایا اور بیٹھنے کو کہا وہ دونوں جو شکلوں سے بہن بھائی لگ رہے تھے اپنے پیروں کو ہولی ہولی اٹھاتے چارپائی تک آ گئے۔

''چاچا یہ کون ہیں؟'' وہ چاچے کا ہاتھ پکڑے ایک طرف کو لے گئی، وہ اپنے خیالوں میں بڑے مزے سے لیٹی تھی، چاچا جانے کن کو اٹھا لایا تھا اسے جیسے ان کا اس وقت اس کی تنہائی میں خلل ڈالنا اچھا نہ لگا اس لئے وہ بڑے ناراض لہجے میں پوچھ بیٹھی۔

''نہ میرا پتر مہمانوں کے بارے میں ایسا نہیں کہتے، یہ تو خدا کا روپ ہوتے ہیں اور ویسے بھی میں ان کو اپنی مرضی سے لایا ہوں۔'' چاچا پھر ان کی طرف آ گیا۔

''یہ وہی کڑی ہے جس کی میں نے تم سے بات کی تھی، جو اس دن ملتانی خیال گا رہی تھی۔''

''اچھا۔'' لاجو ساری باتیں بھولے حیرت سے خود بھی چلتی ان کے پاس آ گئی۔

وہ لڑکی نظریں نیچے کیے نہ ہنس رہی تھی نہ کچھ بولی تھی البتہ اس کے ساتھ بیٹھا اس کا بھائی (بعد میں چاچے نے بتایا) چاچے کی بات پر ہنس رہا تھا جیسے چاچے نے اس کی تعریف کی ہو۔

''یہ جتنا سوہنا گاتی ہے اتنا چپ رہتی ہے۔'' چاچے کا اتنا کہنا تھا کہ چھل چھل کرتے آنسو اس لڑکی کے گالوں پر بہہ نکلے، سب کے ساتھ ساتھ لاجو بھی پریشان ہو گئی اور آگے بڑھ کر اس لڑکی کے پاس آ بیٹھی۔

''کیا بات ہے؟'' بھائی اس کا خاموش بیٹھا تھا پھر لاجو کے قریب آ جانے پر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''پتر کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا تو، تو گاتی ہی اتنا اچھا ہے کہ بار بار تیری تعریف کرنے کو دل چاہتا ہے۔'' لاجو نے اسے کندھوں سے پکڑ رکھا تھا اور اسے چپ ہونے کا کہہ رہی تھی۔

''اچھا چل معاف کر دے تیرے ماں باپ

کو پتہ چلا تو مجھے کیا کیا نہ کہیں گے، ایک تو ہماری بیٹی کو گھر لے گیا اوپر سے رلا بھی دیا ہے۔"
چاچے کے ہاتھ جوڑنے پر وہ تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نہ......نہ......باپ بچوں سے معافی مانگتا سوہنا نہیں لگتا۔" اس نے چاچے کے بندھے ہوئے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔

"شاباش پتر۔" چاچے نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

اس کا بھائی دوبارہ آنے کا کہہ کر چلا گیا تو لاجو گرمی کا سوچتے ہوئے اندر لے آئی۔

"اندر آجاؤ۔" وہ دونوں کوٹھڑیوں میں سے ایک میں اسے لے آئی کوٹھڑیوں تک دھوپ کی سنہری شعاعیں نہیں آپا رہی تھیں اس لئے اک ٹھنڈک کا احساس سا ہونے لگا تھا وہ اسے بڑولے کے پاس رکھے موڑھے پر بیٹھا کر خود اچار والی چاٹی کے پاس بیٹھ گئی اچار کی خوشبو پر ناک چڑھی تھی۔

"باہر گرمی تھی، ادھر ٹھنڈ ہے۔"

"مجھے تو ویسے بھی اندھیرا پسند ہے۔" وہ پہلی دفعہ لاجو سے بولی۔

"یہ اندرا ٹھے طوفان کو اپنے سیاہ رنگ میں چھپا کر لوگوں کی نظروں سے بچا لیتا ہے۔" وہ اندھیرے پر اک نظر ڈالتے ہوئے نظریں جھکا گئی تو لاجو اس کی بات کی گہرائی کو نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

"تم روئی کیوں؟"

"لیکھ میں جو لکھا ہے رونا۔" وہ خود بھی موڑھے سے اتر کر بڑولے کے ساتھ کمر ٹکا کر نیچے کچی زمین پر بیٹھ گئی اور کچی زمین پر انگلی سے کچھ لکیریں سی کھینچنے لگی۔

"نیچے کیوں آ گئی؟" لاجو کی بات پر اس نے سر اوپر اٹھایا۔

"زمین پر رہنے والوں کو اونچائی کے سفنے مار ڈالتے ہیں۔" اس کی بات سن لاجو کے لو کنڈے (رونگٹے) کھڑے ہو گئے۔

"یہ بات کیا اس نے اسے کہی تھی۔" اس نے اپنے ماتھے پر آئے پسینے کو ہاتھ سے صاف کیا۔

وہ جو پہلے اس گرم دوپہر کو افضل کے ٹھنڈے خیال سے گزار رہی تھی یکدم اس لڑکی کی بات نے جیسے گرم گرم پانی کے چھینٹے اس کے منہ پر دے مارے تھے، اونچائی کے سفنے تو وہ بھی دیکھ بیٹھی تھی تو کیا اونچائی سے گرنا مقدر تھا، وہ کانپ کر رہ گئی۔

پھر وہ اکثر چاچے کے ساتھ ادھر آنے لگی، وہ بہت کم بولتی تھی یا پھر چاچے کے کہنے پر کچھ گنگنانے لگتی لیکن لاجو کے ذہن میں جو بات اس نے ڈالی تھی وہ اسے پریشان ضرور کرتی۔

☆☆☆

"تو بھی اپنے اوپر کچھ دھیان دیا کر، جیسا تیرا رنگ ڈھنگ ہے تیرا رشتہ نہیں ہوگا کبھی۔" پھپھی کی بات پر چلتے چلتے بنتو نے اس کی طرف دیکھا۔

"میری طرف دیکھ، کوئی میری طرف دیکھ کر یہ نئی کہہ سکتا کہ میرا بیاہ بھی ہو چکا ہے اور ہو کر ٹوٹ بھی چکا ہے۔" بنتو نے اس کے چہرے پر پھیلی لالیوں کو دیکھا اور دل میں سراہا، ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی وہ، وہ کہیں سے بھی بیوہ نہیں لگتی تھی، حسن جوانی ہر چیز اس کے پاس تھی، تیکھی والی ناک غرور سے اور بھی ہو گئی تھی، بنتو کو اپنے سیاہ رنگ پر جیسے ڈھیروں ترس سا آیا۔

"تیرا میرا کوئی مقابلہ ہے بھلا اور نہ ہوگا رشتہ، بیاہ ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔" اس نے جیسے

اپنے سیاہ رنگ کا دفاع کیا۔

"تجھے کیا پتہ بیاہ کیا ہوتا ہے۔" وہ زور سے ہنسی تو ان دونوں کے پاس سے گزرتے منشی اکبر نے بہت غور سے چھی کی اس ہنسی کو سنا اور محسوس کیا تھا، اس کی تھلی کی لشک اس کی آنکھوں کو چندھیا گئی تھی، چھی نے اپنی باتوں میں اس کی طرف دھیان نہیں دیا تھا ہاں بنتو نے اسے ہولے بولنے کے لئے کہا تھا اور منشی کی طرف اشارہ کیا، چھی نے پلٹ کر ہنستے ہوئے اس کی طرف دیکھا دیکھنا کیا تھا منشی تو جیسے راہ چلتا راہ بھول گیا، وہ دونوں آگے بڑھ گئی تھیں مگر منشی کے کانوں میں کتنی دیر تک اس کا ہنسنا گونجتا رہا۔

☆☆☆

دروازہ ہولے سے کھولتی اندر آگئی، کمرے میں کوئی نہیں تھا ہاں غسل خانے سے پانی گرنے کی آوازیں آرہی تھیں، وہ نہا رہا تھا، چائے کا کپ اس کے ہاتھ میں تھا، آج اس نے شکر کیا تھا کہ نمبردار گھر پر نہیں تھا، وہ شہر گیا تھا، بنتو چائے لانے لگی تھی افضل کے لئے مگر اس نے دل کے ہاتھوں مجبور خود پکڑلی کہ میں دے آتی ہوں، اس کے دل نے اپنی مرضی کرلی تھی، اندر سے وہ بری طرح ڈری ہوئی تھی، نمبردار کا غصے سے بھرا چہرہ بھی اس کے سامنے آرہا تھا پر پتہ نہیں کیوں افضل کا وہ سوہنا مکھڑا اس غصے سے بھرے چہرے پر حاوی ہونے لگا تھا۔

نمبردار کو تو اس نے یہ کہہ کر ٹھنڈا کر دیا تھا کہ میرے پاس بچا ہی کیا ہے لیکن وہ باتیں بس باتیں ہی ثابت ہو رہی تھیں، ان میں کوئی حقیقت نہیں تھی ایسا اس نے صرف نمبردار کے غصے کی وجہ سے کہا تھا، ڈرتی تھی وہ اس سے، لیکن اب جانے وہ غصہ کہاں چلا گیا تھا۔

کر بھی تھوڑی دیر پہلے کمرے کی صفائی کر کے گئی تھی اس لئے وہ چمک رہا تھا۔

حالانکہ وہ جانتی تھی اس کا غصہ پر وہ پھر بھی اسے اچھا لگتا تھا، وہ کم ہی اس کے کمرے میں آتی تھی اس لئے اس کے کمرے کو بہت دھیان سے دیکھ رہی تھی جس طرح وہ سارے گھر والوں سے الگ تھا اسی طرح اس کا کمرہ بھی جدا جدا سا تھا، شہر میں رہنے کی وجہ سے اس نے غسل خانہ کمرے کے اندر ہی بنوایا تھا اور کمرے کو سجایا بھی شہری انداز میں تھا، پیروں کے نیچے نرم نرم گدا (کارپٹ) اسے گدگدانے لگا۔

غسل خانے کا دروازہ کھلا اور وہ باہر نکل آیا تولیہ کندھوں پر ڈالے وہ اپنے دھیان میں تھا اس لئے کسی کی موجودگی کو محسوس نہ کیا، بالوں میں کنگھی کرنے کے بعد اس نے تولیہ پلنگ پر پھینک دیا اور اپنی قمیض پہننے لگا، چھی تو دم سادھے رہ گئی، چوڑا چکلا سینہ جس پر سیاہ بالوں نے اس کے اندر کے جذبات کو ابھار دیا تھا۔

نمبردار عمر میں اس کے باپ سے بھی زیادہ بڑا تھا، پیسے کی لالچ اور اپنی ہوس میں وہ اتنی آگے نکل گئی کہ عمروں کی سرحدیں بھی اسے نظر نہ آئیں، لیکن اس بات کا اسے شدت سے احساس ہوتا تھا اور افضل کو دیکھ یہ احساس بار بار شدت اختیار کر جاتا اور اسے نمبردار کا بھی خوف نہ رہتا، وہ خاموشی سے اس قیامت کو دیکھتی رہی، اس کے مضبوط و توانا شانے اس کے بازو اسے لگا جیسے وہ اس کے گھیرے میں تنگ ہوتی جا رہی ہے اس نے کسی احساس میں ڈوبے آنکھیں موند لیں، قمیض پہننے کے بعد وہ مڑا تو اسے سامنے پا کر وہ حیران سا اس کا منہ دیکھنے لگا۔

"کوئی کام تھا؟" اسے یوں اس کا کمرے میں آنا اچھا نہ لگا۔

"چائے۔" وہ جلدی سے اپنی اصلی حالت

میں واپس آگئی۔

''چائے تو میں نے بنتو سے مانگی تھی۔'' اسے غصہ آیا۔

''بنتو کو بھیجو جلدی سے۔'' افضل کا غصہ دیکھ وہ جلدی سے واپس مڑ گئی اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ بنتو کے ساتھ کمرے میں تھی۔

''چائے میں نے کس سے مانگی تھی۔'' وہ بنتو کی طرف دیکھ کر زور سے بولا، لچھی اپنی جگہ کانپ گئی، کتنا غصہ کر رہا تھا۔

''میرے سے سرکار۔'' وہ ہاتھ جوڑے کانپتی ہوئی بولی، وہ اس کا غصہ اچھی طرح جانتی تھی، چاہے نوکری سے ہی نکال دے، اس نے چائے کا کپ پکڑا اور زمین پر دے مارا۔

''معافی دے دو سرکار، غلطی ہوگئی، میں نے بنائی تھی اور میں لا بھی رہی تھی پر لچھی کہنے لگی میں دے آتی ہوں، میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا سرکار، مجھے نوکری سے نہ نکالنا۔'' وہ رونے لگی تو افضل نے ہاتھ کے اشارے سے اسے باہر جانے کو کہا تو وہ اٹھ رو صاف کرتی جلدی سے باہر نکل گئی، افضل چلتا ہوا لچھی کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

''تجھے میں نے اس دن بھی منع کیا تھا۔'' پتہ نہیں کیا بات تھی افضل کو وہ ایک آنکھ بھی نہ بھاتی اس کی آنکھوں میں ڈولتی کمینگی اس کو تپ چڑھا دیتی، کیسی لڑکی تھی وہ، مردوں کو اپنی طرف اکسانے والی، اس لئے نا چاہتے ہوئے بھی وہ اس ڈپٹتا رہتا۔

مونچھوں کے نیچے چھپے ہونٹوں کو غصے سے کاٹتا وہ لچھی کو کتنا سوہنا لگ رہا تھا، لچھی تو اک لحظے کے لئے اس کا غصہ بھول گئی، اتنا پاس آگیا تھا، وہ بے چین سی ہوگئی، وہ اس کے بدن سے اٹھتی جوانی کی مہک محسوس کرتے ہوئے مدہوش ہونے لگی، وہ غصے میں تھا اس کے باوجود وہ اسے یوں لگ رہی تھی جیسے وہ بڑی محبت سے بات کر رہا ہو اور افضل کو اس کا یہ نڈر انداز غصہ دلا رہا تھا۔

''نکلو یہاں سے باہر۔'' ناگواری سے بولتا وہ پیچھے ہٹ گیا، اس کی نظریں کیا کیا نہ کہہ رہی تھیں۔

''کیا ہوا افضل پتر۔'' نمبردارنی بنتو کے بتانے پر دوڑتی ہوئی اس کے کمرے میں چلی آئیں۔

''کچھ نہیں۔'' غصے سے وہ تنا ہوا تھا۔

''جاؤ یہاں سے۔'' وہ دھاڑا تو لچھی جلدی سے باہر نکل گئی۔

''کیا ہوا ہے؟'' وہ پھر بولیں، پھر افضل نے انہیں سب کچھ بتایا تو وہ بغیر بولے کمرے سے باہر نکل گئی۔

''افضل کو یہ سب اچھا نہیں لگتا، تم لوگ سمجھتی کیوں نہیں۔''

''وہ جی میں ویلی تھی اس لئے میں نے کہا۔'' وہ بڑی مریل سی آواز میں بولی۔

''پر اسے ایسی باتیں پسند نہیں ہیں، آگے سے دھیان رکھنا۔'' نمبردارنی ایک سیدھی سادھی عورت، وہ لچھی کے مکروفریب کو سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ باپ کے ساتھ ساتھ اس کے بیٹے پر بھی ہاتھ صاف کرنا چاہ رہی تھی۔

☆☆☆

ابھی وہ تھوڑی دیر پہلے نمبردار کے کمرے میں اسے روٹی دے کر آئی تھی آگے وہ بڑا اکھڑا اکھڑا سا تھا اس نے زیادہ بات نہیں کی تھی اور یہی بات اسے کھٹک رہی تھی، ایسا تو کبھی نہیں ہوا، کام کرتے ہوئے بھی اس کا ذہن اپنی الجھنوں میں الجھا رہا اور اسی الجھن میں اس نے اپنا ہاتھ جلا لیا تھا۔

''دھیان سے کام کیا کرو تم لوگ۔''
نمبردارنی بے چاری اس کی مرہم پٹی کر رہی تھی، کتنی نادان تھی وہ۔
تکلیف کو بھولے وہ نمبردار کے رویے پر پریشان تھی، پتہ نہیں کیوں نمبردار سے اسے خوف آنے لگا تھا، ہوسکتا ہے نمبردارنی نے اسے بتادیا ہو سب۔
وہ افضل والی بات سوچ اور پریشان ہوگئی، دل نمبردار سے ڈرتا بھی بہت تھا اور افضل کی طرف جھکا بھی جارہا تھا، یہ کیسے رستے تھے وہ جن پر قدم رکھ رہی تھی اور واقعی نمبردارنی، نمبردار کو سب بتا چکی تھی کہ افضل پتہ نہیں کیوں اس لڑکی پر اتنا تیار رہتا ہے، وہ تو سادگی میں سب بتا گئی تھی مگر نمبردار کو سوچوں نے آن گھیرا تھا۔
ہاتھ جلنے پر نمبردارنی نے اسے گھر بھجوادیا تھا، ابا ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد گھر واپس آچکا تھا۔
''یہ ہتھ کیسے جلالیا؟'' اماں نے جلا ہوا ہاتھ دیکھا تو اس کی طرف لپکیں۔
''گرم گرم چائے گر پڑی تھی۔'' وہ کسی اور خیال میں ڈوبی بے پروائی سے بولی۔
''تیرے تو کرم ہی پہلے دن سے جلے ہوئے ہیں۔'' ماں تھی آنکھوں میں اتھرو آگئے، وہ بھی کتنی بدقسمت ماں تھی، ساری زندگی انہوں نے اسے ہاتھ کا چھالا بنائے رکھا اتنی منتوں مرادوں کے بعد جو اولاد ملی تھی اس کی ہر جائز ناجائز بات مانی شاید اسی لئے وہ ہر چیز کو پالینا اپنا حق سمجھتی تھی، شادی کے بعد گھر والا چل بسا اور اب ماں باپ کے در پر پڑی تھی، ماں نے روتے ہوئے اسے گلے سے لگالیا۔
''کچھ نہیں ہوا۔'' وہ انہیں خود سے دور کرتی کوٹھڑی میں چلی آئی۔
''اندر کہاں جارہی ہے لا مرہم لگادوں۔'' وہ پیچھے سے بولیں مگر اس نے سنی ان سنی کردی۔
''لچھی نی لچھی۔'' وہ پھر بولیں۔
''مرہم میں نے لگوالی تھی، مجھے سونے دے اماں۔'' ان کے دوبارہ بولنے پر وہ اندر سے بولی۔
''چنگی کڑی ہے تو، میں فکر سے مری جارہی ہوں اور تو یہاں اندھیرے میں سونے آگئی۔'' وہ اس کے سرہانے آکر بیٹھ گئی اور پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگیں۔
''سر میں درد نہیں ہے، مجھے سونے دو اماں۔'' وہ پھر تھوڑا غصہ کرتے ہوئے بولی تو وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔
''اچھا چل ٹھیک ہے سوجا۔'' انہوں نے کھڑے ہوتے ہوئے پیار سے اس کے ماتھے کا بوسہ لیا۔
دوسرے دن نمبردار نے اسے بیٹھک میں بلایا ساری رات اس نے بھی سوچنے میں ہی گزاری تھی۔
''تو، تو پل ہی گئی ہے کیا پیسہ ویسہ نہیں چاہیے۔'' نمبردار کی بات سن وہ حیران سی ہوگئی، کل بڑا اکھڑا سا تھا آج کیا ہوا، نمبردار اٹھ کر اس کے پاس چلا آیا اور اس کا ہاتھ پکڑلیا۔
''رات کو ڈیرے پر آنا۔'' لچھی نے سکھ کا سانس لیا، لگتا ہے نمبردارنی نے نہیں بتایا، نمبردار نے کچھ پیسے اس کی مٹھی میں تھمادیئے۔
''جلدی آنا۔'' نمبردار کو لگا تھا کہ شاید وہ اسے وہ پہلے والا پیار نہیں دے پارہا اسی لئے وہ آسے پاسے منہ مارنے لگی ہے اور اس کی پیسے والی کمزوری کا بھی اسے علم تھا۔
''اچھا اب جا اور جلدی آنا، تیرا نمبردار بے صبرا ہورہا ہے۔'' لچھی اس کی بات پر ہنستے ہوئے

دروازے سے باہر نکل آئی، باہر نکلنے پر اسے لگا جیسے یہاں کوئی تھا، اس نے اِدھر اُدھر دیکھا کوئی وہاں کوئی نہیں تھا، شاید میرا وہم ہو، یہی سوچتی وہ اپنے ہاتھوں میں پکڑے پیسوں کو دیکھتی مسکراتی ہوئی پساری میں چلی آئی آگے نمبردار کی چھوٹی بہو زلیخا پساری میں بنتو کے پاس کھڑی تھی اسے یوں مسکراتا دیکھ کر اس سے رہا نہ گیا۔

''تیرے بڑے ہاسے نکل رہے ہیں کدھر تھی۔'' لچھی کے ہاسے کو جیسے بریک لگ گئی۔

''ادھر ہی تھی۔'' زلیخا کو اس کا وہ مشکوک ہاسا پسند نہ آیا اور وہ ویسے بھی اتنی سوہنی تھی اور زلیخا کو شک سا ہی رہتا، بھلا کیا پتہ ایسی کڑیوں کا، مرد ہے نہیں، پتہ نہیں کیا سے کیا چکر چلاتی رہتی ہیں۔

''اور تو، تو بیوہ ہے پھر اتنی بنی سنوری کیوں رہتی ہے، یہ تھلی یہ چوڑیاں۔'' اس نے اپنے اندر چھپے ڈر کو ظاہر کر ہی دیا، بنتو دوسرے پاسے منہ کر کے ہنسنے لگی، لچھی منہ نیچے کر کے کھڑی رہی۔

''اتنے ٹشن تو ہم نے نہیں کیے جتنے تو بیوہ ہو کر کرتی ہے۔'' اس کی بات کے جواب میں لچھی کو کوئی جواب بھی سوجھ نہیں رہا تھا۔

''یہ مردوں والا گھر ہے، تجھے خود اتنی عقل ہونی چاہیے، مرد تو مرد ہوتا ہے اس کا تو کام ہی پھسلنا ہے۔'' زلیخا کے پیچھے پیچھے ریحانہ بھی پساری میں آ گئی تھی بچے کا دودھ لینے کے لئے زلیخا کی بات سن کر وہ بھی کھڑی ہوگئی۔

''اب آگ کے پاس موم کو رکھ دو تو اس نے تو پگھلنا ہی ہے۔'' زلیخا اس کو باتوں باتوں میں بہت کچھ سمجھا رہی تھی، ریحانہ بھی اس کی باتوں کے ساتھ اتفاق کر رہی تھی پھر نمبردارنی کے آ جانے پر سب اِدھر اُدھر ہو گئیں۔

زلیخا کی باتوں کو اس نے ذرا بھی دل پر نہیں لیا تھا، ''مجھے کیا کہتی ہیں اپنے اپنے مردوں کو سنبھالیں، اب چاند کو جتنا مرضی پردوں میں رکھو، اس کی چاندنی باہر نکل ہی آتی ہے۔'' لچھی کی اکڑ پر بنتو اس کا منہ دیکھتی رہ گئی، اتنا غرور۔

☆☆☆

درگاہ پر بڑا رش تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ جمعرات کا روز تھا، درگاہ پنڈ سے باہر تھی بڑے جنگل کے قریب، درختوں کے جھنڈ میں واقع ہونے کی وجہ سے وہاں ہر وقت اک ٹھنڈک کا احساس رہتا۔

''تیری کون سی منت پوری ہوئی ہے جو تو روت بانٹنے آئی ہے، (روت، میٹھی روٹی کے ٹکڑے)۔'' نذیراں نے بڑے ہنستے ہوئے کہا۔

''بن مانگے ہی سب کچھ مل گیا ہے، روٹ تو میں اپنی خوشی سے لے کر آئی ہوں۔'' سارا پنڈ جیسے درگاہ پر ہی آ گیا تھا، تائی بالی کی نکی بھی ان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی، پچھلے دنوں خورشید کی باتوں نے اسے پریشان کیے رکھا تھا۔

''اونچائی کے سفنے مار ڈالتے ہیں۔'' اس کی بات اسے اب بھی یاد تھی، ان بیتے دنوں میں اس نے خود کو سمجھا لیا تھا، اس کا افضل اسے اونچائی سے گرنے نہیں دے گا۔

''یہ جگہ ہی ایسی ہے جہاں آ کر دل سکون پاتے ہیں، میرا تو یہاں آ کر کہیں اور جانے کو دل نہیں کرتا۔'' لاجو کی بات پر نکی کو بھی ہنسی آ گئی۔

''تو آج رات ادھر ہی بستر لگا لے۔''

''تیرے بڑے ہاسے نکل رہے ہیں۔'' لچھی نے پیچھے سے آ کر نکی کو پکڑ لیا۔

''کتنی دیر سے میں تجھے اڈیک رہی تھی اور اب تجھے آوازیں بھی دے رہی ہوں پر تو سنتی نہیں۔'' لاجو نے سرسری سا لچھی کی طرف دیکھا،

اک پنڈ میں رہنے کی وجہ سے جان پہچان ضرور تھی مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا، اب بھی وہ نکی سے ہی بات کر رہی تھی۔

''ہم نے تو سنا نہیں۔'' نذیراں نے اس کی نتھلی والی ناک کو بڑے غور سے دیکھا کتنی جچ رہی تھی وہ اس کے چہرے پر، کہیں سے بھی یہ نہیں لگتا کہ اس کا گھر والا مر چکا ہے۔

نکی کے ساتھ باتیں کرتی کرتی وہ آگے بڑھ گئیں تو لاجو نذیراں کے ساتھ ایک طرف ہو کر کھڑی ہو گئی۔

''روٹ بانٹنا بڑا مشکل کام ہے، بانٹنے والا خالی ہتھیلیاں دیکھ کر سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ پہلے سے دے۔'' لاجو کے کہنے پر نذیراں بانٹنے سے انکار کر گئی۔

''خالی ہتھیلیاں، ایک وہ بھی تو ہے جو اوپر بیٹھا ہے جو ان خالی ہتھیلیوں سے کبھی تنگ نہیں پڑا، دونوں ہاتھوں بھر بھر کے لٹاتا ہے اور انسان کسی کو کھانا کھلائے تو دس بندوں کو بتاتا ہے۔''

لاجو جانے کس رو میں بول گئی تھی نذیراں نے ماتھے پر زور سے ہاتھ مارا۔

''تجھے کیا ہوا، کونسے مولوی سے درس لے رہی ہو آج کل۔''

''چل پرے ہٹ۔'' لاجو اس کی بات پر ہنستی ایک طرف کو مڑ گئی، جہاں بہت سارے بچے تھے، کچھی افضل کو دیکھ نکی کی اوٹ میں ہو گئی، جو تو ید کے ساتھ حجرے میں موجود تھا، چند روز پہلے والا اس کا غصے سے بھرا چہرہ اس کی آنکھوں کے آگے لہرا گیا۔

اب بھی اس کے چہرے پر وہی غصہ موجود تھا، نکی کی اوٹ میں ہونے کے باوجود افضل نے اسے دیکھ لیا تھا، ماتھے پر تیوریاں سی اکٹھی ہو گئیں۔

''وہ جتنا غصہ کرتا ہے مجھے اس پر اتنا ہی پیار آتا ہے۔'' کچھی نے حسرت سے سوچا۔

لوگ بڑی عقیدت و احترام کے ساتھ حجرے میں آ کر سلام کر رہے تھے کوئی سورۃ یسین پڑھ رہا تھا اور کچھ خالی سلام کر کے ہی واپس مڑ رہے تھے، کچھی ایسی جگہ پر جا کر کھڑی ہو گئی جہاں سے افضل صاف نظر آ رہا تھا جو وہاں کھڑا شاید کسی کا انتظار کر رہا تھا، اس کے باہر دیکھنے سے تو ایسا ہی لگ رہا تھا، کون خوش قسمت ہے وہ، کچھی نے بڑی حسرت سے سوچا۔

افضل بار بار حجرے کے اندر آنے والے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا، آنے جانے والوں کی وجہ سے خاصا رش تھا کچھی بھی ایک نکڑ میں کھڑی تھی اور جاننے کو بے قرار تھی کہ وہ کون خوش نصیب ہے جو اس کے چہرے پر مسکراہٹ لائے گا کس کی وجہ سے اس کے ہونٹوں پر ہنسی کے گلاب کھلیں گے، آنے والے نے شاید دیر کر دی تھی، وہ گھڑی کو دیکھتا پھر دروازے کی طرف۔

پتہ نہیں کیوں افضل کو دیکھ کر اس کے اندر جیسے دوڑتا سرخ سیال چیونٹی کی رفتار میں بدل جاتا اور وہ ایسے خاموش ادھ موئی سی ہو جاتی، ایسا صرف افضل کو دیکھ کر ہی ہوتا تھا۔

کہتے ہیں کہ دل ایک ایسا بھنورہ ہے جو صرف اسی پھول پر منڈلاتا ہے جس سے وہ اپنے لئے پیار کی خوشبو محسوس کرے، لیکن یہاں تو ایسا نہیں تھا یہ تو اس پھول کی طرف جا رہا تھا جس سے صرف بے رخی کی مہک آتی تھی اس کے باوجود وہ اسی کے گرد منڈلا رہا تھا، افضل کی بے چینی کم نہیں ہو رہی تھی اور اب تو کچھی بھی اس بے چینی میں شامل ہو گئی تھی اس کی آنکھیں بھی دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

''تو بھی تو کچھ پڑھ لے۔'' چاچی صغراں

کے پکارنے پر اس نے چونکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا وہ اپنی باتوں میں اتنی مگن تھی کہ اسے خبر نہ ہوئی کہ چاچی کیا کہہ رہی ہے۔

''لے یسین پڑھ۔'' چاچی نے سپارہ اس کے ہاتھوں میں تھما دیا اس نے سپارے سے نظریں ہٹا کر افضل کی طرف دیکھا، جہاں اب غصے کا نام ونشان نہیں تھا، سیاہ بھنوؤں کا تناؤ ختم ہو چکا تھا، سیاہ مونچھوں کے نیچے چھپے ہونٹوں پر مسکراہٹوں کے در کھل گئے تھے، بے قراری و بے چینی کہیں دور بھاگ گئی تھی، اس نے یکدم اپنی آنکھوں کو حجرے کے اندر آنے والے راستے کی طرف موڑ دیا اور پھر اس کے اندر جیسے جلن کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا وہ جس بات کو خواب میں بھی سوچ نہیں سکتی تھی وہ ہو رہی تھی، یہ کیسے ہو سکتا ہے، حیرت سے پھٹی اس کی آنکھیں لاجو کے چہرے پر ٹھہر گئیں، جسے دیکھ کر افضل سب کچھ بھول چکا تھا، لاجو کا چہرہ بھی کھل کر گلاب بنا ہوا تھا جن پر افضل کی نظریں بھنوروں کا روپ لئے منڈلا رہی تھیں۔

اسے اپنے نزدیک آتا دیکھ کر افضل ایک قدم پیچھے کو ہٹ گیا، وہ سلام کرنے کے بعد افضل سے تھوڑا نزدیک آ کر کھڑی ہوگئی، افضل بھی اپنا رخ اس کی طرف موڑ چکا تھا، پچھی حیران و پریشان یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی، لاجو ایک غریب گانے والے کی کڑی، اس نے دونوں کو اک دوسرے کے نزدیک کھڑے دیکھا، اپنے آپ سے نظریں ہٹا کر اس نے کسی کو دیکھا ہی نہیں تھا اس لئے اپنے سے زیادہ سوہنا اسے کوئی لگتا ہی نہیں تھا پر آج افضل کے پاس کھڑی یہ لڑکی اسے دنیا کی سب سے سوہنی کڑی لگ رہی تھی، اس کے پاس کھڑی وہ اس کی ہم پلہ لگ رہی تھی، وہ مردانگی کا شہکار تھا تو وہ حسن کی ملکہ تھی پچھی کے اندر تو جلن و حسد کے فوارے پھوٹنے لگے۔

آنکھوں آنکھوں میں جانے ان دونوں نے کیا کہا تھا کہ لاجو جلدی سے حجرے سے باہر نکل گئی اور اس کے جاتے ہی افضل بھی باہر نکل گیا، پچھی کا جسم برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا وہ بھی جلدی سے چاچی کو سورہ یسین پکڑاتی خود بھی باہر نکل آئی۔

باہر اندھیرے کے ساتھ ہلکی سی ٹھنڈ بھی محسوس ہوئی درختوں کے جھنڈ ٹھنڈ کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھے، وہ ان دونوں کو کھوجتی نظروں سے ڈھونڈنے لگی تو افضل تھوڑی دور کھڑا نظر آیا، مجھے غصہ دکھانے والا خود لاجو کے ساتھ پیار کی پینگیں بڑھا رہا ہے۔

لاجو کو اس نے مزار کے پچھواڑے ملنے کا اشارہ کیا تھا اس لئے وہ نذیراں کو بتاتی اور انتظار کا کہتی اس طرف کو ہو لی، افضل اس کو جاتا دیکھ سب سے نظریں بچاتا خود بھی ادھر کو چل دیا، پچھی چھپ کے یہ سب دیکھ رہی تھی، اندھیرا گہرا ہونے لگا وہ بھی ان سے چوری ان کے پیچھے چل دی۔

مزار کے پچھواڑے وہ دونوں اک پیڑ کے نیچے کھڑے نظر آتے ان کی پیٹھ اس کی طرف تھی وہ ان سے اتنے فاصلے پر کھڑی ہوگئی جہاں سے آواز صاف سنائی دے۔

''میرے دیر سے آنے پر غصہ کر رہے تھے۔''

''اور نہیں تو کیا، تجھے پتہ تو ہے کہ تو میرے پاس بھی ہو اور مجھے نظر نہ آئے تو میری کیسی حالت ہوتی ہے۔''

''اچھا۔'' لاجو بڑے لاڈ سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی، پچھی تک ساری آواز صاف پہنچ رہی

تھی، افضل کا اتنے پیار سے بولنا اس کے اندر کوئی آری چلانے لگا اس نے تو سفنے میں بھی یہ نہیں سوچا تھا۔

''اتنا غصہ کیوں کرتے ہو؟'' وہ پھر بولی۔

''تمہارے پاس آکر غصہ کرتا ہی کب ہوں تو سامنے آجائے تو سارا غصہ جھاگ ہو جاتا ہے۔'' اس نے لاجو کو بازو سے پکڑ خود کے قریب کرلیا تو لچھی نے بے دھیانی میں کانٹوں والی ٹہنی کو ہاتھ میں لے لیا، تکلیف کے مارے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی، آنکھوں میں تکلیف کی شدت سے اتھرو آگئے، کانٹوں کو ہی تو پکڑ لیا تھا اس نے، اس نے اپنے ہاتھوں سے نکلنے والے خون کے ننھے ننھے قطروں کو دیکھا جو ہاتھ کے مختلف حصوں سے ابھر آئے تھے۔

''تجھے پتہ ہے جب دریا پہاڑوں سے نکلتا ہے تو کتنا شور کرتا ہے، شائیں شائیں کی آوازیں کچھ بھی اور سننے نہیں دیتیں، پانی کا اپنا کوئی شور نہیں ہوتا، شور پتھروں کے ٹکرانے سے پیدا ہوتا ہے۔'' اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتا وہ مگن سا بولنے لگا، لاجو بھی شام کے سیاہ ہوتے اندھیرے میں ڈوبتی شاخوں کو دیکھ رہی تھی کیسے وہ اس اندھیرے میں گم ہونے جا رہی تھیں بغیر کسی خوف کے۔

''مگر آگے بڑھتے بڑھتے ایک جگہ ایسی بھی آتی ہے جہاں سے وہ بغیر شور کے بغیر آواز کے بہت شانت ہو کر گزرتا ہے، نہ کوئی روک نہ کوئی ٹوک، اپنے آپ میں مگن۔'' لاجو کو اس کے بدن سے اٹھتی خوشبو اندر تک مہکائے جا رہی تھی، اس کے ہاتھ اب بھی اس کے بالوں کو چھیڑ رہے تھے۔

''میں بھی ایک ایسا ہی دریا ہوں، غصہ انہی لوگوں کے بیچ میں کرتا ہوں جو مجھے غصہ دلاتے ہیں اور تم میرے لئے وہی جگہ وہی مقام ہو جہاں میں آکر سکون پاتا ہوں۔''

اپنے لئے افضل کی اتنی محبت پا کر لاجو کی آنکھیں پانی سے بھیگ گئیں جنہیں افضل نے اپنے ہونٹوں سے چوم لیا تھا لچھی یہ باتیں سننے کے بعد وہاں رکنے کا حوصلہ نہ پا سکی اور واپس مڑ گئی۔

☆☆☆

بھٹی سے دانے بھنانے کے بعد گرم گرم دانے اپنے دوپٹے کے پلو میں پوٹلی بنا کر پکڑے وہ گرم دانوں کا مزہ لیتی ماجے دھوبی کے گھر جا رہی تھی جس کی گھر والی کو اس نے کپڑے سلائی کرنے کو دیئے تھے، (اس دن نمبردار سے پیسے لے کر اس نے کپڑے خریدے تھے) نمبردار کی چھوٹی بہو ریحانہ کو وہ کپڑوں کا کہتی جلدی آگئی تھی۔

''جی وہ دو سوٹ سلائی کے لئے دیئے تھے۔'' اتنا کہہ کر وہ تو آگئی تھی مگر اس کے جاتے ہی ریحانہ ولایت کے پاس آبیٹھی۔

''بیوہ ہو کر اسے کتنا پہننے اوڑھنے کا شوق ہے چھی چھی۔'' ریحانہ بڑی ناگواری سے بولی۔

''بندہ پوچھے جس کا گھر والا یوں چھوڑ جائے، کہاں دل کرتا ہے نئے نئے کپڑے پہننے کو۔'' ان کے درمیان زلیخا بھی آن بیٹھی تھی، اس کا بیٹا اس کی گود میں تھا، ولایت کے بچے بڑے تھے۔

''مجھے تو کہیں سے بھی یہ بیوہ نہیں لگتی، تھلی دیکھی ہے اس کی، مجھے تو یہ بندے پھنسانے والی ڈائن لگتی ہے۔'' زلیخا تو پہلے ہی اس کے خلاف تھی اب بھی بولے بغیر اس سے رہا نہ گیا۔

''مختار گھر ہو تو مجھے اچھا نہیں لگتا یہ زیادہ ہمارے کمرے میں آئے۔'' ریحانہ نے اپنے

اندر چھپے ڈر کو سب کے سامنے پہلی دفعہ ظاہر کیا۔

''سوہنی اتنی ہے ایویں بندے کا ایمان ڈولنے لگتا ہے۔'' ریحانہ کی بات پر زلیخا نے بھی ہاں میں سر ہلایا۔

''سوہنی تو بہت ہے وہ، اس دن لال تاروں والی چنی میں وہ اتنی سوہنی لگ رہی تھی تو میں سوچوں جو یہ مجھے اتنی سوہنی لگ رہی ہے کیا اوروں کو نہیں لگ رہی ہوگی۔'' ولایت نے بھی دل کی بات کہی۔

''بھئی اپنے اپنے بندوں کا خود ہی خیال رکھا کرو۔'' زلیخا کی بات پر تینوں اپنے اپنے دل میں چھپے چور پر خود ہی ہنس دیں۔

☆☆☆

ہلکا ہلکا آندھی والا موسم بن رہا تھا، دور دور گدلی فضائیں جیسے کسی طوفان کا پیغام دے رہی تھی۔

پنڈ کے دوسری طرف جدھر بہت بڑا اتلاب (تالاب) تھا، ہندوؤں کے زمانے کا تالاب تھا، چار چار سیڑھیاں اتر کر تالاب کے اندر جانا پڑتا، تالاب کے دوسرے کنارے پر دو بڑے بڑے بڑگد کے پیڑ تھے جن کی پرانی شاخیں زمین کو چھوتی تھیں، دھوبی کا گھر اسی تالاب کی طرف تھا، راستہ زیادہ بسا ہوا نہیں تھا، وہ اکیلی ٹنڈوں والے کھوہ کے پاس سے گزر رہی تھی، راستے کے ساتھ پیپل کے پیڑ کے پاس موچی جوتیاں سلائی کر رہا تھا، اکا دکا بچے بانٹے کھیل رہے تھے، وہ اپنے آپ میں مگن سی چل رہی تھی، اچانک اسے لگا جیسے کوئی اس کا نام لے کر اسے پکار رہا ہے، وہ چلتی چلتی یکدم رک گئی، منہ میں دانتوں تلے چنے دبائے وہ ہولی ہولی منہ مارتی اس کھلے دروازے کی طرف مڑ گئی جہاں سے اسے شک ہوا تھا کہ اندر سے کوئی اسے بلا رہا ہے۔

وہ کھلے دروازے سے اندر آ گئی، صحن میں بیری کے پیڑ تلے ایک عدد چارپائی بچھی تھی جس پر سرہانے کے پاس ایک کتاب رکھی ہوئی تھی وہ تھوڑا اور اندر آ گئی تو پیچھے سے کھٹ کر کے کسی کے دروازہ بند کر دیا وہ بجلی کی سی تیزی سے پیچھے کو پلٹی۔

''منشی اکبر۔'' منشی اکبر ہنسی ہونٹوں پر سجائے اس کی طرف دیکھ رہا تھا، وہ حیران و پریشان اس کے دروازہ بند کرنے پر اس کو دیکھ رہی تھی۔

وہ تھوڑی دیر اسے دیکھتا رہا پھر چلتا ہوا اس کے پاس آ گیا مگر وہ ابھی تک بند دروازے کو ہی دیکھ رہی تھی، وہ دونوں حویلی کے ملازم تھے مگر آج تک ان کی آپس میں کوئی بھی بات چیت نہیں ہوئی تھی بس نظروں کی جان پہچان تھی اس سے زیادہ نہیں، اس لئے وہ اس کی جرأت پر حیران ہو رہی تھی۔

''اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو بند دروازے کو دیکھ کر۔'' وہ چلتا ہوا اس کے بہت قریب آن رکا، اک جانی پہچانی سی خوشبو لچھی کو مسکانے لگی، یہ خوشبو، وہ دیکھ اسے رہی تھی مگر ذہن اس کا کہیں پیچھے کو دوڑ لگائے ہوئے تھا اور دوڑتے دوڑتے وہ نمبردار کی باہر والی حویلی تک چلا گیا تھا اور اسے یاد آیا اس دن ٹکرانا۔

''تو کیا وہ یہ تھا؟'' لچھی کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی، تریلیاں سی اس کا چہرہ تر کر گئیں۔

وہ اتنا قریب آ گیا تھا کہ لچھی ایک قدم پیچھے کو ہٹ گئی، اس کے ایسا کرنے پر منشی ہنس دیا، لچھی پہلے تو چپ چاپ دیکھتی رہی پھر غصے سے بولی۔

''کنڈی کیوں چڑھا دی۔'' وہ تھوڑا اونچا

بولی تھی تو منشی نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھے اسے چپ رہنے کے لئے کہا اور بڑی مضبوطی سے اس کا بازو پکڑے اسے اندر لے آیا اور اندرونی دروازہ بھی بند کر دیا پچھی اس کے ایسا کرنے پر تپی اس پر برس پڑی۔

''چھوڑ مجھے۔'' وہ اس کی مضبوط گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑانے لگی۔

''لے چھوڑ دیا تجھے۔'' وہ اس کا ہاتھ چھوڑے ایک طرف کو کھڑا ہو گیا۔

''تو ہے کون اس طرح سب کرنے والا۔'' وہ دروازہ کھولنے کے لئے آگے کو بڑھی مگر اس نے روک دیا اور پھر اس کا بازو پکڑ لیا۔

''نہ جان نہ پہچان، چھوڑ۔'' اس نے بازو چھڑانے کی کوشش کی مگر ناکام ہو گئی۔

''جان پہچان بھی ہو جائے گی اور ویسے بھی تو سارے کام بند دروازے کے پیچھے ہی کرتی ہے یہاں بھی سہی۔'' منشی کی بات پر اس کی غصے سے تنی ہوئی بھنوئیں ڈھیلی پڑ گئیں۔

''کیا مطلب ہے تیرا؟''

''تیری میری اتنی جان پہچان تو ہے کہ تو میرے ساتھ بات کر سکے، باقی جان پہچان بھی کر لیتے ہیں۔'' پچھی کو حیرت ہو رہی تھی کہ وہ بندہ جسے میں نے کبھی بلایا چلایا نہیں وہ ایسے کیوں کر رہا ہے۔

''میں نمبر دار سے تیری شکایت کروں گی۔''

اس کی بات پر ہنستا ہوا وہ اس کے بہت قریب آ گیا، اس کے منہ سے اٹھتی پان کی خوشبو اسے اپنی سانسوں میں جاتی محسوس ہونے لگی۔

''یہ غلطی کبھی نہ کرنا، ورنہ کئی اور پول کھل جائیں گے۔'' سگریٹ کا کش لیتے ہوئے اس نے دھواں اس کے منہ کے اوپر اچھال دیا تو وہ اس کی بات سن کر پیروں کے تلے سے زمین نکلتی محسوس کرنے لگی، دھوئیں کے اندر جانے پر اسے کھانسی ہونے لگی تو منشی نے قریب لکڑی کی میز پر رکھے پیتل کے جگ میں سے نکال کر پانی سے بھرا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

''مجھے نہیں پینا۔'' اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا، گلاس نیچے گرتا گرتا بچا۔

''پی لے شاید تیرے اندر کی گرمی کم ہو جائے، ویسے تو، تو اتنی سوہنی ہے کہ اگلے بندے کی گرمی تجھے دیکھ کر دگنی ہو جاتی ہے۔'' وہ بڑی ڈھٹائی سے ہنستا ہوا گلاس میز پر رکھ کر اس کے پاس آ گیا، بار بار وہ پان کھاتا سگریٹ کا کش لے رہا تھا۔

''رب دی سونہہ، تجھے دیکھ کر پاگل ہو گیا میں۔''

''مجھے جانے دے، میں نمبر دار کو سب کچھ بتا دوں گی، تیری نوکری تیرے ہاتھ سے نکل جائے گی۔'' وہ دھاڑنے والے انداز میں بولی۔

''تیری سونہہ، اگر میں تیرے گھر والوں کو بتا دوں تو تیری نوکری کیا تو اس پنڈ سے ہی نکل جائے گی، اب بتا تو بتائے گی۔'' منشی کی بات سن اسے لگا جیسے وہ مٹی کی چھت اس کے اوپر ان گری ہے، اپنا آپ اسے مٹی کے نیچے دبتا محسوس ہوا، ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔

''بولو، کیا بتاؤ گے۔'' وہ ذرا نڈر ہو کر بولی۔

''حویلی، باہر والی۔'' اس نے بڑے کمینے پن سے اسے آنکھ ماری۔

''اس رات حویلی میں تو میرے ساتھ ہی ٹکرائی تھی، سوچتا ہوں تو اس بڈھے کے ساتھ پھنس کیسے گئی، تجھے تو کوئی میرے جیسا جوان چاہیے۔'' اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ جتانے کی کوشش کی، جسے سمجھتے ہوئے وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔

"نہیں۔"
"کیوں تجھے یہ سودا منظور نہیں۔"
"کبھی نہیں۔"
"تو پھر ٹھیک ہے میں آج ہی شام کو آ کر مولوی صاحب سے ملتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ تیری ساری زندگی کی نمازیں دوزخ میں ڈالنے والی تیری بیٹی ہے، تو یہاں اللہ ہو کرتا رہتا ہے اور وہ وہاں نمبردار کا............؟" بات ادھوری چھوڑ کر اس کو دیکھنے لگا۔

لچھی تو جیسے مرنے مرانے والی ہو گئی، کیا کرے وہ، اب اگر وہ اب ے کو سب کچھ بتا دیتا ہے تو وہ زندہ ہی مر جائیں گے، دونوں اور وہ جو مجھے کرنے کو کہہ رہا ہے، میں کیسے کروں، عجیب رستے پر کھڑی تھی وہ جہاں ایک طرف گڑھا تھا اور دوسری طرف کھائی۔

"نمبردار تو میری جان ہی لے لے گا۔" اسے جیسے نمبردار کا غصہ یاد آیا، اور دوسری طرف میرے ماں باپ بے گناہ مر جائیں گے، میں کیا کروں، منشی اس کے چہرے پر پھیلی زردی کو اس کے چہرے پر پھیلتے سمٹتے دیکھ رہا تھا۔

"میری بات مان جاؤ گی تو دونوں طرف سے بچ جاؤ گی، نمبردار سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں، میں اسے بتاؤں گا تو اسے پتہ چلے گا ناں اور رہی تیرے گھر والوں کی بات تو میں ان کا بھی یقین دلاتا ہوں، مجھے پتہ ہے تیرے باپ کی بڑی عزت ہے پنڈ میں۔"

وہ ذہن میں چلتے جھگڑوں سے خود کو بچاتی قریب رکھی چارپائی پر بیٹھ گئی اور اب دماغ کے گھوڑے ہر طرف دوڑاتی کوئی تیسری راہ ڈھونڈ رہی تھی، لیکن جانے کیسے ہر راستے پر کسی نے کنڈے کھلا ر دیئے تھے، وہاں سے گزرنے پر وہ پاؤں بچاتی تو دامن تار تار ہو جاتا۔

وہ بند راستوں کے درمیان کھڑی تھی جیسے اس کا کوئی والی وارث نہیں جس کا جو جی چاہ رہا تھا وہ وہی کر رہا تھا، دوپٹے کے پلو کو اپنے ہاتھوں کی انگلی میں لپیٹتی وہ مسلسل سوچ رہی تھی لیکن سوچوں کے اندر اتنی گرہیں پڑیں تھیں جو اس سے کھل نہیں رہی تھیں۔

"کس سوچ میں گم ہو، یہ کام تیرے لئے کیا مشکل ہے۔" لچھی نے اک کڑی نظر اس پر ڈالی۔

"اوے میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ، چل چھڈ، قسم سے تجھے دیکھ جب نمبردار کی رال ٹپکتی ہے ناں تو میرے بھی اندر کچھ ہونے لگتا ہے، کتنی دیر سے میں یہ کھیل کھیلتا دیکھ رہا ہوں۔" منشی کی باتیں سن شرم سے وہ پانی پانی ہونے لگی، یہ بات کیسے کھل گئی اس نے تو بڑا دبا کر رکھا تھا۔

کرنے کو تو اس کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں تھا لیکن وہ نمبردار سے ڈرتی تھی اوپر سے آج کل افضل کے لئے وہ اپنے دل کو دھڑکتا پا رہی تھی، منشی کی طرف تو کبھی دھیان نہیں گیا تھا اور ویسے بھی نمبردار اس کی جھولی روپوں سے بھر دیتا تھا ایسے پیسے جن کا وہ اپنے گھر والوں سے ذکر نہیں کرتی تھی اور یہ کیا دے گا اسے، اس نے کمرے پر اک نظر ڈالی جہاں صرف ایک چارپائی جس پر تکیہ رکھا ہوا تھا ایک چھوٹی سی گول لکڑی کی میز اور ایک کرسی۔

"چیزیں نہیں دیکھ میرا دل دیکھ۔" وہ جیسے اس کی نظروں کا مطلب سمجھ گیا۔

"تجھے اپنے دل میں رکھوں گا میں اور یہ کیا کم ہے تیرا اتنا بڑا راز اپنے دل میں چھپا کر رکھا ہے میں نے۔" راز والی بات پر پھر لچھی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

"وقت ضائع نہ کر۔" وہ اس کے قریب آ

گیا اور ہاتھ ہاتھوں میں لے لیا، پچھی نے اس کے ہاتھوں میں اپنے ہاتھ کو دیکھا، اس نے کچھ سوچ کر آنکھیں بند کر لیں اس لمحے اسے اپنے اوپر ہنسی سی آ رہی تھی، وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتی تھی، سارے راستے بند ہو گئے تھے اور وہ سب کچھ کرنے پر تیار ہو گئی تھی، خود کو وہ کوڑے کا ڈھیر لگ رہی تھی جہاں پر کوئی اپنا اپنا گند پھینک کر چلتا بنتا تھا۔

☆☆☆

نمبردار اور منشی کے درمیان خود کو ربڑ کی گیند بنائے وہ اِدھر اُدھر پھدکتی اپنے دل میں افضل پا رہی تھی اور اس کی اک نظر کی بھوکی بھوک مٹانے کو تڑپ رہی تھی، یہ کیسی بھوک تھی یہ کیسی پیاس تھی جو دو مردوں کے بجھانے پر بھی بجھ نہیں رہی تھی نہ مٹ رہی تھی۔

اساڑھ کا آخیر آنے والا تھا گاؤں میں میلے کی تیاریاں شروع ہونے والی تھیں یہ میلہ آس پاس کے گاؤں میں ہونے والے تمام میلوں میں سب سے آخیر میں آتا تھا اس لئے ساری دنیا ہم ہما کر اس میلے کو دیکھنے آتی تھی اور دوسرا شمشاد بھی اس میلے کو چار چاند لگانے آ رہی تھی جس کی نوٹنکی (ڈرامہ کمپنی) ہر سال میلے کی رونق بڑھاتی تھی۔

گرمی کا زور کم ہونے کو نہیں آ رہا تھا، پتہ نہیں کیا بات ہے یہ لڑکا مجھے کبھی بھولتا نہیں، نمبردار ہو یا منشی ان دونوں کے پاس ہونے پر بھی یہ میرے آسے پاسے ہی منڈلاتا رہتا ہے۔

رات کا وقت تھا نمبردار کا نسخہ وہ ایک بار پھر آزما کر آئی تھی مگر اب کی بار بندہ کوئی اور تھا، کہتے ہیں عورت ہمیشہ اپنے ہاتھوں برباد ہوتی ہے، منشی اکبر کے پہلو میں بیٹھی وہ جانے کیا کیا سوچ رہی تھی۔

''کیا بات ہے تو مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی۔''

اکبر اس کے دوپٹے کو اپنے چہرے پر ڈالے ہوئے تھا وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''مجھے نہیں بتاؤ گی، امام مسجد کی بیٹی ہو جھوٹ نہ بولنا۔'' امام مسجد کے نام پر پچھی کانپ سی گئی۔

''وہ معتبر ہستی جس کے پیچھے سارا گاؤں نماز پڑھتا ہے اور میں۔'' بہت جلد وہ سنبھل گئی یا اب وہ عادی ہو گئی تھی۔

''میں بھلا جھوٹ کیوں بولوں گی، اماں ابا کے بارے میں سوچ رہی تھی کہیں جاگ نہ گئے ہوں، رات بہت ہو گئی ہے، اب میں جاؤں۔''

''دل تو نہیں چاہ رہا۔''

''جانا تو ہے۔'' پہلے وہ سب مجبوری میں کرتی تھی لیکن اب جیسے وہ اس کی بھی عادی ہو جا رہی تھی۔

''نہ جانہ۔'' اس کی التجا پر اسے ہنسی آ گئی۔

''ابھی تھوڑی دیر بعد سویر ہو جائے گی۔''

''میری سویر تو ہو گئی۔'' اکبر اٹھ کر بیٹھ گیا اور اسے بانہوں میں بھر لیا۔

مرضی سے یا مجبوری سے وہ ایک ایسے سمندر میں قدم رکھ چکی تھی جس کے نیچے زمین بہت دور تھی، ہاتھ پاؤں مارنے پر بھی کچھ نہیں ملنا تھا اور ویسے بھی سمندر تو کسی کو بھی پناہ نہیں دیتا۔

☆☆☆

''سر انہی لوگوں کے پاس ہوتا ہے جو اس کی سہی پہچان رکھتے ہیں، گلے کا سریلا ہونا ضروری نہیں ہوتا۔'' آج پھر خورشید اور اس کا بھائی ان کے گھر آئے تھے، اب وہ کچھ کچھ بولنے لگی تھی لیکن پتہ نہیں کیوں باتوں باتوں کے بیچ وہ چپ سی ہو جاتی، جانے کون سا دکھ تھا اس کے دل میں جو اسے یوں اپنے آپ میں قید کیے ہوئے تھا۔

''میں کوئی پڑھا لکھا تو نہیں ہوں ہاں پر سر کی پہچان ضرور کر لیتا ہوں اور میں اتنا جانتا ہوں یہ سر ہی ہیں جنہوں نے اس کائنات کو سہارا دے کر کھڑا کیا ہوا ہے۔''

''یہ تو بڑی سچی بات کہی ہے آپ نے چاچا جی۔'' خورشید بھی لاجو کی طرح چاچے کو چاچا جی کہتی تھی۔

''پتر میرے جو استاد تھے ناں، بڑے گنی استاد تھے ''استاد برکت علی خان تنگ گلی والے'' انہوں نے احتراماً اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

''انہوں نے ایک بار مجھے کہا تھا کہ جس راگ کی بھی شکل دیکھنا چاہتے ہو اس کو اپنے دماغ میں رکھ کر آنکھیں بند کر لینا (یہ کسی بھی چیز کو بہت آگے تک جاننے والی بات ہے) میں نے ''تلنگ اور پیلو'' کو آنکھیں بند کیے سوچا۔''

لاجو بھی چاچے کی باتیں بہت غور سے سن رہی تھی اور پہلے بھی سنتی تھی، سہ پہر شروع ہو چکی تھی، پالطیف بھی آ چکا تھا اور خورشید کو دیکھ اس کی آنکھوں میں جو چمک اتری تھی وہ لاجو سے چھپی ہوئی نہیں تھی، آنکھیں بند کرتے ہی مجھے لگا جیسے میں جاگتی آنکھیں سفنے دیکھنے لگا ہوں۔

''کیا دیکھتا ہوں کہ ایک پیپل کا بہت ہی پرانا پیڑ ہے اس پیڑ کے پاس ہی ایک بہت بڑا تلا (تالاب) ہے جس کے چاروں طرف پکی لال پوڑیاں (سیڑھیاں) بنی ہیں جو تلاب کے اندر جاتی ہیں، وہاں بہت سے لوگ اکھٹے تھے اور ان کے بیٹھنے سے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی اڈیک رہے ہوں، سورج ان کے سروں کے اوپر چمک رہا تھا، گرمی کی شدت پانی کے قریب سے اٹھنے نہیں دے رہی تھی۔'' چاچے کی باتیں سن کر اسے لگ رہا تھا جیسے وہ بھی وہاں کہیں موجود ہے سارے منظر کو وہ آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

''میں سب سے اوپر والی پوڑی (سیڑھی) پر بیٹھا ہوں چاروں طرف پھیلی چمکتی دھوپ میری آنکھوں میں چبھی جا رہی ہے، میں ماتھے پر ہاتھوں کا چھجا بنائے اس گرم اور ویران خاموشی کو اپنے دل کے بہت قریب محسوس کر رہا ہوں۔''

''پھر کیا دیکھتا ہوں کہ گرد کا ایک طوفان سا ہے جو ہماری طرف دوڑا چلا آ رہا ہے، دھواں سا ہے جس کے مرغولے آسمان کو چھو رہے ہیں، میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پھر تھوڑی دیر بعد ایک چار گھوڑوں والی سفید رنگ کی بگھی ہے جو اس دھوئیں سے باہر نکل کر پیپل کے پیڑ کی چھاؤں میں کھڑی ہو گئی ہے جس کے اوپر دو بہت ہی سوہنے جوان بیٹھے ہیں، سب لوگ جو وہاں موجود تھے بھاگ کر ان کے پاس چلے گئے، وہ دونوں لڑکے بڑے ادب سے بگھی سے نیچے اتر آئے، لوگ آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ چومنے لگے، میں بڑا حیران سا سب دیکھ رہا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں جن کو دنیا یوں چوم رہی ہے۔''

خورشید بھی سب کچھ بھولے چاچے کی باتوں میں مگن تھی پر پالطیف بار بار اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اس کے چہرے پر پھیلے رنگ بار بار اس کا دھیان توڑ رہے تھے۔

''چاچا تیرے سفنے کا کیا ہوا؟'' لاجو جو بڑے غور سے چاچے کی باتیں سن رہی تھی بات رک جانے پر بولی۔

''پھر وہاں موجود لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں تو ان میں سے ایک بولا، یہ جو لال پگڑی والا خوبصورت اور سوہنا جوان ہے یہ تلنگ ہے اور یہ جو پیلی پگڑی والا ہے یہ پیلو ہے میں نے ان دونوں سے زیادہ سوہنے جوان اپنی زندگی میں نہیں دیکھے۔'' چاچے کی بات سن کر لاجو بولی۔

”چاچا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ راگ اک بندے کی شکل میں آئے۔“

”پتر سفنے میں تو کچھ بھی ہوسکتا ہے، سوچ کا کیا ہے اسے جس مرضی جہاں میں لے جاؤ، خیالی کرداروں کو جس مرضی شکل میں ڈھال لو۔“

چاچے کی بات پر لاجو نے بھی سمجھ کر سر کو ہاں میں ہلایا، جیسے وہ خود ایسا کئی دفعہ کر چکی تھی۔

”پتر اپنے ہاتھوں بسائی محبت کی خیالی دنیا کے کردار بہت سوہنے اور من موہنے ہوتے ہیں سنگیت میری محبت ہے اور اس خیالی دنیا کے کردار جیسے ”بے ہاگ، تلنگ، جوگیا، یہ سب وہ کردار ہیں جن کی شکلیں اپنے آپ میرے سامنے آجاتی ہیں۔“ چاچا بات کر رہا تھا تو لاجو کے چہرے پر بکھرتے رنگوں کو خورشید بہت غور سے دیکھ رہی تھی شاید حسرت سے۔

☆☆☆

کام سے ویلی ہو کر وہ گھر جانے لگی تو بیٹھک میں بیٹھے منشی کو دیکھ کر اس کے قدم اپنے آپ رک گئے حالات سازگار تھے اس لئے وہ اندر آگئی اور پھر اس کا تقاضا سن اسے ایکدم چپ سی لگ گئی، وہ کوئی ہوا تھوڑی ہی تھی جو پل میں اِدھر اور پل میں اُدھر، نمبردار کے پاس تو اس نے لازمی جانا تھا، میلے کے لئے چیزیں بھی لینی تھیں اور منشی، پتہ نہیں کیوں، جب منشی پاس ہوتا تو دل جیسے تھوڑی دیر کے لئے سنبھل جاتا وہ دل جو افضل کی بے رخی کے بعد زخمی ہوا ہوتا اس پر منشی اپنے پیار کے پھاہے رکھتا تو اسے بڑا سکون ملتا، پتہ نہیں کیوں افضل کو اس میں وہ بات نظر نہ آتی جو لاجو میں تھی، وہ حسرت سے سوچتی، اب بھی تھوڑی دیر پہلے وہ قریب سے گزرتے افضل کے ساتھ ٹکرا گئی تھی تو اس نے کتنا غصہ کیا تھا، سارا غصہ تیرا میرے لئے ہی ہے، اس نے دل میں سوچا اور آگے کو بڑھ گئی، اس کے سامنے زبان جیسے تالوسے جا لگتی۔

نمبردار کے پاس وہ صرف پیسے کے لئے جاتی تھی اور منشی چاہے اس نے پہلے یہ سب زبردستی کیا مگر اب دل ادھر بھی راضی تھا۔

یہ کیسا دل تھا جو ہر ایک کے ساتھ راضی تھا لیکن اسی دل کا کہنا کہ افضل جیسے کوئی نہیں، کیا تھا یہ سب، یہ دل کے کون سے رنگ تھے جو پوری طرح کھل نہیں رہے تھے، سنا تو یہی تھا کہ دل جسے اک بار اپنا کہے اس کے علاوہ کوئی اور اس میں سما نہیں سکتا تو اگر افضل اس دل میں تھا تو پھر نمبردار اور منشی کی جگہ کیسے نکل آتی تھی، کیا اس کا دل جھوٹ کہہ رہا تھا، کیا افضل بھی انہی مردوں کی طرح تھا بس اس کی طرف اس کا جھکاؤ اس لئے زیادہ تھا کو جو چیز انسان پا نہیں سکتا اس کی تڑپ زیادہ ہوتی ہے دل میں اور جو آسانی سے مل جائے اس کی خوشی کم۔

لیکن یہاں مسئلہ حاصل اور لاحاصل کا تھا وہ افضل کو حاصل نہیں کر پا رہی تھی، جو چیز زندگی میں اس نے چاہی تھی وہ اسے ملی تھی، پیسہ جیسے بھی ہو اس نے حاصل کیا، مرد کی چاہت جیسے بھی ہو اس نے تین تین مردوں سے پائی، اب دل چوتھے کی خواہش کر بیٹھا تھا (دل کی ایک دفعہ عادت بن جائے تو اور اور کی رٹ لگا لیتا ہے) مگر اسے مل نہیں رہا تھا اور یہی بات جلن اور ساڑھ کا روپ لئے اس کی طرف کھینچ رہی تھی۔

اب اگر افضل بھی اس کے تقاضے پورے کر دے تو وہ بھی اسی لائین میں لگ جائے گا جہاں وہ دونوں کھڑے تھے، نہ پا سکنا ہی اسے افضل کی طرف کھینچ رہا تھا۔

(باقی اگلے ماہ)

نایاب جیلانی

قسط کا خلاصہ

امام عشیہ کے کہنے پر نیل بر کی مدد کرتا ہے اور اسے اپنے ساتھ لے کر شہر کے لیا نکلتا ہے، راستے میں صندیر خان کے آدمی امام پر حملہ کر کے شدید زخمی کر دیتے ہیں اور نیل بر کو واپس صندیر خان کے پاس لے آتے ہیں، جہاں سزا کے طور پر خان بابا کو نیل بر کی شادی جہاندار سے کرنی پڑتی ہے۔ جہاندار، نیل بر کو اپنے ساتھ ایک سنسان مقام پر خالی حویلی میں لے کر آتا ہے۔
حمت کو امام کے زخمی ہونے کا پتا چلتا ہے تو وہ شدید پریشان ہو جاتی ہے، دوسری طرف فرح انتہائی افراتفری میں نشرہ اور ولید کی شادی کا کہتی ہے اور مکان نشرہ کے نام کرنے کو کہتی ہے۔

اب آپ آگے پڑھیے

بیسویں قسط

کبھی وہ ماضی کے خوبصورت جھروکوں میں جھانکتی تو اسے ایک ڈیڑھ سال پہلے والی زندگی ایک حسین خواب کی مانند لگتی تھی، ایک ایسا خواب جو ٹوٹ گیا تھا اور جس کی تعبیر بہت بری تھی۔

کچھ سال پہلے جب اپریل کی ایک خوبصورت صبح اس نے دیامر میں قدم رکھا تو اسے دیامر اپنے خوابوں کا مرکز لگا تھا، ایک حسین وادیوں سے بھرا علاقہ، ایشیا کا حسین ترین خطہ، مشرق کا سوئیٹزرلینڈ، پہلے پہل تو اسے یہی محسوس ہوا تھا وہ کسی حسین یورپین خطے میں چلی گئی ہے، لیکن ایسا نہیں تھا، یہ دیامر تھا، اس کے باپ کا علاقہ اور اس کا باپ کون تھا؟ ایک بہت بڑی اسٹیٹ کا مالک، اتنا امیر ترین آدمی، جس کے پاس پراپرٹی کے انبار تھے اور پورے علاقے میں اس کا طوطی بولتا تھا، جس کے ایک اشارے پہ نوکروں کی فوج اکٹھی ہو جاتی تھی۔

تو کیا نیل بر ایک ایسے امیر کبیر آدمی کی بیٹی تھی؟ جو کسی شہنشاہ سے کم نہیں تھا، پھر وہ امریکہ جیسے ملک میں کیڑوں مکوڑوں سی زندگی جینے پہ کیوں مجبور تھی؟

ایک ایسا امریکہ جہاں صرف اس کے لئے بھوک اور افلاس تھی، غربت تھی، ذلت تھی۔

اس کی عیاش ماں نے وراثت میں اسے صرف خوبصورتی تھی اور اپنے دو تین بوائے فرینڈ، جو اس کا جینا حرام کرتے تھے، جن کے ہوتے ہوئے اسے اپنی زندگی غیر محفوظ لگتی تھی اور گندگی سے بھی زیادہ غلیظ لگتی تھی، نیل بر اپنی زندگی کے اس بدترین دور کو سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی لیکن اس وقت جب کہ وہ اس اجاڑ حویلی میں تنہا تھی، تو بہت سی یادیں اس کی آنکھوں کو نم کرنے کا سبب بن رہی تھیں۔

وہ یادیں جو بہت تلخ تھیں، بہت اذیت ناک تھیں، جس میں نہ اس کی زندگی محفوظ تھی اور نہ عزت، وہ اپنی ماں کی عیاشیوں کے لئے محض ایک فٹ بال تھی، جو پڑھتی بھی اور جانوروں کی طرح کام بھی کرتی اور کرشیان اس کی ساری کمائی کو ایک ہی وقت میں جوا کھیل کر اڑا دیتی تھی۔

زندگی وہاں اتنی ہی مشکل تھی، اسکول، دوکان اور گھر، وہ گھر جو گھر نہیں تھا، ایک چھوٹا سا فلیٹ نما کوڑا دان تھا، جس میں اس کی شرابی ماں یا تو پورا دن سوئی رہتی یا پھر شراب کے نشے میں دھت رہتی، ان دنوں کی تلخیاں آج بھی اس کی آنکھوں کو انگارہ کر دیتی تھیں، وہ راتیں جو اذیت ناک تھیں اور بہت خوفناک تھیں۔

ان راتوں میں اسے نیند نہیں آتی تھی، نیند اس کی آنکھوں سے بہت دور چلی گئی تھی، اسے ساری رات جاگنے کی بیماری لگ گئی، وہ سوتی بھی کیسے؟ خوف اسے سونے نہیں دیتا تھا، ہر وقت ایک ہی دھڑکا ایک ہی وحشت سوار رہتی تھی، اس وحشت کا نام ڈینی تھا، جو اس کی ماں کا بوائے فرینڈ تھا اور جس کی نیل بر کو دیکھ کر رال ٹپک پڑتی تھی، عذاب یہ تھا کہ وہ کرشیان کے کوڑے دان میں ہی رہتا تھا، اسی ڈربے نما فلیٹ میں، جہاں ہر وقت شراب کی "بو" پھیلی ہوتی تھی، گندگی سے فلیٹ بھرا ہوتا تھا، ہر طرف سامان بکھرا رہتا، جسے کبھی تو نیل بر سمیٹ دیتی اور کبھی غصے کے عالم میں ساری چیزوں کو پٹخ پٹخ کر اور بھی بکھیر ڈالی دیتی۔

کبھی کبھی اسے اپنی ماں کی زندگی سے گھن آتی تھی، پھر جب کرشیان اس کے حسن کی

تابنا کیوں کو بڑھتا دیکھنے لگی تو اس کی ڈیمانڈ بڑھ گئی، اس پہ ایک ہی خبط سوار ہو گیا تھا، وہ دن رات اسے گالیاں دیتی اور اپنی ڈیمانڈ منوانے پہ مجبور کرتی تھی۔

دراصل کرشیان اسے ''کال گرل'' بنانا چاہتی تھی، وہ خود اسی پیشے سے عمر بھر بیٹھ کے کھاتی رہی تھی اور اب بیٹی کو گدھوں کی طرح کام نہ کرنے کا مشورہ دے کر اپنے خاندانی کام سے لگانا چاہتی تھی، وہ اپنی اس ذلت بھری زندگی سے شاید سمجھوتہ کر ہی لیتی، اگر وہ سب نہ ہو جاتا جس نے اتنے سال بعد نیل بر کو اپنے بھولے بسرے عیاش باپ کی یاد دلا دی تھی۔

وہ جیسا بھی تھا، کم از کم باپ تو تھا، جس سے کرشیان نے ہمیشہ نیل بر کو متنفر کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن نیل بر کو اب اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا باپ کیوں کرشیان پہ لعنت ڈال کر چلا گیا تھا۔

وہ جنوری کی ایک سرد ترین رات تھی، دھند نے پورے شہر کو لپیٹا ہوا تھا، ہر طرف برف کا طوفان تھا، گھروں کے سامنے برف کے بڑے بڑے پہاڑ کھڑے ہو رہے تھے، وہ دن بھر کی تھکی گھر آئی، گھر یعنی فلیٹ میں، وہی کوڑا دان، غلاظت سے بھرا رات گزارنے کا ٹھکانہ، جسے گھر کہنا گھر کی توہین کے سوا کچھ نہ تھا۔

اور جب وہ اپنے بلاک کے انٹرس پہ کھڑی تھی تو برف کے تودے اسے کھڑے کھڑے برف سے منجمد کر رہے تھے، اس نے گہرا تکلیف دہ سانس بھرا اور اپنے فلیٹ کی چابی نکال کر دروازہ کھولنے لگی، یہ کہنے کو نیل بر کا فلیٹ تھا، لیکن اس کی تین چابیاں تین مختلف لوگوں کے پاس تھیں، ایک کرشیان، دوسری نیل بر اور تیسرا ڈینی، اس رات نیل بر کو پہلے سے اندازہ ہو چکا تھا کہ ڈینی فلیٹ کے اندر اس کی بدبخت ماں کے ساتھ موجود ہے۔

وہ اپنے اندر نفرت کے زہریلے تاثرات کو دباتے دباتے ہلکان ہوتی لاؤنج میں آئی تو اسے اپنی ماں ناقابل بیان حالت میں نظر آئی تھی، اس کا حلیہ انتہائی شرمناک تھا، یوں کہ نیل بر کی شرم سے آنکھیں جھک گئی تھیں اور نفرت سے اس کا انگ انگ زہریلا ہو رہا تھا، قریب ہی اس کی ماں کا بوائے فرینڈ پیگ پہ پیگ بناتا نظر آیا، نیل بر کو دیکھ کر اس کی غلیظ آنکھوں میں دنیا جہاں کی خباثت اتر آئی تھی، وہ ہونٹوں پہ زبان پھیرتا دنیا کا غلیظ ترین مرد دکھائی دے رہا تھا اور قریب ہی اس کی ماں نشے میں دھت ڈینی کے کندھے سے جھول رہی تھی، یقیناً ڈرنک کا ساز و سامان ڈینی ہی لایا تھا، وہی اس کی ماں کو اس حد تک نشے میں فنا کرنے کا بڑا سبب تھا، وہ ہمیشہ کرشیان کو پیگ پہ پیگ بنا کر دیتا اور نشے میں دھت کر دیتا تھا اور پھر اس کی ہوس بھری نگاہیں نیل بر کی تلاش میں سرگرداں ہوتیں یہاں تک کہ نیل بر کو اپنے ہی گھر میں پناہ لینے کے لئے جگہ نہیں ملتی تھی۔

اس رات بھی ڈینی نے کرشیان کو نشے میں مدہوش کر ڈالا تھا، جب وہ لاؤنج میں آئی تو کرشیان پانچواں پیگ چڑھا رہی تھی، نیل بر سے برداشت نہ ہوا اور وہ چیخ پڑی۔

''پاگل کتے، کیا جان لو گے اس کی؟'' نیل بر نے بھاگ کر کرشیان سے گلاس جھپٹ کر فرش پہ دے مارا تھا، ایک بدبودار سیال دور تلک فرش پہ پھیل گیا، ڈینی اس کھلی بے عزتی پہ چلا اٹھا تھا اور کسی وحشی جانور کی طرح نیل بر پر پل پڑا، نیل بر اس حملے کے لئے تیار نہیں تھی، وہ اوندھے منہ بدبودار سیال کے اوپر گر پڑی تھی اس کا ماتھا فرش سے ٹکرا گیا۔

''بول کتا کسے کہا؟ بلڈی بچ، کتیا تو اور تیری یہ حرامی ماں۔'' وہ نیل بر کے بال کھینچ کر فرش پہ گھسیٹنے لگا، نیل بر درد کی شدت سے چلا اٹھی تھی۔

''چھوڑ مجھے، ذلیل آدمی میں پولیس کو کال کرتی ہوں۔'' نیل بر درد و کرب سے پاگل ہونے لگی، وہ ایک دیو ہیکل مرد تھا، وہ کانچ سی لڑکی، اوپر سے وہ نشے میں تھا، نیل بر اس کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھی، وہ اس ذلیل آدمی کو چھیڑ کر پچھتا رہی تھی۔

''پولیس کو کال کرنے کے قابل رہے گی تب کال کرے گی نا؟'' وہ جانوروں کی طرح اسے بھنبھوڑنے لگا، لاتیں، مکے، گھونسے، نیل بر درد سے بے حال ہو گئی تھی، اس کے ہونٹ، منہ اور ماتھے سے خون نکلنے لگا تھا، وہ فرش پہ گری ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔

''آج دیکھتا ہوں تو مجھ سے کیسے بچتی ہے؟'' اس کی آنکھوں میں دنیا بھر کی ہوس ناچنے لگی، اس نے اک نظر نشے میں مدہوش پڑی کرشیان کو دیکھا اور پھر نیل بر کو دونوں ہاتھوں میں کسی گڑیا کی طرح اٹھا کر فلیٹ کے اکلوتے بیڈ روم میں لے آیا، پھر اس نے لات سے دروازہ بند کیا اور نیل بر کو بیڈ پہ پٹخ دیا، وہ اپنے درد سے ٹوٹتے جسم کو سمیٹتی جلدی سے اٹھی اور دیوار سے لگ گئی، ڈینی نے بیڈ روم کا دروازہ بند کر دیا تھا، نیل بر کی ساری ہمت نچڑ گئی تھی، اس کا رنگ خوف سے پیلا پڑ گیا اور جسم پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

اسے لگا آج وہ ختم ہو جائے گی، اس کی کل پونجی لٹنے کے قریب تھی، وہ اپنے پاس سوائے عزت کے کچھ بھی نہیں رکھتی تھی اور ابھی وہی عزت ایک یہودی شرابی کے ہاتھوں تار تار ہونے والی تھی، نیل بر شدت بے بسی کے احساس تلے روندی ہوئی اونچی آواز میں رونے لگی۔

''ممی! مجھے بچا لو۔'' اس کی چیخیں در و دیوار سے ٹکراتی اور لوٹ کر اس کی سماعتوں میں ہتھوڑوں کی طرح لگنے لگتیں، اوپر سے ڈینی کے دیو ہیکل قہقہے، وہ اس کی بے بسی کا مذاق اڑاتا موبائل نکال کر کسی اور کو بھی دعوت دینے لگا تھا، شاید وہ اس مال غنیمت کو دوستوں کے ساتھ شیئر کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، لیکن نیل بر کو ایک ہوشربا دہشت ناک انکشاف نے تب ہلا دیا، جب اس نے ڈینی کو کہتے سنا۔

''وڈیو کیمرہ ضرور ساتھ لانا، سیٹ بالکل تیار ہے۔'' وہ ایک وحشی نگاہ نیل بر کے چہرے پہ ڈالتا اور اونچی آواز میں قہقہہ لگاتا۔

''اس بڈھی نے کیا کمال کا پیس تیار کیا ہے، یوں تو تہلکہ مچ جائے گا، پہلی ویڈیو ہی دھوم مچا ڈالے گی۔'' وہ خوشی سے ناچتا اور اونچی آواز میں تانے لگاتا، نیل بر خوف اور وحشت کی آخری انتہا پہ پہنچ چکی تھی، اس کے ساتھ کچھ ہی دیر میں کیا ہونے والا تھا؟ نیل بر کا سائیں سائیں کرتا دماغ سن ہو گیا، منجمد ہو گیا، قریب تھا کہ وہ چکرا کر گر پڑتی، مدہوش ہو جاتی، خوف سے بے ہوش ہو جاتی، معاً فلیٹ کے اندر بھاری قدموں کی آواز سنائی دی تھی، نیل بر نے دل ہی دل میں خدا کو مدد کے لئے پکارا۔

''اللہ کوئی فرشتہ بھیج۔''

لیکن اس کی دعا در و بام پہ ہی اٹک گئی تھی، وہاں کوئی فرشتہ نہیں آیا تھا، بلکہ تین چار شیطان

تھے اور ان میں سے ایک کی شکل تو خاصی دیکھی بھالی تھی، امریکہ کے ہر تھرڈ کلاس فحش میگزین میں اس کا فوٹو شوٹ ضرور ہوتا تھا، وہ غلیظ چہرے والا اس وقت کا خاصا مشہور پورن اسٹار تھا اور نیل بر پہ کھڑے کھڑے پوری عمارت کا ملبہ آن گرا، اس کا سانس بند ہونے لگا اور کلیجہ حلق میں آ گیا تھا۔

وہ سمجھ چکی تھی اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا؟ یقینی طور پر ڈینی اپنے شرمناک عزائم کی تکمیل کا ارادہ رکھتا تھا اور نیل بر کی پورنوگرافک فلم بنانے کے لئے سیٹ تیار کیا جا رہا تھا۔

باہر اس کی پیدا کرنے والی نشے میں نیم مردہ تھی، جتنی اس نے ڈرنک کر رکھی تھی، مشکل ہی تھا کہ وہ سانس لینے کے قابل رہتی، وہ اس کی کیا مدد کرتی؟ نیل بر کو ان حالوں میں پہنچانے والی وہی بدبخت عورت تھی، نیل بر کا دل چاہا، وہ ذلت کے ان لمحات سے پہلے خودکشی کر لے اور اپنی جان کو جان آفرین کے سپرد کر دے، لیکن مرنے کے لئے کسی ہتھیار کا ہونا ضروری تھا، کوئی زہر، کوئی خنجر، کوئی پستول، کوئی تو ایسی چیز ہوتی، جس کو اٹھا کر وہ اپنی گردن یا کلائی پہ دے مارتی، اس کے قریب کچھ بھی نہیں تھا، بلکہ اس کنگال کمرے میں ایک بیڈ کے علاوہ کچھ نہیں تھا، وہ کرے تو کیا کرے؟ اس نے اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا۔

''اللہ میری مدد کر...... میری مدد کو پہنچ، مجھے اس ذلت سے بچا۔'' جیسے جیسے سیٹ تیار ہوتا رہا، نیل بر کی ہمتیں دم توڑتی رہیں، اسے وہ برزخ لمحات اب بھی یاد تھے، وہ سارے زخم اب بھی یاد تھے، ان نوکیلی بالکونیوں میں کھڑے ہو کر اپنے ماضی کو یاد کر کے رونا بہت اذیت ناک نہیں تھا، وہ یہاں تھی اور اس دل برباد کرنے والی اذیتوں سے دور تھی۔

اسے یاد تھا، جب اسے نشے میں مدہوش کرنے کے لئے انجکشن دیئے گئے، اس کی کلائیوں کو برہنہ کیا گیا، اس حال میں کہ نیل بر انہیں روکنے پہ قادر نہیں تھی، وہ لوگ جو حیوان تھے اور درندے تھے، سور کا گوشت کھانے والے حرامی تھے، ان میں انسانیت کہاں سے آتی؟ وہ ہوش میں ہوتی تو خود کو اس حال میں دیکھنے سے پہلے ختم کر لیتی، جانے وقت کا پہیہ ایک دم الٹا کیسے چلا، نیل بر کو کچھ ہوش نہ تھا، بس اسے اتنی سمجھ آئی کہ ایک دم کرشیان کے فلیٹ پہ چھاپہ پڑا تھا، پولیس کا دھاوا بولنا اور ان حرامیوں کا تتر بتر ہو جانا، وہ لوگ ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

نیل بر دو دن تک بے ہوش رہی، صدمے نے اس کے حواس چھین لئے تھے، جب وہ ہوش میں آئی تو اس کی آخری پونجی بھی لٹ چکی تھی، کرشیان مر چکی تھی، ہاں جانے سے پہلے وہ نیل بر پر اتنا احسان کر گئی کہ اس کے باپ کا اتا پتہ تھما گئی۔

اس کے والد پیدائشی خانزادے تھے، اپنی کھوئی ہوئی بیٹی کو پا کر جذباتی ہو گئے، وہ اسے ایک لمحے کے لئے بھی امریکہ میں رہنے دینے کے حق میں نہیں تھے، یہاں پہ اس کی ایک مخلص سہیلی کام آ گئی، اس نے بابا کو سمجھایا کہ نیل بر کو ڈگری مکمل کرنے دیں، تب وہ ڈیڑھ سال مزید اس ملک میں رہی، جس سے اسے شدید نفرت تھی، وہ ڈیڑھ سال بہترین عرصہ تھا، اس نے زمانے بھر کی عیش کے مزے لوٹے تھے، بابا اسے دل کھول کر روپیہ بھیجتے، نیل بر نے ٹکے ٹکے کی نوکریاں چھوڑ دیں، اپنی تعلیم مکمل اور پھر سب کچھ چھوڑ کر بابا کے نگر پہنچ گئی، تب اس کی جلی ہوئی آنکھوں میں خوابوں کی راکھ کے علاوہ کچھ نہ تھا، زندگی اس کے لئے ختم ہو چکی تھی، وہ اپنا سب کچھ لٹا آئی تھی، اس کے اندر

زندگی مرچکی تھی۔

یہ حمت تھی، جس نے نیل بر کے زخموں پہ مرہم لگایا تھا، اس کا کھویا ہوا اعتماد بحال ہوا تو پہلے والی نیل بر ایک نئے سورج کے ساتھ طلوع ہوئی تھی۔

نیل بر کو اندازہ ہوا کہ یہاں پہ کچھ لوگوں کو اس کے وجود سے دشمنی ہے، جن میں صندیر خان اور اس کی دادی سرفہرست تھے، نیل بر نے ان دو لوگوں کے ساتھ کھلم کھلا محاذ آرائی شروع کر لی تھی، اگر یہ لوگ ایسے تھے تو نیل بر بھی ایسی ہی تھی، اسے اپنا حق لینا اور اپنے حق کے لئے لڑنا آتا تھا۔

لیکن بعد میں بہت کچھ بدل گیا تھا، نیل بر کے لئے سب کچھ ہی بدل گیا تھا، امام کے لئے پسندیدگی کے جذبات اگر ایسی قیامت لانے والے تھے تو اس مغرب کی پروردہ لڑکی کو بہت سوچ کر قدم اٹھانا تھا، مگر ایسا نہیں ہوا نیل بر نے اپنے لئے عذاب خود خریدے اور امام کے لئے بھی۔

وہ خود تو ایک محفوظ مقام پر پہنچ گئی تھی، لیکن کیا امام بھی محفوظ تھا، اس سوچ نے نیل بر کو بے قرار کر دیا تھا، وہ رات بھر جاگتی رہی، روتی رہی، اپنے کردہ نا کردہ گناہوں کی معافی مانگتی رہی، امام کی سلامتی کے لئے دعائیں کرتی رہی۔

وہ خود ایک برزخ سے نکل آئی تھی، جہاندار اس کے لئے ایک نجات دہندہ تھا، لیکن وہ امام کو شعلوں کے حوالے ضرور کر آئی تھی، وہ بھی اس صورت میں جبکہ وہ بے گناہ تھا، نیل بر خود کو اس احساس گناہ سے چھٹکارا دلانے میں ناکام تھی۔

اگر جہاندار نہ ہوتا تو جانے اس کا کیا بنتا؟ اس کے لئے جہاندار نجات بن کر آیا تھا اور امام کے لئے نجات کا باعث کون ہوتا؟

وہ اس عالیشان پرانی طرز کے قدیم گھر کی راہداریوں میں ٹہلتے ہوئے اپنی قسمت پہ رشک کرتی تھی۔

وہ ذات پات کی اونچائیوں اور رنگ ونسل کے فرق سے مبرا تھی، اسی لئے جہاندار جیسے نجات دہندہ کو پا کر بہت خوش تھی۔

اگر وہ خانزادوں کی نگاہ سے دیکھتی تو جہاندار کچھ بھی نہیں تھا، ایک غریب، مفلس اور بے نام ونشان انسان اور اگر وہ اپنی نگاہ سے دیکھتی تو جہاندار پر فخر کرنے کے لئے بہت کچھ تھا۔

ایک زمانے میں وہ اسے سب سے برا لگتا تھا، کیونکہ وہ اس کی ہر وقت مخبری کرتا تھا، اس کی ٹوہ میں رہتا تھا، اس کی جہاندار سے کبھی نہیں بنی تھی۔

لیکن اب سب کچھ بدل چکا تھا۔

جس طرح امریکہ اس کے لئے ماضی بن چکا تھا، ایسے ہی بیال بھی ماضی بن گیا تھا، وہ ماضی کی راکھ میں چنگاریاں تلاش کرنے والوں میں سے نہیں تھی، وہ نئی کہکشاؤں کی منتظر رہتی، یہی نیل بر کا کمال تھا۔

اگلے چند دنوں تک نیل بر نے خود کو مزید اس ماحول میں ڈھال لیا تھا، اسے جب اسی سمندر میں رہنا تھا، تو مگر مچھ سے بیر کیوں رکھتی؟

ایک بات تو طے تھی، نیل بر کبیر نے ذہنی طور پر جہاندار کے ساتھ اور اس کے احسان کو قبول کر لیا تھا، حقیقت پسندی کا یہی تقاضا تھا، خوابوں کے پیچھے خوار ہونے سے بہتر تھا وہ اپنے حال میں جاگتی آنکھوں سے کچھ اچھی امیدیں لگا لیتی، یہی کہ پراسرار سے جہاندار کے کچھ اچھا ہو جانے کی امیدیں۔

وہ اتنے دنوں سے آج بھی اتنا ہی سنجیدہ، پراسرار اور اجنبی تھا، ضرورتاً بھی بات نہیں کرتا تھا، دن بھر جانے کہاں کہاں مصروف رہتا، جہاندار کا ایک خاندانی ملازم تھا، بابا فردوسی، وہ گھر کی دیکھ بھال بھی کرتا تھا اور نیل بر کو طرح طرح کے قصے بھی سناتا، نیل بر کو کچھ باتوں کی سمجھ آتی تھی کچھ نہیں آتی تھی، لیکن نیل بر کو فردوسی بابا بہت دلچسپ لگتا تھا۔

ایک دن وہ پرانے طرز کے باورچی خانے کو رگڑ رگڑ کر صاف کرتا چلغوزے ٹونگتی نیل بر کو دیکھ کر ایسے ہی بے خیالی میں بولا تھا۔

''ام کو تو بڑی حیرت ہے، خان نے اچانک شادی کیسے بنا لیا، اس نے تو شادی نہ کرنے کا قسم کھا رکھا تھا۔'' بابا کی بات نے نیل بر کو بری طرح سے چونکا دیا تھا، چلغوزے اس کے حلق میں اٹک سے گئے تھے۔

''کیوں بابا؟''

''آہ، تم کو نہیں پتا۔'' بابا نے ٹھنڈی آہ بھری تھی، وہ پرانی طرز کے چولہوں میں اب چھوٹی لکڑیاں بڑے طریقے اور مہارت سے جوڑ رہا تھا، اس کے بوڑھے چہرے پہ سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔

''جب یہ گھر برباد ہوا؟ جب سب کچھ ختم ہو گیا تھا، یہ گھر اجڑ گیا تھا، تب خان ملک سے باہر تھا، جب آیا تو اس گھر میں کچھ بھی نہیں بچا تھا، سوائے تباہی اور بربادی کے، تب خان نے خود سے عہد کیا تھا، انتقام کا عہد، بدلے کا وعدہ۔'' بابا کی آواز غم میں ڈوب سی گئی تھی اور نیل بر جیسے ششدر رہ گئی تھی، کئی لمحے تو اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا تھا، اسے لگ رہا تھا، جہاندار کی پراسراریت کے پیچھے کچھ تھا؟ کچھ ایسا جو ہرگز بھی اچھا نہیں تھا۔

''اس گھر میں کیا ہوا تھا بابا؟'' نیل بر کے لبوں سے ایک سرسراتی آواز ابھری تھی، بابا نے نیل بر کے حواس کھوتے انداز کو دیکھا اور سرسوں جیسی رنگت کو، وہ لمحہ بھر کے لئے چپ سا ہو گیا تھا۔

''کیا ہوا تھا بابا؟ بتائیے نا۔'' نیل بر کے اندر بے چینی بڑھنے لگی تھی، اسے لگا، جیسے کوئی صدیوں پرانا راز کھلنے والا تھا، کچھ ایسا معلوم ہونے والا تھا، جو اس کے لئے قطعی طور پر اچھا نہیں تھا۔

''کچھ زیادہ نہیں ہوا تھا۔'' ایک دم ماحول میں چھایا سکوت ٹوٹ گیا تھا، نیل بر کے ہاتھ سے چلغوزوں کی پلیٹ گر گئی تھی، وہ اچھل کر لکڑی کے قدیم سے اسٹول پہ دباؤ ڈالتی اٹھی، اگر ایسا نہ کرتی تو گر جاتی۔

''بابا! باہر تمہارا چچا زاد بھائی ملنے کے لئے آیا ہے۔'' معاً اس نے بابا کو مقامی زبان میں بتایا تو وہ سر پہ ہاتھ مارتا تیزی سے باہر نکل گیا تھا، جیسے کچھ اچانک یاد آیا ہو، نیل بر ایسی گم صم تھی کہ بابا

کو نکلتے دیکھ کر بھی نہ سمجھ سکی، جہاندار نے بابا کو جان بوجھ کر باہر بھیجا تھا، اب وہ نیل بر کی طرف متوجہ تھا اور اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

''جو پوچھنا ہے مجھ سے پوچھو، میرا خیال ہے میں بہتر جواب دوں گا۔'' جہاندار کی آواز نیل بر کو سوچوں کے ہجوم سے کھینچ لائی تھی۔

''بابا نے جو کہا، کیا سچ ہے؟'' اس کی آنکھوں میں عجیب سا ہراس پھیل رہا تھا۔

''کیا سننا چاہتی ہو؟'' جہاندار کی آواز پربتوں پر جمی برف کی طرح ہی برفیلی تھی۔

''وہی جو سچ ہے۔'' نیل بر نے مدہم آواز میں کہا تھا، وہ جہاندار کی خوفناک حد تک سرخ ہوتی آنکھوں کی لالی اور ویرانی سے سہم گئی تھی۔

''سچ کا سامنا کرنا بہت مشکل ہے۔'' جہاندار کی آواز ابھری تھی، وہ آگے بڑھ کر کچن کی کھڑکیوں کے قدیم پٹ کھول رہا تھا، یوں کہ دور تک پولو کا سنسان گراؤنڈ نظر آنے لگا، البتہ گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز کہیں نہیں تھی، ہر طرف خاموشی اور ویرانی تھی۔

''یہ سامنے دیکھ رہی ہو، یہ پولو گراؤنڈ ہے، کبھی جہاندار اور اس گھر کی بالکونیوں میں کھڑا ہو کر اس گراؤنڈ کے سپہ سالار اور سب سے اعلیٰ نسل کے گھوڑے کے شہہ سوار کو دیکھا کرتا تھا، جانتی ہو وہ کون تھا؟'' جہاندار کی سرخ آنکھوں میں شیشے جیسی کوئی چیز چمک رہی تھی، نیل بر کا سر بے ارادہ ہی اثبات میں ہل گیا تھا اور پھر اس نے بے ساختہ ہی نفی میں سر ہلایا، وہ اپنی بے خیالی پہ دم بخود تھی۔

''وہ فرخزاد تھا، میرا بھائی۔'' جہاندار کے الفاظ نے نیل بر کو دم بخود کر دیا تھا، اس کے سر میں زور زور سے دھماکے ہونے لگے تھے، ہر طرف جیسے ایک ہی پکار تھی، ودھا فرخزاد، ودھا فرخزاد۔

''اور اس سے بڑا میرا باپ جیسا ایک اور بھائی تھا، اردشیر شاہ۔'' جہاندار کے الفاظ نیل بر کی ہستی کو فنا کر رہے تھے، خوف دکھ اور صدمے کی کس انتہا پہ جہاندار نے اچانک اسے پاتال میں دھکیل ڈالا تھا۔

''شیر لالا اور فرخزاد کو تمہارے باپ نے اپنے ہاتھ سے بہیمانہ طور پہ قتل کیا تھا، سردار کبیر بٹو نے۔'' وہ بھاری دریچوں پہ ہاتھ پھیرتا کسی زخمی درندے کی مانند لگ رہا تھا۔

''میرے دونوں بھائی بے گناہ تھے، دونوں کو ایک ساتھ قتل کیا، دونوں کی دو میتیں اٹھا کر اس گھر میں لانا ایک قیامت تھی، جو میری بڑی ماں پہ گزری، شیر لالا کی ماں انہیں ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ شام سے پہلے ہی مر گئیں اور اس صدمے نے میری ماں کی بھی جان لے لی، میرے باپ کا گھر برباد ہو گیا، میرے دونوں بھائی اجڑ گئے برباد ہو گئے اور وقت سے پہلے مٹی کی ڈھیریوں تلے دب گئے۔'' وہ ماضی کے ایک ایک زخم سے کھرنڈ اتار رہا تھا، وہ اپنے زخموں کو تازہ کر رہا تھا، وہ نیل بر کو پاتال میں دھنسا رہا تھا۔

''تمہارے باپ نے ہماری سونے جیسی زمینوں پر قبضہ کر لیا، ہمارا بیال والا گھر، گنہ گار پہاڑی والی سونا اگلتی زمین سب کچھ کبیر بٹو کے تسلط میں تھا، اس نے جرگہ بلوا کر من پسند فیصلے کروا لئے، فرخزاد کو ودھا کے ساتھ بدنام کر دیا، اگر وہ ایسا نہ کرتا تو یہ قتل اسے پھانسی کے تختے تک لے

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ 5.L/78 تحصیل وضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

جاتے، وہ جو اس کی بھتیجی تھی اور فرخزاد دشمنوں کا لڑکا، اس نے دونوں کا صفایا کر دیا، لیکن اس سے بھی پہلے تمہارے باپ نے بڑے بڑے جرم کیے ہیں، شیر لالا کی بہن میری بڑی آپا غنچہ گل کو طلاق دے کر، تمہارے باپ کی طرف میرے بڑے حساب ہیں، ایک ایک حساب کو چکانا ہے، مجھے فرخزاد اور شیر لالا کے خون کا بدلہ لینا ہے، مجھے سردار کبیر بٹو کو برباد کرنا ہے، جس طرح اس نے ہمیں برباد کیا، مجھے اپنی کھوئی ہوئی زمینیں واپس لینی ہیں اور تم اس بدلے کا پہلا سنگ میل ہو، میری پہلی کامیابی۔" وہ اچانک تھرتھر کانپتی نیل بر کی طرف مڑ آیا تھا، ایک اور ہی جہاندار کے روپ میں، وہ اس جہاندار کو نہیں جانتی تھی، وہ اس جہاندار سے واقف نہیں تھی۔

یہ ایک درندہ صفت اجنبی جہاندار تھا، جو اس کا محافظ تو ہرگز نہیں تھا، جہاندار نے نیل بر کی ہنسلی کی ہڈی پہ اپنا پنجہ جما دیا تھا، نیل بر کی بے ساختہ چیخ نکل گئی، پھر وہ اسے گھسیٹتا ہوا ایک ہال میں لے آیا تھا، ایک بڑا سا کمرہ تھا جس کے ایک کونے میں دو پلنگ تھے، نیل بر اسی کمرے میں اتنے دنوں سے قیام پذیر تھی، پھر اچانک جہاندار کی سلگتی گرم اور آگ اگلتی آواز کمرے کے درجہ حرارت کو بڑھا گئی تھی۔

"یہاں پہ فرخزاد اور لالا کی میتیں رکھی گئی تھیں، اسی کمرے میں، یہی میری جائے پناہ اور مسکن ہے، میں اسی کمرے میں سوتا ہوں، اسی کمرے میں سوچتا ہوں، اسی کمرے میں رہتا ہوں، تاکہ ایک دن بھی میں اپنے مقصد حیات سے ہٹ نہ سکوں، یہی کمرہ تمہارا بھی موت تک ٹھکانہ ہے، تم میرا انتقام ہو، میرے اندر بڑی پیاس ہے، بڑی آگ ہے، خون کی پیاس ہے، تمہارا خون پیوں گا تو کبیر بٹو کی زندگی کا سکون حرام ہو گا، میں اسے آسان موت نہیں دوں گا، تمہیں تڑپا تڑپا کر اس سے انتقام لوں گا، تم میرا اس جنگ میں واحد پر اثر ہتھیار ہو، سنا تم نے، تم میرا انتقام ہو۔" وہ کسی زخمی بھیڑیے کی مانند لگ رہا تھا۔

ویسا ہی جنگلی اور وحشی، جیسا کبیر خان تھا، یا جیسا صندیر خان تھا، تو کیا فرق تھا کبیر خان اور جہاندار میں، نیل بر کے قدموں تلے سے زمین سرک رہی تھی، وہ کسی اندھی کھائی میں گر رہی تھی، قریب تھا کہ وہ ایسے بھیانک اور ہولناک انکشاف پہ پورے قد سے ڈھے جاتی، معاً جہاندار نے اسے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا تھا۔

"نہیں نیل بر! تمہیں کچھ نہیں ہو گا، نہ تمہیں کچھ ہونے دوں گا، اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میرا انتقام کہاں جائے گا؟ نہیں میری جان! بی ریلیکس، اپنے حواسوں میں رہو، آج تو میں تم سے اپنے رشتے کا باقاعدہ آغاز کرنے والا ہوں، تاکہ تمہیں اندازہ ہو، اب تمہاری کیا حدود ہیں؟ امریکہ اور امام بہت پیچھے رہ چکے ہیں، اب زندگی کا ایک نیا سفر ہے اور بڑا ہی پر خطر سفر ہے۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر پلنگ تک لے آیا تھا، اس حال میں کہ نیل بر کا پورا جسم کپکپا رہا تھا، وہ خوف سے نیلی پڑ رہی تھی، یہ وہ جہاندار نہیں تھا جسے نیل بر جانتی تھی، یہ وہ جہاندار بالکل نہیں تھا۔

"تمہاری اس فوت شدہ محبت پہ افسوس کرنا باقی ہے، لیکن ایک اطمینان رکھو تم، وہ بچ گیا ہے، عقل مند ہوا تو واپس یہاں نہیں آئے گا۔" اب وہ کسی اور ہی لہجے میں بول رہا تھا، نیل بر کے سائیں سائیں کرتے دماغ میں کچھ بھی سما نہیں رہا تھا، اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی، بس دل کے

اطمینان کے لئے اتنا ہی کافی تھا، امام زندہ تھا، ہاں اس کے احساس جرم کے لئے یہ اطمینان کافی تھا۔

''کیا ہے نیل بر! کہ میں بیک وقت جابر اور رحم دل واقع ہوا ہوں، مجھے ترس آ جاتا ہے، جیسے تمہاری اس قابل رحم حالت پہ ترس آ رہا ہے ابھی، تو جب جب مجھے تم پہ ترس آیا، ایک بات کو سمجھ لینا، تمہارا نصیب اس دن بدل جایا کرے گا، جیسے آج کی رات بدل جائے گا، آؤ دیکھو کہ آسمان پہ ستارے ہیں اور چاند اپنی طے شدہ منزلوں پہ نکلتا ہے، چلتا ہے اور ڈھلتا ہے، یوں سمجھو کہ دنیا ابھی اندھیر نہیں ہوئی۔'' جہاندار نے کھلی کھڑکی کے پٹ سے جھانکتے آسمان کو دیکھا اور پھر دریچے بند کر دیئے۔

''میں نے سوچا کہ تمہارے حسن کو خراج تحسین پیش کروں، یہ کام اس نے کرنا تھا جو کر نہ سکا، جس کے ساتھ تم بھاگی، پر ناکام ہو گئی۔'' اسے لفظوں سے تیر مارنے کا سلیقہ آتا تھا، نیل بر نے اس کا ایک ایک طنز اپنے اندر اتار لیا تھا، وہ سمجھ گئی تھی، وہ ایک روایتی معاشرے میں تھی اور اس کا پالا روایتی مردوں سے ہی پڑا تھا، پھر وہ عام عورتوں سے مختلف کیسے ہو سکتی تھی؟ اسے جہاندار کے ہر قسم کے طعنے کو سہنے کے لئے تیار رہنا چاہیے تھا۔

''زندگی میں ہر کامیابی ہمارے لئے تھوڑی ہوتی ہے نیل بر شہزادی، کبھی ناکامی کا مزہ بھی چکھنا چاہیے۔'' وہ عجیب انداز میں مخاطب تھا، اس کے قریب بیٹھا ہوا اپنے تئیں نیل بر کے ناکام عشق پہ افسوس کرتا ہوا، کیا نیل بر کو اسے وضاحت دینی چاہیے تھی، اس کی غلط فہمی کو دور کرنا چاہیے تھا؟

شاید نہیں، وضاحت وہاں دی جاتی ہے جہاں کوئی وضاحت لینا چاہیے، یہاں پہ اسے اندازہ ہو چکا تھا، وہ ہمیشہ سر جھکا کر سنتی رہے گی، کیونکہ اس کے باپ نے اسے سر اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

''تمہاری زندگی گلگت کے اس مکان تک محدود ہو چکی ہے، تم یہاں کی قیدی ہو، پربتوں کی قیدی، یہاں سے نکلو گی تو موت کو آواز دو گی، یہاں رہو گی تو غلام رہو گی، آج ایک فیصلہ کر لو، باندی بننا منظور ہے یا مرنا؟ ایک بات تو طے ہے تم یہاں سے ایک ہی صورت میں نکل سکتی ہو، مردہ حالت میں، یہاں رہو گی تو محفوظ رہو گی، صندیر خان کی خونی نگاہوں سے، ہر قسم کی بلاؤں سے کیونکہ مجھ جیسی خون آشام بلا کے ہوتے ہوئے کوئی اور یہاں پر بھی نہیں مار سکتا۔'' وہ اپنے انداز کا ایک ہی تھا، فیصلہ سناتا ہوا، وہ کون سا مشورہ دے رہا تھا، اس نے صرف حکم سنانا تھا اور نیل بر کی حیثیت بدل چکی تھی، کل وہ اس پہ حکم صادر کرتی تھی، آج اس کا حکم سننے پہ مجبور تھی۔

لیکن جہاندار کے آدرش اور ارادے جان کر وہ مزید خاموش نہیں رہ سکی تھی، اس نے پہلی مرتبہ جہاندار کی پیش قدمی کو محسوس کر کے لب کشائی ضرور کی تھی۔

''تم اپنا انتقام لو، رشتہ مت نبھاؤ۔'' اس کے الفاظ جہاندار کو اپنی انا پر تازیانے کی مانند لگے تھے۔

''یہ فیصلہ کرنے والی تم کون ہوتی ہو؟'' جہاندار غصے میں لال ہو گیا تھا، اسے نیل بر کی

مزاحمت تیر کی مانند لگی تھی۔

''انسان ایک وقت میں یا ظالم ہوتا ہے یا مظلوم ہوتا ہے، یا قاتل ہوتا ہے، یا مقتول ہوتا ہے۔'' نیل بر کے الفاظ نے جہاندار کی برہمی بڑھادی تھی۔
''میں نے کبھی انکار نہیں سنا۔'' اس طیش آنے لگا۔
''میں نے کبھی ازار نہیں سہا۔'' وہ بے بس تھی۔
''تم اپنی حیثیت بھول رہی ہو۔'' جہاندار کے تاثرات بگڑ رہے تھے۔
''یہاں فیصلے کا اختیار تمہارے پاس نہیں۔'' نیل بر کا سر جھک گیا، لیکن وہ ایسی نہیں تھی، جو جہاندار کے سامنے زیر ہو جاتی۔
''میں نے کہا، تم اپنا انتقام پورا کرو، رشتے کی بات مت کرو۔'' وہ جیسے بے بسی سے چلا اٹھی تھی، جہاندار اسے دیکھتا رہا، سوچتا رہا، غصہ پیتا رہا اور پھر مسکرا دیا۔
''اس وقت کے لئے میں نے اتنا انتظار کیا ہے؟ کنواں پاس ہے اور میں پیاسا ہوں؟ سردار کبیر بٹو کے اتنے قیمتی سرمائے سے فائدہ نہ اٹھاؤں؟ میں احمق نہیں ہوں نیل بر۔'' وہ پلنگ پہ نیل بر سے کچھ فاصلے پہ لیٹا تھا، کہنی کے بل نیم دراز سا، اب خاصے ریلیکس موڈ میں مسکرا رہا تھا، نیل بر اس سے ایک ہاتھ کے فاصلے پہ تھی، وہ چاہتا تو اسے چھو لیتا اور اس نے ایسا ہی کیا، اپنے جائز سرمائے کو، دونوں بازوؤں میں سمیٹنا ایک خواب آگیں تجربہ تھا، جہاندار کی روح تک شانت ہو گئی تھی، اسے لگا، سردار بٹو کے نزخرے پہ پاؤں تو اب ہی آیا تھا، کوئی سردار سا احمق ترین انسان دنیا میں موجود تھا، اپنے ہاتھ سے اپنی بربادی کو آواز دینے والا۔
''پلیز جہاندار۔'' نیل بر اس سچویشن کے لئے تیار نہیں تھی، وہ بری طرح سے جھنجھنا کر خفیف ہو گئی، یہ اس کے لئے ایک ناخوشگوار تجربہ تھا، اس کا چہرہ خفت سے سرخ پڑ گیا، اس نے سوچا بھی نہیں تھا، نجات دہندہ اس کے لئے ایسی سچویشن بھی کری ایٹ کرے گا اور اسے اندازہ نہیں تھا، زندگی میں یہ موڑ بھی آئے گا اور وہ بھی اس طریقے سے؟
''اتنے سالوں کی تپسیا کے بعد یہ مبارک گھڑی نصیب ہوئی ہے، وہ میں اس ادا پہ قربان نہیں کر سکتا، تمہیں تیار رہنا چاہیے، میں تمہیں بھگا کر نہیں لایا، ان کی نسلوں پہ احسان جتا کر لایا ہوں۔'' اسے تیر برسانے کا فن آتا تھا اور وہ اپنے فن کمال پہ تھا۔
''تو اب کیا چاہتے ہو؟'' وہ خفت سے لال ہوتی بمشکل اس کی سخت گرفت میں مچل کر بولی تھی، آزادی کا تو سوال ہی نہیں تھا، اس کا شکنجہ سخت تھا، گرفت مضبوط تھی۔
''اتنی دیر میں پہلا عقل مندانہ سوال کیا ہے۔'' وہ بڑے گمبھیر لہجے میں بولا تھا، اس کے رخساروں کو ہونٹوں سے چھوتا ہوا، اس حال میں نیل بر کی مذاحمت بیکار تھی، وہ قطعی طور پہ خود کو بے بس محسوس کر رہی تھی، اوپر سے جہاندار کی بڑھتی ہوئی گستاخیاں، ایک طرف وہ انتقام میں اندھا ہو رہا تھا اور دوسری طرف حقوق و فرائض کی جنگ بھی جیتنا چاہتا تھا۔
''تعلق اپنی جگہ اور انتقام اپنی جگہ۔'' اس کا لہجہ بلا کا سخت تھا اور انداز مخمور سا۔
''اور مجھے تسلط قائم کرنے کی عادت سی ہے۔'' وہ شاید مسکرایا تھا، نیل کو پہلی مرتبہ اندازہ ہوا

تھا، جہاندار کی نفرت کو سہنا بھی آسان نہیں تھا اور قربت کو سہنا تو بالکل بھی آسان نہیں تھا، وہ کسی بے جان مورت کی طرح اس کے حصار میں تھی اور اس کی تمام مزاحمتیں دم توڑ گئی تھیں۔
"میں بہت اچھا منصوبہ ساز ہوں، کیا مان گئی ہو؟" جہاندار اس کے رخساروں پہ اپنے جذبوں کی شدتوں کو نچھاور کرتا اسے ہر طرح سے بے بس کر چکا تھا۔
"اور ابھی تم مزید میرے کمالات دیکھو گی، قربت کے بھی اور نفرت کے بھی۔" اس کی مسکراہٹ میں کچھ پراسراریت اتر آئی تھی۔
"تم یقیناً بہت اچھے منصوبہ ساز ہو، لیکن دیکھ لینا، انتقام میں اگر حد سے بڑھے تو کہیں زیادتی کے مرتکب نہ ہو جاؤ، میں تو صرف اتنا کہوں گی، اپنے باپ کے گناہوں میں نیل برکہیں حصہ دار نہیں تھی۔" اس کے بے آواز آنسوؤں جہاندار کے گریبان میں اتر گئے تھے۔
رات دھیرے دھیرے بھیگ رہی تھی، گزر رہی تھی، پھسل رہی تھی، نیل بر قطرہ قطرہ سلگ رہی تھی، پگھل رہی تھی۔

☆☆☆

نکاح کے وقت عجیب وغریب سی بھاپ اٹھنے لگی۔
بھانت بھانت کی بولیاں تھیں، آوازیں تھیں، سرگوشیاں تھیں اور اس میں کہیں اسامہ کی بلند ہوتی تلخ آواز، وہ غصے سے مٹھیاں بھینچتا، ٹہلتا اور چیخ پڑتا۔
"صاف انکار کر دیں، ہمیں منظور نہیں ہے۔" وہ غیظ وغضب سے لال پڑ رہا تھا، ابو خاموش تھے، چچا پریشان اور امی آگ بگولا، اوپر سے لگائی بجھائی کرنے والی خالائیں بھی پیش پیش تھیں۔
"اتنے مہمان ہیں، بہت رسوائی ہو گی۔" ابو کچھ دیر بعد ٹھنڈی آہ بھرتے تھے، تب امی چلا اٹھتیں۔
"ہوتی ہے ہوتی رہے، ہم کیا فٹ پاتھ پہ پہنچ جائیں، شرم نہیں آتی فرح کو، ایسی ڈیمانڈ کرتے ہوئے۔" امی کا غصہ سوا نیزے پہ تھا اور اسامہ تن فن کر رہا تھا۔
"بات یہ نہیں کہ ہم فٹ پاتھ پر آ جائیں گے، بات اس ناجائز خواہش اور ڈیمانڈ کی ہے، ایسا ہرگز نہیں ہوگا، یہ تو صاف نظر آ رہا ہے، وہ لالچ کے تحت رشتہ کر رہے ہیں، آپ نے پھپھو کا لہجہ ملاحظہ نہیں کیا، اگر نشرہ کے نام پورا مکان لگے گا تو تب نکاح ہوگا ورنہ وہ بارات واپس لے جائیں گے، یہ دھمکی نہیں تو کیا ہے، اوپر سے ولید کی خاموشی اور پھوپھا کی نخوت، وہ لوگ صلاح کر کے آئے ہیں، کروڑوں کی مالیت کا یہ مکان ہتھیا کر رہیں گے۔" اسامہ کی کنپٹیاں سلگ رہی تھیں، پھپھو کی بلیک میلنگ نے ہر ایک کو دھنگ کر دیا تھا۔
"وہ اپنے بزنس کا خسارہ اسی مکان سے پورا کرنا چاہتے ہیں، لکھوا لیں مجھ سے، نشرہ میں انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔" نومی نے بھی اپنا خیال ظاہر کیا تھا، جس پہ سب ہی متفق ہو رہے تھے۔
"اسی لئے وہ فوری شادی پہ بضد تھی، مجھے تو خبر تھی دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔" امی نے سینہ مسلتے ہوئے آنسو پونچھے، فرخ کی خود غرضی نے بڑے زور کا دھکا لگایا تھا، صد شکر کہ ان کی عینی بچ گئی تھی، ایسے خود غرض رشتے دار۔

اسامہ کو کسی پل چین نہیں تھا، وہ موبائل اٹھاتا، کچھ نمبر پریس کرتا اور پھر لب بھینچ کر بے بس ہو جاتا، فیصلہ مشکل تھا، بہت ہی مشکل تھا، مگر ہو گیا، بالآخر وہ ایک حتمی نتیجے پہ پہنچ گیا اور اس نے چند الفاظ موبائل پہ ٹائپ کیے اور ایک دم صوفے پہ ڈھے گیا، جیسے صدیوں کی مسافت طے کر کے آیا ہو، اب وہ بار بار اپنے بھیجے ہوئے پیغام کو پڑھ رہا تھا۔

''زندگی میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے، جو انسان کو بے بس کر دیتا ہے، میں اسی مقام پہ موجود ہوں اور تمہاری مدد کا منتظر ہوں، ایک بات سمجھ لو جگر، زندگی کو اتنی آسان چیز نہیں سمجھتے، لیکن کبھی کبھی زندگی ہمارے لئے آسان اور مہربان ہو جاتی ہے، اس وقت زندگی تیرے یار کا امتحان لے رہی ہے اور تجھ پہ مہربان ہو رہی ہے، اگر چاہتے ہو کہ اس جگنو سی گم گشتہ محبت کو پالو تو فوراً آ جاؤ، میں اور تمہاری محبت منتظر ہیں۔'' اسامہ بار بار اپنے لکھے الفاظ کو دیکھتا تھا اور سوچتا تھا، کیا اس نے ٹھیک کیا کہیں اس نے نشرہ کو ہیام کی نگاہ میں ارزاں تو نہیں کر دیا۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، اسامہ کے برادرانہ جذبات اس پر حاوی ہو رہے تھے، کبھی دل کہتا ولید اور پھپھو کی ڈیمانڈ پوری کر دے، اور کبھی دل کہتا کہ ان پہ لعنت ڈال کر ابھی کہ ابھی اپنا فیصلہ سنا دے اور پھر آخر کار مہمانوں کی بڑھتی سرگوشیوں اور فرح پھپھو کے نفرت انگیز واویلے پہ اسامہ نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

اس نے فرح پھپھو کو جواب دے دیا تھا۔

جس نے سنا دل تھام لیا، آخر اسامہ کیا چاہتا تھا، نشرہ کی بارات کو واپس بھیج رہا تھا، اس بات سے بے خبر کہ بارات واپس جاتی تو کیا بھیانک نتائج نکلتے، نشرہ کو پھر کوئی بیاہنے نہ آتا، نشرہ کے نام پہ منحوس کی چھاپ لگ جاتی، زندگی اس کے لئے پہلے ہی مشکل تھی، پھر کچھ اور مشکل ہو جاتی۔

لیکن اس سب کے باوجود اسامہ تن کہ کھڑا تھا اور پھپھو کا مقابلہ کر رہا تھا، ولید کو تو گمان ہی نہیں تھا، اسے انکار بھی ہو سکتا تھا، اس کا سارا زعم اب شدید اشتعال میں بدل رہا تھا، اس سے یہ توہین برداشت نہ ہوئی اور وہ خود تن فن کرتا اٹھ کر چلا گیا۔

اس کا مطلب تھا، ولید بھی اس گیم میں مکمل طور پر شامل تھا، اسامہ کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی تھی، وہ تو صرف آخری پتہ کھیل کر ولید کو آزما رہا تھا، کیا پتہ وہ نشرہ کی محبت کا دم بھر کے اپنی ماں اور باپ کے سامنے کھڑا ہو جاتا، لیکن ولید نے تو اسے شدید مایوس کیا تھا۔

ولید کے جاتے ہی فرح اور اس کے شوہر بھی بکتے جھکتے نکل گئے، ان کے چند ایک مہمان یہیں موجود تھے باقی سب لڑائی شروع ہوتے ہی جا چکے تھے، ویسے بھی فرح اپنے ساتھ زیادہ مہمان نہیں لائی تھی، تا کہ بات بڑھے تو بے عزتی نہ ہو، جبکہ احسان منزل تو بھری پڑی تھی، ہر جگہ مہمان ہی مہمان، کچھ فرح کے حمایتی اور کچھ فرح کے خلاف، ہر کوئی تبصرے کر رہا تھا، لوگ کانوں کو ہاتھ لگا رہے تھے۔

تائی منہ بھر بھر کے فرح کو کوسنے دے رہی تھیں، تایا سر جھکائے بیٹھے تھے، چچا بھی پریشان تھے البتہ چچی پریشان ہونے کی اداکاری ضرور کر رہی تھیں، بس ایک اسامہ اس تمام سیٹ اپ میں اپ سیٹ نہیں تھا، ورنہ باقی سب سوگ کی حالت میں بیٹھے تھے، رنگ رنگ کے لوگ اور بولیاں۔

تایا کو اپنی عزت کے جنازے کی فکر تھی، جگ ہنسائی کا غم کھائے جا رہا تھا، تائی کو غصہ بے انتہا تھا، پر یہ سکون بھی نا کافی نہیں تھا کہ گھر کی چھت تو کم از کم بچ گئی تھی۔
ایک نومی تھا، جو سب سے زیادہ بے چین نظر آتا تھا، بار بار اسامہ کو ٹہوکا دیتا اور پھر سرگوشی نما آواز میں کہتا۔
''وہ آ نہیں رہا۔''
''آتا ہی ہوگا۔'' اسامہ کے تسلی بھرے الفاظ کچھ دیر کے لئے اسے چپ کروا دیتے تھے، لیکن ایک مرتبہ پھر وہ بے چین سا ہو کر اسامہ کے کان پہ جھک جاتا تھا۔
معاً لمحوں میں منظر بدل گیا تھا، کچھ ہی دیر بعد نومی کی بے قراریوں کو بھی قرار مل گیا، ہیام کو دیکھ کر اسے زندگی میں کبھی اتنی خوشی نہیں ہوئی تھی، جتنی اس وقت ہو رہی تھی، وہ بھاگا بھاگا گیا اور اس سے لپٹ گیا، ہیام اس محبت کے مظاہرے پہ ہکا بکا رہ گیا۔
''صد شکر ہے کہ تم پہنچ گئے، ورنہ مجھے اپنی جان کے لالے پڑے تھے، کہیں قربان گاہ پہ مجھے نہ چڑھا دیا جاتا۔'' نومی ہیام سے بھینچ بھینچ کر ملتے ہوئے سرگوشی کر رہا تھا، تب ہیام اس کی بات سمجھتے ہوئے اچھل ہی پڑا۔
''پیچھے ہٹ خبیث! اس قربانی کے لئے تو میں سو دفع تیار ہوں۔'' اس نے نومی کو لات ماری اور تیزی سے اپنی طرف آتے اسامہ کی سمت متوجہ ہو گیا تھا۔
بہت دیر تک وہ دونوں ایک کونے میں کھڑے رہے، کافی دیر مذاکرات چلے، جنہیں لمبا ہوتا دیکھ کر ہیام کو ہی بار بار احساس دلانا پڑ رہا تھا۔
''دیکھ قاضی صاحب اتاؤلے ہو رہے ہیں اور مہمان بھی، باقی نشرہ کی خوشگوار زندگی کے لئے گارنٹیاں بعد میں لیتے رہنا، ابھی نکاح تو کروا دو، وہ قاضی کہیں بھاگ نہ جائے۔'' ہیام کی بے قراری پہ اسامہ نے اپنی داستان امیر حمزہ کا گلا گھونٹ اور پھر حاضرین محفل پہ دھماکہ کر دیا۔
کچھ ہی دیر میں نکاح کی کاروائی عمل میں لائی جا رہی تھی اور سننے میں آیا تھا، نشرہ بار بار بے ہوش ہوتی جا رہی تھی، جانے نکاح نامے پہ انگوٹھے لگائے تھے یا دستخط؟ نشرہ کے حواس ٹھکانے پہ نہیں تھے، کیا یہ توہین اور صدمہ کم تھا۔
آخر یہ اس کے ساتھ ہوا کیا تھا، بلکہ کیا گیا تھا، کون کون تھا جو اس گیم میں شامل تھا، کس نے اس کی شادی تڑوائی تھی، بلکہ رکوائی تھی، کیا اسامہ بھائی نے، پر بھائی نے ایسا کیوں کیا، اس سے کس جنم کا بدلہ لیا، اسے ابھی تک ولید کی آخری فون کال سنائی دے رہی تھی، ولید کے الفاظ نہیں تھے، نشرہ کے لئے موت کا پروانہ تھے۔
''یہ گھر تمہارے نام ہے نشرہ، یہ تمہاری ملکیت میں ہے، جس پہ سانپ بن کر یہ لوگ بیٹھے ہیں، میں تو صرف تمہارے تحفظ کے لئے بات کی تھی، ورنہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا، میں تو ان کی بدنیتی دیکھ رہا تھا، ان لوگوں نے بہت برا کیا ہے تمہارے ساتھ، یہ کبھی بھی تمہارے سگے نہیں تھے، اب بھی تمہیں کنوئیں میں دھکیلے گئے، انہیں یہ مکان عزیز ہے تم نہیں، میں ان بدفطرت اور لالچی لوگوں سے تمہیں آزاد کروانا چاہتا تھا مگر تمہاری قسمت ہی خراب نکلی، یہ شادی اسامہ کی ضد کے

باعث ختم ہو رہی ہے، دراصل وہ نہیں چاہتا تھا کہ تمہاری شادی مجھ سے ہو، وہ اپنے دوست کے لئے رستے ہموار کر رہا تھا، تاکہ تمہیں اس گھر سے ہمیشہ کے لئے رخصت کر دے اور یہ گھر صرف انہی کے قبضے میں رہے، یہ لوگ ہمیشہ سے لالچی تھے، تمہیں پربتوں کے اس پار دھکیل کر خود اس مکان پر راج کریں گے۔"

ولید کی بازگشت اسے پاگل کرنے کے لئے کافی تھی، فون کب کا بند ہو چکا تھا، وہ ولید کے سامنے ایک لفظ بھی نہیں بول سکی، ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکی، اسامہ بھائی کے دھوکے نے اسے کسی قابل نہیں چھوڑا تھا، اس مکان کی خاطر انہوں نے اس کی اتنی توہین کروائی، شادی کو رکوا دیا اور اسے ایک انجان بندے کے ساتھ باندھ دیا، جو ان کے گھر میں کرائے دار تھا اور اسامہ بھائی کو جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے تھے، اسے جانتے ہوئے، اسامہ نے اس کے ساتھ ظلم کیا تھا، دھوکا دیا تھا، وہ کبھی بھی اسے معاف نہ کرتی۔

ایسی ہی منفی سوچوں کی بوچھاڑ نے اس پہ غشی طاری کر دی تھی، جانے کب نکاح ہوا اور کب رخصتی؟ نشرہ کے تو حواس ہی سلامت نہیں تھے۔

پتا نہیں، ساری عمر بعد کس کس نے اسے بھینچ بھینچ کر پیار کیا تھا؟ شاید تائی نے، یا چچی نے، یا تایا اور چچا نے، اسے آخری مہربان ہاتھ ابھی تک یاد تھا اور وہ ہاتھ اسامہ کا ہاتھ تھا، جو نشرہ کے سر پہ بہت دیر تک ٹھہرا رہا اور وہ کچھ بول بھی رہا تھا، کیا؟

"پیاری نشرہ! میں تمہارا بھائی ہوں نا، تمہارے لئے غلط کیسے سوچ سکتا ہوں، زندگی کے اس موڑ پہ حیران مت ہونا، خدا نے تمہارے لئے بہتر سے بہترین منتخب کیا ہے، صد شکر کہ ہم پہ بروقت ان لوگوں کا لالچ کھل گیا، اگر شادی کے بعد ایسا کرتے تو ہم کچھ بھی نہ کر پاتے، تم ہیام کے ساتھ ہمیشہ سکھی رہو گی، یہ میرا ایمان ہے۔" اور جانے اسامہ بھائی کیا کیا کہہ رہا تھا؟

نشرہ کے کان بند ہو رہے تھے، سماعتیں بہری تھیں، اسے کچھ بھی سنائی نہ دیتا تھا، سوائے ایک بازگشت کے۔

"اسامہ نے دھوکا کیا ہے، میری محبت کو چھین لیا ہے، تمہیں مجھ سے دور کیا ہے۔" نشرہ کا دل بند ہونے لگا، آنکھیں بند ہونے لگیں، اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے، اس کی گردن ڈھلک رہی تھی۔

جانے کس نے اسے چادر اوڑھائی تھی اور کون اسے برابر بیٹھا کر اس کا ہاتھ دبا رہا تھا، اسے بس اتنا اندازہ ہوا تھا کہ گاڑی کسی انجانے رستے کی طرف چل پڑی تھی۔

اور کوئی اس کے کان میں سرگوشی کر رہا تھا۔

"میری زندگی میں ہنگامی طور پر داخل ہونے پر بہت شکریہ۔" یہ اس کے الفاظ تھے، جسے آنکھوں سے، ہاتھوں سے باتیں کرنے کا فن آتا تھا، جس کا نقش نقش بولتا تھا اور جسے باتوں کا فنکار کہا جاتا تھا۔

نشرہ کے سائیں سائیں کرتے دماغ میں سوائے تنفر کے اس وقت کچھ بھی نہیں تھا۔

اسامہ بھائی کا دھوکہ اور ہیام کی ملی بھگت، اسے لگا، اسامہ بھائی نے اسے اپنے راستوں سے

ہٹانے کے لیے گیم کھیلی ہے اور اس گیم میں ہیام بھی برابر کا شریک تھا اور ان دونوں کا گناہ ایک سا تھا، یعنی برابر اور نشرہ ان دونوں کو معاف کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔

☆☆☆

گلگت میں آج کی صبح بہت انوکھی تھی۔

آج سورج کی اٹھان نرالی تھی، سنہری کرنیں مغرور بالکونیوں میں اٹھکیلیاں کرتی پھرتی تھیں، پرانی پولو کے گراؤنڈ میں دھوپ لشکتی تھی، فضا میں بدلاؤ تھا، ہلکی گرماہٹ سکون دیتی تھی۔

اس نے کھڑکی کے بھاری پٹ نیم وا کر دیئے تھے، اب سامنے کا منظر واضح تھا، کھلے وسیع و عریض احاطے کی زگ زیگ روش کے اوپر وہ جہاندار ہی تھا، جو تیزی سے بھاگتا ہوا آرہا تھا، شاید ایکسر سائز کر کے آیا تھا۔

اس کی رنگت تمتما رہی تھی، یوں پتھریلی روش پہ بھاگتا ہوا وہ کسی سلطنت کا مغرور شہزادہ لگتا تھا، وہ شروع سے دل کو بھانے والا تھا، نیل بر کا پہلا ٹکراؤ دیامر میں آ کر جہاندار سے ہی ہوا تھا، وہ ایسا تھا جو لمحوں میں بندے کو روک لیتا، جکڑ لیتا، نیل بر نے شروع شروع میں اس سے دوستی کرنا چاہی مگر اس کا رویہ دیکھ کر خود بخود پیچھے ہٹ گئی، وہ خاصا روکھا سخت اور مغرور تھا، اگر جہاندار اس کے التفات پہ توجہ دیتا تو یقینی طور پر نیل بر اس کی طرف مائل ہو جاتی، یوں اس کا دھیان امام کی طرف نہ جاتا۔

لیکن یہ سب ایسے ہی ہونا تھا، اسی طرح ہی ہونا تھا، کیونکہ یہی لوح محفوظ پہ لکھا جا چکا تھا، کیسے اس میں بدلاؤ آتا۔

اور اس وقت نیل بر اس پرانی حویلی کی بالکونی میں کھڑی اپنی زندگی کے ہر گزرتے انوکھے دن کو سوچتی بہت حیران تھی، وقت نے اسے کہاں کہاں پچھاڑا تھا۔

نیل بر کو اپنا مغرور انداز یاد آتا، جہاندار پہ رعب جمانا یاد آتا؟ اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور اپنی موجودہ حیثیت میں واپس آ گئی تھی۔

رات کی نسبت اس وقت ذہن بھاری پن سے آزاد تھا، جو ہوا تھا، نیل بر نے قبول کر لیا، نفی کا فائدہ بھی نہیں تھا، جہاں پہ سننے والا کوئی نہ ہو وہاں بات گنوا دینے کا فائدہ؟ کرنی تو جہاندار نے اپنی ہی مرضی تھی، اگر وہ اس کو اس کی مرضی سے اپناتا تو دل اتنا خالی اور ویران نہ ہوتا؟ اس نے اپنی قربت سے نوازا بھی تو احسان جتا جتا کر۔

نیل بر نے ٹھنڈی آہ بھری اور چونک گئی، پتھریلی روش اب خالی تھی، اسے اچانک احساس ہوا تھا ذرا سا مڑ کر وہ دیکھنے لگی، اس کا خیال درست تھا، جہاندار اس کے پیچھے کھڑا تھا، جانے وہ کب دبے قدموں اندر داخل ہوا، نیل بر اپنے خیالوں میں اتنی گم تھی کہ اندازہ ہی نہ کر سکی اور اب اسے اپنے اتنا قریب دیکھ کر ایک فطری سے جھجک جیسے حیاء بھی کہہ سکتے ہیں نے اس کا احاطہ کر لیا تھا، وہ تھوڑا کھسک کر بالکونی کے کنگرے سے جا لگی، جہاندار نے یہ گریز فوری طور پہ محسوس کر لیا تھا، کیونکہ اس کی حسیات بہت تیز تھیں، وہ ناگواری سے ایک بھوں اچکا کر اسے دیکھنے لگا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کا ہاتھ تھام کر جہاندار نے اسے کھینچ کر خود سے قریب کر لیا تھا، اس حال میں

کہ نیل بر مذاحمت بھی نہ کر سکی، وہ کسی کٹے شہتیر کی طرح اس کی بانہوں میں تھی اور جہاندار نے اپنی گرفت سخت کر لی تھی۔

"کیا دیکھ رہی تھی یہاں سے؟ بھاگنے کے لئے کوئی پلان سوچ رہی تھی؟ اوں ہوں، یہاں سے بھاگنا ممکن نہیں، تم چاہو تب بھی نہیں، بہت سنگلاخ دیواریں ہیں میرے گھر کی اور میرے بازوؤں کی۔" جہاندار کی آواز اس کے کانوں میں سرگوشی بن کے اتری تھی، نیل بر نے بمشکل ہی جھکی پلکوں کو اٹھایا تھا اور پھر تیزی سے جھکا لیا، وہ اس سحر طراز کی آنکھوں میں دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔

"بھاگ کر کہاں جاؤں گی؟" نیل بر نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"بہت چاہنے والے ہیں تمہارے۔" جہاندار کے الفاظ اسے چابک کی طرح لگے تھے، اس نے ہلکی سی مذاحمت کے ساتھ جہاندار سے الگ ہونا چاہا، لیکن جہاندار نے اس کی کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔

"اس بات سے آپ کی کیا مراد ہے؟" نیل بر کا دل بوجھل ہو گیا تھا، تو اب اسے ساری عمر یہی طعنے سننے پڑیں گے۔

"اس سے مراد امام تو نہیں ہے، وہ تمہارا منتظر نہیں ہوگا، بے چارا ابھی تک تو ہسپتال میں پڑا ہے۔" جہاندار کے انداز میں تاسف تھا، طنز نہیں تھا، پھر بھی اسے طنز کی طرح ہی لگا تھا۔

"اور تم یہاں سے بھاگ بھی نہیں سکتی۔"

"میں کیوں بھاگوں گی؟ کیا سوچ کر یہ بات کی ہے آپ نے۔" نیل بر کا چہرہ غصے میں رنگ بدل گیا، جہاندار کو ذرا سا جھک کر اس کے تاثرات ملاحظہ کرنے پڑے تھے، نیل بر کی نیلگوں آنکھوں میں تپش تھی، جہاندار کو اسے تپا کر بڑا ہی لطف آیا تھا، اس نے اپنی گرفت پہ مزید زور آزمایا تو نیل بر کی چیخ نکل گئی تھی۔

"ایکچوئیلی مجھے تم پہ اعتبار نہیں ہے۔" اس کے رخساروں کو نرمی سے چھوتا ہوا، اپنے ہونٹوں سے پرتپش لمس کا احساس بخشتا ہوا، نیل بر کے پورے وجود میں بجلی سی دوڑی تھی، اس کا رواں رواں اذیت میں مبتلا ہو گیا، اس نے لاشعوری طور پر جہاندار سے دور ہٹنے کے لئے اس کے سینے پہ دونوں ہاتھ کا دباؤ ڈالا تھا مگر وہ اسے ایک انچ بھی پیچھے نہیں دھکیل سکی تھی، وہ کسی سنگلاخ چٹان کی مانند تھا۔

"کیا برا لگا؟"

"نہیں، بہت اچھا لگا ہے۔" اس نے دل پہ پتھر باندھ کر کہا، حالانکہ جہاندار کے الفاظ نے اسے اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

"مجھے امید تھی تمہیں بہت اچھا لگے گا۔" جہاندار شاید مسکرایا تھا، اس کی مسکراہٹ نیل بر کی پیشانی پہ اتر آئی تھی، اس کے ہونٹوں کا لمس اس کے ماتھے، گال اور ہونٹوں سے ہوتا ہوا گردن تک آیا، نیل بر کے دل کی دھڑکن تیز تر ہو رہی تھی، اس کی ہتھیلیاں پسینے میں بھیگ رہی تھیں اور الفاظ نجانے کہاں کھو گئے تھے۔

(جاری ہے)

تو میری ضرورت ہے

دُرِ ثمن

''تو پھر کیسی بات ہے؟ تم پچھلے چار منٹ سے کسی ربوٹ کی طرح بیٹھے ہوئے ہو اور مسلسل اپنے سامنے اس سیٹ کی پشت کو گھور رہے ہو۔'' ذوناش نے اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے تبصرہ کیا، تو اس نے اپنی گھبراہٹ پہ قابو پاتے ہوئے، گردن موڑ کر ذوناش کو دیکھا۔

''نن...... نہیں میم...... ایسی کوئی بات نہیں مم...... میں ٹھیک ہوں۔'' ذوناش بھی گردن موڑے مسکراتی نظروں سے اسی کو دیکھ رہی تھی، کومیل نے بے ساختہ دل میں اعتراف کیا، بلاشبہ وہ دنیا کی حسین ترین لڑکیوں میں سے ایک تھی، جو محض چند فٹ کے فاصلے پہ اس کے ساتھ

ناولٹ

بیٹھی ہوئی تھی، اچانک اس کی نظر ذوناش کی سفید اور لمبی گردن پہ بنے سیاہ تل پہ پڑی تھی اور وہ بے ساختہ اس کی خوبصورت گردن پہ بنے سیاہ تل میں الجھ گیا تھا چند لمحوں کے لئے کھو گیا تھا۔

''ویسے مجھے تو تم کہیں سے بھی ٹھیک نہیں لگ رہے ہو۔'' ذوناش کی بات نے چند لمحوں میں اس کا تسلسل توڑا تھا۔

''ج...... جی...... میم میں ٹھیک ہوں بالکل نا جانے آپ کو ایسا کیوں فیل ہو رہا ہے۔'' ہنوز گھبراہٹ۔

کومیل نے کچھ لمحوں کے بعد نیوز پیپر اٹھا کر اپنے سامنے پھیلایا وہ اپنی توجہ اس ساحرہ سے ہٹانا چاہتا تھا جو بڑی بے تکلفی سے اس کے برابر میں آ بیٹھی تھی۔
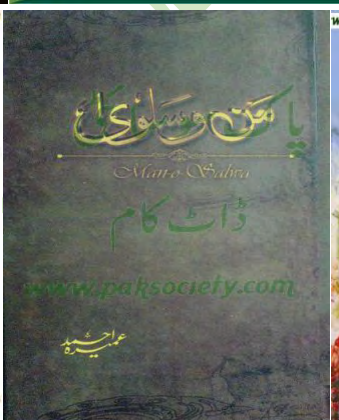
''ایسی کون سی نیوز ہے جسے تم اتنی توجہ سے پڑھ رہے ہو؟'' ذوناش جان بوجھ کر اس کے مزید قریب آ کر اخبار پہ جھک کر دیکھنے لگی، حالانکہ وہ جانتی تھی کومیل اخبار پڑھ نہیں رہا تھا
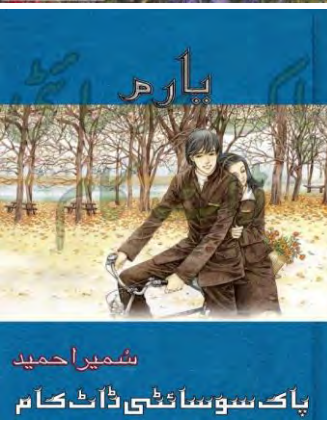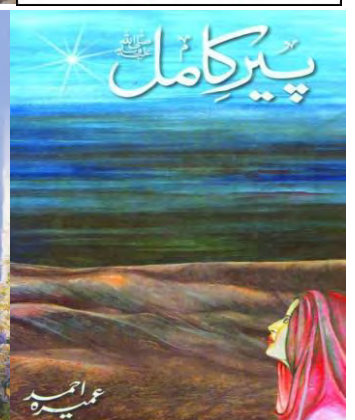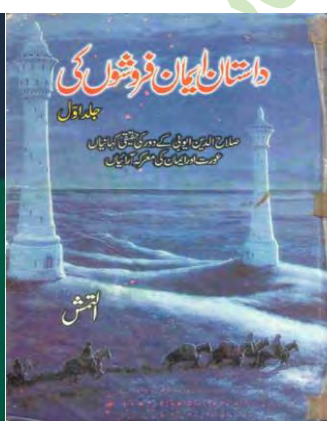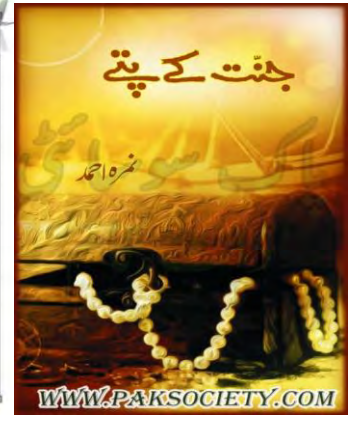
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

صرف دیکھ رہا تھا۔

''نن...... نہیں میم ایسی کوئی خاص نیوز نہیں ہے۔'' وہ اس کے اتنے قریب تھی کہ وہ مزید گڑبڑا گیا تھا، اس کی ہارٹ بیٹ تیزی سے مس ہونے لگی۔

''تو پھر چھوڑو ناں اس نیوز پیپر کو اور مجھ سے باتیں کرو۔'' ذوناش نے بے تکلفی سے اس کے ہاتھ سے اخبار لے کر واپس رکھتے ہوئے کہا تو اس نے نروس انداز میں بے ساختہ پوچھا۔

''کک...... کیسی باتیں میم؟''

''اف تم تو ایسے گھبرا رہے ہو جیسے میں نے تمہیں رومانس کرنے کو کہہ دیا ہو؟'' ذوناش کی پرورش آزاد ماحول میں ہوئی تھی سو بلا جھجک اس سے کہہ گئی تھی، مگر جواباً کومیل لفظ رومانس پہ از حد حیرت سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

''میں کیا باتیں کروں آپ سے میم؟''

''کچھ اپنے بارے میں بتاؤ، تمہاری کتنی گرل فرینڈز ہیں؟'' وہ بے تکلفی سے اس سے پوچھنے لگی۔

''میری زندگی میں فی الحال کوئی لڑکی نہیں ہے۔'' اس نے دھیرے سے جواب دیا۔

''امپاسیبل تم اتنے ہینڈسم ہو، ڈیشنگ ہو، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہاری کوئی گرل فرینڈ نہ ہو؟'' ذوناش نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''میم میں سچ کہہ رہا ہوں، میری زندگی میں کوئی لڑکی نہیں ہے، میری کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے۔'' اس نے نروس انداز میں یقین دلانے کی کوشش کی۔

''او کے تم کہتے ہو تو مان لیتی ہوں، ویسے تم جیسے یوسف ثانی شخص پہ لڑکیاں، لائن تو مارتی ہوں گی...... نہیں؟'' اس نے بے تکلفی سے مسکراتے ہوئے پوچھا تو وہ چند لمحے اسے دیکھے گیا، نہ جانے وہ اس سے امیدیں ہی اتنی بے تکلف کیوں ہو رہی تھی۔

(جی مارتی ہیں لائن جیسے اس وقت آپ مجھ پہ لائن مار رہی ہیں) کومیل نے دل میں سوچا مگر کہا نہیں اور کہہ سکتا بھی نہیں تھا۔

''میں نے کبھی ان چیزوں پہ توجہ نہیں دی، ویسے بھی میں ڈائریکٹ شادی اور پھر شادی کے بعد کی محبت پہ یقین رکھتا ہوں، میں محبت کے نام پہ کسی کو چیٹ کر کے ٹائم گزارنے والوں کے سخت خلاف ہوں۔'' اب کے کومیل کا انداز دو ٹوک تھا، اس کے لہجے میں اس کے اندر کی سچائی بول رہی تھی۔

''یعنی تم ایک مولوی ٹائپ انسان ہو، سیدھے سادھے اور سیدھے راستے پہ چلنے والے۔'' ذوناش نے تبصرہ کیا اور مسکرائی، وہ خاموش رہا، وہ پھر بولی۔

''مرد چاہے معمولی شکل و صورت کا بھی ہو وہ بہت فخر محسوس کرتا ہے، عورت کو اپنی محبت میں مبتلا کر کے اسے خوار کر کے اور تم تو پھر پرنس چارمنگ نظر آتے ہو، حیرت ہے تمہیں عام مردوں کی طرح اپنے عشق میں عورتوں کو ذلیل و خوار کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے؟ جانتے ہو میری فتنس ٹریز مار یہ اکثر تمہیں دیکھ کر آہیں بھرتی ہے۔'' ذوناش ہنسی۔

''مگر میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں۔''

اس کا انداز دو ٹوک تھا جیسے فیصلہ سنا رہا ہو، اس کا چہرہ سپارٹ تھا اور وہ اب سامنے دیکھ رہا تھا اور ذوناش وہ صرف اسے دیکھ رہی تھی، کومیل کی آنکھوں میں سچائی تھی، اس کی آنکھیں ریاکاری سے پاک تھیں اور اس کے لہجے میں سچائی یقین بن کر بول رہی تھی۔

''تم ایک ونڈر فل آدمی ہو اور تمہاری بیوی

سنی لی ہوگی You are a different and inspiring man ! I admire the luck of your bride to be ------"۔

ذوناش نے بولتے بولتے اس کے کندھے پہ سر رکھتے ہوئے کھلے دل سے اپنے جذبات کا اظہار کیا تو کومیل ایک بار پھر اس کی اس حد درجہ بے تکلفی پہ گڑبڑایا۔

"مم......میم......آ......آپ پلیز......سیٹ کی پشت پہ سر رکھیں۔" اس نے دھیرے سے کہا، اس کے دل کی دھڑکن ایک بار پھر گڑبڑا کرنے لگی۔

"میں یہاں بالکل ٹھیک ہوں اور مجھے بہت سکون مل رہا ہے۔" ذوناش نے ہنوز اس کے کندھے پہ سر رکھے شرارت سے کہا۔

"مم...... میم...... پلیز یہ مناسب نہیں ہے۔" وہ زچ ہوا۔

"کیا مناسب نہیں ہے؟" بمشکل اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ اس کے سینے پہ رکھا اور اس کی شرٹ کے بٹنوں سے کھیلنے لگی۔

"کیا مناسب نہیں ہے؟ ٹیل می؟"

"یہ...... یہ جو آپ کک...... کر رہی ہیں۔" وہ تھوڑا پیچھے ہٹا۔

"میں کیا کر رہی ہوں؟" وہ انجان بنی اور دل ہی دل میں اس کی کیفیت کو انجوائے کرنے لگی، اک مدت کے بعد اس کا دل یوں مچلا تھا اور وہ یوں تنگ کر رہی تھی شرارت کر رہی تھی اور جس سے وہ اس طرح کی شرارت کر رہی تھی وہ اس کی زندگی کا پہلا مرد تھا اور شاید آخری بھی۔

"میم آ......آپ اچھی طرح سے جانتی ہیں کہ آپ کیا کر رہی ہیں۔" کومیل نے گھبرا کر

اپنے اردگرد دیکھا، سب Passengers زیادہ
تر سو رہے تھے کچھ اخبار یا میگزین پڑھ رہے تھے
اور کچھ آنکھیں بند کیے ریلیکس کر رہے تھے۔

"لگتا ہے تم مجھے کمپنی نہیں دو گے؟"
ذوناش نے اس کے چہرے پہ چھائی گھبراہٹ
اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں اترتی پریشانی
دیکھ کر دھیرے سے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا۔

"دیکھیں میم...... مم...... میں آپ کو اس
طرح کی کمپنی نہیں دے سکتا۔" کومیل نے ایک
جھٹکے سے اس کا ہاتھ ہٹایا، اسے خود سے دور کیا
اور حتمی انداز میں فیصلہ سنایا، ذوناش اسے چند
لمحے دیکھتی رہی، مگر بولی کچھ نہیں اور دل میں
اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکی وہ ایک نہایت شریف
النفس انسان تھا۔

"دیکھیں میم، میرا اور آپ کا ایسا کوئی
ریلیشن نہیں ہے جس کی بنیاد پہ آپ مجھ سے اس
طرح کی بے تکلفی برتیں۔" کومیل نے بہت نپے
تلے الفاظ میں اسے گویا وارننگ دی۔

"ریلیشن بنانے سے بنتے ہیں، آئی مین تم
ہر وقت میرے ساتھ رہو گے، تم میرے پرسنل
ڈرائیور اور باڈی گارڈ ہو، تمہارے بغیر مجھے کہیں
آنے جانے کی اجازت نہیں ہے تو ایسے میں، آئی
تھنک ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ تھوڑی بہت
فرینڈ شپ ضرور کر لینی چاہیے تا کہ میں تمہارے
ساتھ بوریت محسوس نہ کروں۔" ذوناش نے
مسکراتے ہوئے جواز پیش کیا۔

"آئی ایم سوری میم، میں دوستی کے نام پہ
آپ کو اس طرح کی کمپنی دے کر آپ کی بوریت
دور نہیں کر سکوں گا، میں آپ کا پرسنل ڈرائیور اور
باڈی گارڈ ہوں، اس سے زیادہ میں نہ آپ سے
پرسنل ہو سکتا ہوں، نہ ہونا چاہوں گا۔" کومیل کا
انداز دوٹوک تھا، اس کے لہجے میں درشتگی تھی،

ذوناش کو اس کا یوں اسے دھتکارنا اچھا نہیں لگا
تھا، وہ شرارت اور مذاق میں شاید لاشعوری طور پہ
اس کے منہ سے کچھ اچھا سننا چاہتی تھی، اپنی دی
ہوئی آفر کو اس کے منہ سے خوشدلی سے قبول
کرتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی اور ایسا بالکل بھی
نہیں ہوا تھا شاید اسی لئے اس کے چہرے پہ
اداسی اتر آئی تھی، ایسا پہلی بار ہوا تھا وہ کسی انجان
مرد کے خود قریب گئی تھی اور اس مرد نے کتنی
آسانی سے اسے پرے دھکیل دیا تھا، اسے یکدم
اس کے عمل سے اس کے رویئے اس کی باتوں
سے اپنی ہتک سی محسوس ہونے لگی اس کے
مسکراتے ہونٹ اب خاموش ہو گئے تھے۔

"Ok you keep enjoying
your lone liness۔" ذوناش کے انداز
میں روکھا پن تھا، طنز تھا اور کہیں کوئی شکوہ بھی چھپا
ہوا تھا، کومیل اس سے نظریں ہٹاتے ہوئے
دھیرے سے بولا۔

"سوری میم میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا
نہیں تھا میں تو بس آپ کو یہ سمجھانا چاہتا تھا
کہ......" وہ جھجک کر رک گیا۔

"سوری فور واٹ؟ ہرٹ ہونا میرے لئے
ایک نارمل بات ہے۔"

"اٹس او کے۔" اس نے زبردستی مسکرانے
کی کوشش کی تھی اور اس کے برابر والی چیئر سے
اٹھ کر دوبارہ اپنی جگہ پہ آ گئی تھی، اب اس نے
سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لی تھیں،
شاید اسے نیند آ رہی تھی لیکن کومیل کی نیند اب اڑ
چکی تھی، اس کے آس پاس ذوناش کی باتیں گونج
رہی تھیں، وہ اتنی حسین و جمیل تھی کہ اس کی جگہ
کوئی دوسرا مرد ہوتا تو کبھی اسے خود سے دور نہ
کرتا، کبھی اس کی قربت سے دور نہ ہونا چاہتا، مگر
کومیل کا ضمیر زندہ تھا، وہ اپنے نفس پہ قابو پانا

جانتا تھا اسی لئے اس حسن کی مورت کو آسانی سے خود سے دور کر گیا تھا مگر اس کی نظروں نے بار بار اس کے برابر والی سیٹ کو دیکھنے کی گستاخی کی تھی جس پہ وہ آنکھیں موندے سونے کی کوشش میں بے سکون ہو رہی تھی، خدا نے اسے فرصت سے بنایا تھا۔

اس کے بعد فلائٹ کے دوران ان میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی، دوبئی ائیر پور پہ کمال قریشی کے دیرینہ دوست نصیر احمد انہیں ریسیو کرنے کے لئے پہلے سے ہی موجود تھے، انہوں نے ذوناش کو اپنے گھر لے جانے پہ ازحد اسرار کیا تھا مگر کمال قریشی نے دوبئی کے سیون اسٹار ہوٹل Burj all arab میں ان کے لئے Royal suite بک کروا رکھا تھا، لہٰذا ذوناش نے نصیر انکل سے نہایت خوشدلی سے معذرت کر لی تھی، سو نصیر احمد انہیں اپنی مرسڈیز میں برج العرب چھوڑ آئے تھے، ہوٹل میں داخل ہوتے ہی کومیل کی آنکھیں خیرہ ہو گئی تھیں، کومیل اپنے کیرئیر میں کئی Reach لوگوں کے ہاں بطور باڈی گارڈ کے فرائض سرانجام دے چکا تھا اور ان کے ساتھ اکثر فائیو اسٹار ہوٹلز میں بھی جایا کرتا تھا مگر کمال قریشی اور ذوناش کے ساتھ جو ٹھاٹھ باٹھ وہ دیکھ رہا تھا وہ اس نے زندگی میں نہ دیکھے تھے، وہ پہلی بار دنیا کے مشہور و معروف سیون اسٹار ہوٹل میں آیا تھا، ریڈ کارپٹ پہ گاڑی رکتے ہی باوردی پورٹر نے آگے بڑھ کر مسکراتے ہوئے ان کی گاڑی کا دروازہ کھولا تھا، ہوٹل کی انٹرس پہ کھڑی باوردی انتظامیہ جن میں دو مرد تھے اور ایک بہت حسین لڑکی موجود تھی، انہوں نے قدرے جھک کر مسکراتے ہوئے انہیں ویلکم کیا تھا۔

ذوناش نے جواباً اسی طرح خوشدلی سے ان کو تھینکس کہا تھا، اب وہ اندر آگئے تھے، لفٹ کے ذریعے وہ تھرڈ فلور پہ پہنچے تو ایک درمیان عمر کے روسی شخص نے انہیں ویلکم کہا اور انگلش میں انہیں ریزو کروائے Suite کے بارے میں بتاتے ہوئے آگے بڑھا، اس کی معیت میں وہ تینوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے، خوبصورت راہداریوں سے گزرنے کے بعد اس شخص نے مسکراتے ہوئے ایک شاہی قسم کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دروازے کو پش کیا تھا اور پھر دروازہ کھلتے ہی کومیل کی آنکھیں چند لحوں کے لئے کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں، وہ سب اس شخص کی معیت میں سویٹ کے اندر داخل ہو چکے تھے ایک خوبصورت ہال کے ایک سائیڈ پہ خوبصورت صوفے رکھے گئے تھے، اسی ہال کے ایک کونے میں ایک اسٹائلش سا راٹینگ ٹیبل موجود تھا، جس پہ لیپ ٹاپ رکھا تھا اور ریولونگ چیئر رکھی تھی، چیئر کے پیچھے ایک بک ریک بھی رکھا تھا ٹیبل پہ پیپر ویٹ سے لے کر کئی اقسام کے پین اور راٹینگ پیڈز رکھے تھے، اسی ہال کے درمیان میں نہایت عمدہ قسم کی گول سیڑھیاں دیکھائی دے رہی تھیں جن پہ قیمتی ریڈ کارپٹ بچھا ہوا تھا، سیڑھیوں کی تعداد زیادہ نہ تھی صرف پانچ چھ ہی سیڑھیاں تھیں، اس شخص نے ہاتھ کے اشارے سے ان سب کو سیڑھیوں پہ چڑھنے کا اشارہ کیا تھا، وہ تینوں پھر سے اس کے پیچھے پیچھے اوپر آئے اوپر آتے ہی کومیل نے پھر سے اس لگژری رائل سویٹ کے چاروں اصراف نگاہ دوڑائی، چاروں اطراف شیشے کی دیواریں بنائی گئی تھیں، قیمتی اور نفیس پردوں سے ان دیواروں کو سجایا گیا تھا، چاروں اطراف سے وسیع سمندر کا نظارہ کیا جا سکتا تھا، اس وسیع ہال کے ایک کونے میں چند صوفے رکھ کر ان کے سامنے پلازمہ ٹی وی رکھ کر اس کارنر کو ٹی وی لاونج کی شکل دی گئی تھی،

دوسرے کونے میں ایک منی سی بار بھی بنایا گیا تھا جس کے کاؤنٹر پہ کچھ گلاس اور دنیا کے مشہور برانڈ کے مشروب رکھے تھے، اسی ہال کے درمیان میں شیشے کا نہایت خوبصورت ڈائننگ ٹیبل رکھا گیا تھا جس کے اوپر آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا فانوس لگا ہوا تھا، اس رائل سویٹ کا ایک ایک کونہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا، کومیل کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی شاہی محل میں آ گیا ہو۔

وہ شخص انگلش میں ذوناش کو ان کے بیڈ رومز کے بارے میں بتا رہا تھا، اس کے بعد وہ شخص چلا گیا تھا، ذوناش نے کئی گھنٹوں کے بعد اسے مخاطب کیا تھا۔

''کومیل دائیں طرف جو Collie door تمہیں نظر آ رہا ہے وہاں تمہارا روم ہے، می می اس طرف آپ کا روم اور یہ سامنے میرا روم ہے۔'' ذوناش نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں ان کے رومز کے بارے میں بتایا۔

''اوکے میم!'' کومیل اپنے روم کی طرف بڑھا۔

''روم میں انٹر کام موجود ہے تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو انٹر کام پہ انتظامیہ کو اطلاع کر دینا۔'' ذوناش نے سرسری سے انداز میں اسے بتایا، تو کومیل اثبات میں سر ہلا گیا اور اپنے روم کی طرف بڑھ گیا۔

''می می آئی تھنک آپ کو بھی ریسٹ کی ضرورت ہے گو کہ پلین میں آپ نے خوب نیند پوری کی ہے۔'' ذوناش نے مسکراتے ہوئے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

''ذونا ڈارلنگ، اب ہم بوڑھا ہو گیا ہے، اس لئے جلدی تھک بھی جاتا ہے۔'' وہ جھینپ گئیں تھیں۔

''کہاں بوڑھی ہو گئی ہیں آپ؟ اب بھی آپ کو دیکھ کر کئی مردوں کی ہارٹ بیٹ مس ہوتی ہوگی۔'' ذوناش مسکرائی اور انہیں چھیڑنے لگی۔

''ذونا مذاق مت کیا کرو ہم سے، ہم اچھی طرح سے جانتا ہے پچاس برس کا ہو چکا ہے ہم، اب ہمیں دیکھ کر کون اسٹوپڈ ایسا سوچتا ہوگا؟'' مریم خاتون نے مسکراتے ہوئے اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورا تھا اور ذوناش دھیرے سے مسکرانے لگی تھی۔

''ذونا مائے ڈارلنگ تم ایسے ہی ہنستا ہوا اچھا لگتا ہے اور ہم تمہیں ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا ہے۔'' مریم خاتون نے پیار سے اس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا تو وہ خاموش ہو گئی تھی۔

''اوکے می می، میں تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ ان کے کندھے پہ تھپکی دے کر اپنے روم کی طرف بڑھ آئی تھی، کیونکہ وہ جانتی تھی مرسل کے ساتھ وہ بھی خوش نہیں رہ سکتی تھی، اس لئے خوش رہنے کی...... دعائیں اب اسے خوشی نہیں دیتی تھیں، بلکہ اسے اداس کر جاتی تھیں۔

اور پھر شام کو جب وہ شاور لے کر اپنے روم سے باہر نکلی تو کومیل گلاس وال کے ساتھ کھڑا وسیع سمندر کا نظارہ کر رہا تھا، وہ بھی کارپٹ پہ ننگے پاؤں چلتی ہوئی اس کے قریب آ گئی تھی۔

''السلام علیکم میم!'' کومیل نے اسے اپنے قریب آتا ہوا دیکھ کر ادب سے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام!'' وہ سلام کا جواب دے کر اس کے پاس آ کھڑی ہوئی، اس وقت وہ Arabic سٹائل کے لوز سے ڈھیلے ڈھالے سیاہ گاؤن میں ملبوس تھی جس کے سلیولیس بازو اور گلے پہ نفیس سی ریڈ کڑھائی بہت خوبصورت لگ رہی تھی، اس کے دودھیا وجود پہ بلیک کلر بہت جچ رہا تھا، وہ ننگے پاؤں تھی، اس کی ایک کلائی میں ریڈ اور بلیک کلر کے دو کنگن بھی موجود تھے جو اس

کی کلائی پہ بہت جچ رہے تھے، اس کے کمر تک آتے کافی کلر کے لمبے اور سیدھے بالوں میں اب بھی کہیں کہیں پانی کی بوندیں اٹکی ہوئی تھیں، کومیل اس ساحرہ اس حسن کے پیکر سے نظریں چرا کر گلاس وال سے باہر دیکھنے لگا۔

''کومیل تم کافی پیو گے؟'' ذوناش نے اسے سرسری سے انداز میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی...... کافی؟'' وہ حیران ہوا۔

''میرے سوال اتنے مشکل تو نہیں ہوتے جن کے جواب دینا تمہارے لئے اس قدر مشکل ہو جاتا ہے۔'' کومیل نے ناسمجھی میں ذوناش کو دیکھا۔

''کیا تم میرے ساتھ کافی پیو گے؟'' اب کے مسکراتے ہوئے پوچھا گیا۔

''جی شیور۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''اوکے گڈ۔'' ذوناش نے قریب ہی رکھا انٹرکام اٹھایا اور کافی بھجوانے کو کہا۔

''شام کو مجھے دوبئی مال سے کچھ شاپنگ کرنی ہے۔'' انٹرکام رکھتے ہوئے ذوناش نے اسے اطلاع دی۔

''اوکے میم!'' اس نے پروفیشنل انداز میں جواب دیا، ذوناش ایک بار پھر اس کے قریب آ کھڑی ہوئی اور گلاس وال سے سمندر کو دیکھنے لگی۔

''مجھے سمندر بہت پسند ہے۔'' وہ دھیرے سے خود کلامی کے انداز میں بولی، مگر کومیل خاموش رہا، اس ساحرہ کے پاس اس کے قریب کھڑے ہونا اور کھڑے رہنا بھی انتہائی مشکل تھا اسے اپنے نفس سے بار بار جنگ لڑنی پڑتی تھی۔

''پوچھو گے نہیں کہ مجھے سمندر کیوں پسند ہے؟'' اس نے گردن موڑ کر اپنے قریب کھڑے کومیل سے پوچھا۔

''کچھ چیزوں کے بارے میں وجوہات نہیں پوچھی جاتیں میم! وہ پسند ہوتی ہیں اور نا جانے کیوں پسند ہوتی ہیں۔'' کومیل کے جواب پر کچھ لمحے وہ اسے دیکھتی رہی تھی۔

''مگر کچھ لوگوں کو کچھ پسندیدہ چیزوں کی وجوہات بتانے کو دل چاہتا ہے۔'' اپنے چہرے سے اپنے بالوں کو ہٹاتے ہوئے اس نے سمندر کو دیکھتے ہوئے کھوئے سے لہجے میں کہا تو کومیل بے ساختہ اسے دیکھے گیا۔

بلاشبہ وہ کسی رومانٹک ناول کی کسی ہوشربا ہیروئین جیسی تھی، بے انتہا پرکشش اور خوبصورت، اب بھی وہ میک اپ سے عاری چہرے پہ صرف ڈیپ ریڈ لپ اسٹک لگائے بلیک گاؤن میں غضب ڈھا رہی تھی، آنکھیں اسے بار بار دیکھنے کی گستاخی کر رہی تھیں، دل بار بار اس کی جانب کھنچتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

''کومیل! یہ سمندر کتنی آسانی سے ہزاروں کہانیوں، رازوں اور طوفانوں کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے؟ مگر انسان چند دکھوں کو اپنے سمندر جیسے وسیع اور گہرے دل میں چھپانے کے لئے کس قدر ہلکان ہو جاتا ہے نا؟'' وہ ہنوز سمندر کی لہروں کو دیکھتے ہوئے اداسی سے بولی، جواباً وہ کچھ بول نہیں پایا تھا، بس اس کی گہری باتوں پہ صرف یہ سوچ کر رہ گیا تھا، کہ اس لڑکی کی زندگی میں ایسی کون سی کمی تھی جو اسے یوں ہلکان کیے ہوئے تھی، جو اس کے لہجے میں اداسی بن کر اتر آئی تھی، جو اس کی روشن اور خوبصورت آنکھوں میں نمی بن کر جھلملا گئی تھی، دنیا کی ہر نعمت ہر آسائش تو موجود تھی اس کے پاس، یہ شاہانہ اور لگژری اسٹائل، یہ بے پناہ اور بے حساب دولت، سب کچھ تو تھا اس کے پاس، پھر ایسا کیا نہیں تھا اس کے پاس، جس کی کمی اس کی بھرپور زندگی کو بھی

ادھورا کیے ہوئے تھی؟ وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔
اسی دوران سویٹ کے مین انٹرنس پہ دھیمی سی دستک کے ساتھ ایک خوش شکل چائنیز خدوخال والی لڑکی، وائٹ شرٹ اور بلیک منی اسکرٹ پہنے ہاتھوں پہ وائٹ دستانے چڑھائے ایک خوبصورت ٹرالی لے کر سویٹ میں داخل ہوئی کافی کارنر کے قریب آ کر اس نے ٹرالی روک لی اور انگلش میں مسکراتے ہوئے انہیں وہاں آنے کو کہا۔
ذوناش کافی کارنر کی جانب چلی آئی اس کے پیچھے کومیل بھی جب وہ دونوں کافی کارنر کی چیئرز پہ بیٹھ گئے تو وہ لڑکی ان کے لئے کافی بنانے لگی۔
اس کے کافی سرو کرنے کے بعد ذوناش نے اس کا شکریہ ادا کیا اور جواباً وہ لڑکی اپنے پروفیشنل انداز کے ساتھ مسکراتی ہوئی واپس چلی گئی تھی۔
ذوناش اور کومیل ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے تھے ان کے بیچ چھوٹا سا ٹیبل تھا، جس پہ ان کے کافی کے مگ رکھے تھے ساتھ میں چند کوکیز اور چاکلیٹ ڈونٹس رکھے تھے، ذوناش نے مگ اٹھا کر لبوں سے لگایا اور پھر چاکلیٹ ڈونٹس توڑ کر آدھا ٹکڑا کومیل کی جانب بڑھایا۔
''چاکلیٹ ڈونٹس میرے فیورٹ ہیں، لو ٹرائی کرو، ذونین اور میں بہت شوق سے کھایا کرتے تھے۔'' کومیل نے اس کے اپنی جانب بڑھے ہاتھ کو دیکھا اور پھر اس کے چہرے کو، جس پہ عجیب سی اداسی اتری ہوئی تھی، کومیل نے اس کے ہاتھ سے ڈونٹس کا ٹکڑا پکڑ لیا اور کھانے لگا اور پھر جیسے ذوناش کو اچانک کچھ یاد آیا تھا اور اس نے کومیل سے پوچھا۔
''کومیل تم اس رات اتنی رات گئے پٹرول پمپ پہ کیوں رکے تھے؟ میرا مطلب ہے تم اس ایریا میں اتنی رات کیا کر رہے تھے؟''
''میرا گھر اسی ایریا کے قریب ہی ہے میم، میں ان دنوں گھر آیا ہوا تھا اور ایک دوست سے ملنے کے بعد واپس گھر جا رہا تھا اتفاقاً میری بائیک میں پٹرول ختم ہو گیا تھا، وہی ڈلوانے کے لئے رکا تھا۔'' کومیل نے کافی پیتے ہوئے سرسری سے انداز میں اسے تفصیل بتائی۔
''اس رات اگر تم وہاں نہ آتے تو آج میں یہاں تمہارے سامنے نہ بیٹھی ہوتی۔'' ذوناش نے کافی کے ساتھ ڈونٹس کھاتے ہوئے قیاس ظاہر کیا۔
''میم آپ بار بار میرا شکریہ ادا مت کریں۔'' کومیل نے انکساری سے جواب دیا۔
''تم بہت Down to f,arth ہو، لالچی بھی نہیں ہو، شریف آدمی ہو اور اپنی ڈیوٹی کو عبادت سمجھ کر نبھاتے ہو اور سب سے بڑھ کر تمہاری کوئی گرل فرینڈ بھی نہیں ہے۔'' آخری جملہ ذوناش نے مسکراتے ہوئے شرارت سے ادا کیا تھا۔
''نو ڈاؤٹ کومیل تم ایک بہترین انسان ہو۔'' ذوناش نے اس کے چہرے اور جھکی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے اعتراف کیا جواباً کومیل جھینپ کر مسکرا دیا تھا۔
''ایک بات پوچھوں تم سے؟'' ذوناش کی نظریں اب بھی اس یوسف ثانی پہ مرکوز تھیں، اگلے ہی لمحے وہ پھر سے سنجیدہ ہو گیا تھا، اب وہ نہ جانے اس سے کیا پوچھنے والی تھی؟
''یس میم پوچھئے۔'' اس نے مروت میں کہا۔
''ہائے داوے تم اتنے سنجیدہ کیوں رہتے ہو؟ کیا تمہیں کبھی کسی نے نہیں بتایا کہ مسکراتے

ہوئے تم کتنے ڈیشنگ لگتے ہو؟'' ذوناش نے مسکراتے ہوئے اس سے سوال کیا تھا مگر اس سوال نے کومیل کی مسکراہٹ غائب کردی تھی، وہ مسلسل اس سے بے تکلفی کی دیوار گراتی ہوئی اس کی ذاتیات میں دخل اندازی کررہی تھی اس کے لبوں سے غائب ہوتی مسکراہٹ دیکھ کر وہ پھر سے بولی۔

''آئی ڈونٹ نو، تم میری باتوں سے پریشان کیوں دیکھائی دینے لگتے ہو؟ میرا مقصد تمہیں نروس کرنا ہرگز نہیں، یہ ایجوٹیکی میں تمہارے ساتھ ایک اچھا اور دوستانہ ریلشن چاہتی ہوں، تم سے پہلے کئی گارڈز کی میں صرف اس وجہ سے چھٹی کرواچکی ہوں کہ یا تو وہ شریف آدمی نہ تھے اور یا ایک جیتے جاگتے ریبوٹ بن کر مجھ پہ مسلط رہتے تھے اس طرح سے میرا دم گھٹتا ہے اور میں بہت جلد بور ہوجاتی ہوں، مجبوراً مجھے ان پہ کوئی الزام لگا کر انہیں جاب سے نکالنا پڑتا ہے۔'' ذوناش نے مگ کے کنارے پہ انگلی پھیرتے ہوئے تفصیل بتائی، مگر کومیل ہنوز خاموشی سے کافی پیتا رہا، توقف کے بعد وہ دھیرے سے بولی۔

''تمہارے ساتھ میں بور نہیں ہونا چاہتی، میں نہیں چاہتی کہ دوسرے تیسرے مہینے اس جاب سے تمہاری چھٹی کروادوں تمہارے ساتھ مجھے ایک عجیب سا تحفظ محسوس ہوتا ہے اور میں تمہیں کبھی خود سے دور کرنا نہیں چاہوں گی۔'' ذوناش نے دھیرے سے کہتے ہوئے ٹیبل پہ رکھے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ لیا تھا۔

جسے اگلے ہی لمحے کومیل نے کھینچ لیا تھا، اسے سمجھ نہیں آرہا تھا وہ اس کی ایسی باتوں کے کیا جواب دے کیا معنی نکالے اور خود کو کیا سمجھائے اور اسے کیا بتائے، وہ اس جاب سے بہت خوش

تھا مگر ذوناش کی بے تکلفی سے بہت پریشان تھا۔

''شریف ہونا اچھی بات ہے مگر اس حد تک شریف ہونا اچھی بات نہیں۔'' اب وہ مسکراتے ہوئے کافی پینے لگی تھی۔

اور وہ نظریں چرا گیا تھا، وہ بہت کھلی باتیں کرتی تھی بلا جھجک شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے اپنی عمر کے اٹھارہ سال انگلینڈ کے آزادانہ ماحول میں گزارے تھے۔

☆☆☆

شام کو وہ کومیل کے ساتھ دوبئی مال میں شاپنگ کے لئے روانہ ہوگئی تھی مریم خاتون کا بی پی ہائی تھا سو وہ دوا کھا کر ریسٹ کررہی تھیں اس لئے ذوناش کے ساتھ نہیں جاسکی تھیں، کمال قریشی کے دوست نصیر احمد ان کے سیر وتفریح کے لئے اپنی گاڑی چھوڑ گئے تھے، لہٰذا ان کی مرسڈیز کومیل ہی ڈرائیو کررہا تھا۔

بلیک ڈریس پینٹ پہ وائٹ شرٹ اور شرٹ پہ بلیک ویس کورٹ پہنے، وہ ہالی وڈ کا کوئی اسٹار لگ رہا تھا، ذوناش پہلے اس کی ظاہری شخصیت سے متاثر ہوئی تھی، مگر اس کے ساتھ رہ کر اس کے ساتھ وقت گزارتے ہوئے وہ اس کے باطن سے بھی متاثر ہورہی تھی، وہ ایک بہت پرکشش اور متاثر کن مرد تھا اور ایسا پہلا مرد تھا جس کے آس پاس رہنے یا اسے اپنے آس پاس رکھنے کو اس کا دل مچلتا تھا وہ خود بخود اس کی جانب راغب ہورہی تھی، اس سے متاثر ہورہی تھی، اس کی جانب کسی مقناطیسی کشش کی طرح کھینچی چلی جا رہی تھی۔

اور ایسا ذوناش کو اس کی زندگی میں پہلی بار محسوس ہورہا تھا، وہ بار بار اسے مخاطب کرتی تھی، اس کا بولنا اس کو سننا ذوناش کو اچھا لگتا تھا، اس کی بڑی بڑی گہری آنکھوں میں ایک عجیب کشش

تھی، ایک چمک تھی۔

ذوناش گاڑی کی پچھلی سیٹ پہ بیٹھی اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی حالانکہ اسے مرسل کے بارے میں سوچنا چاہیے تھا، عنقریب ان دونوں کی منگنی ہونے والی تھی انہیں ایک ساتھ زندگی گزارنی تھی، وہ اس کی زندگی کا سب سے اہم ساتھی تھی، وہ ساتھی جس نے کبھی بھی ذوناش کو اہمیت نہیں دی تھی، وہ صرف خود سے محبت کرنے والا انسان تھا، مرسل نے کبھی اس سے اظہار محبت نہیں کیا تھا، اسے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ اس کا ہونا اس کے لئے کتنا اہم ہے، وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ رشتوں میں محبت کا اظہار کس قدر ضروری ہوتا ہے، دل کے بند کمرے میں سانس لیتی محبت کا کیا فائدہ جو اظہار بن کر کسی کے لبوں پہ ایک مسکراہٹ تک نہ کھلا سکے؟ جن محبتوں کو اظہار کا راستہ نہ دیکھایا جائے وہ محبتیں دل کے بند کمرے کی دیواروں میں گھٹ گھٹ کر دم توڑ دیتی ہیں، مرسل کے لئے اس کے جذبات بھی ایسے ہی دم گھٹ کر مر گئے تھے، اب اس کے دل کا کمرہ خالی تھا جہاں ویرانیوں کا راج تھا، جہاں صرف اب خاموشیاں ہی خاموشیاں تھیں۔

مگر کومیل کو دیکھ کر نہ جانے کیوں اس کے دل کے بند کواڑ بجنے لگتے تھے، اندر کہیں کوئی ہلچل سی مچنے لگتی تھی، اس خالی کمرے میں کھٹکا ہونے لگتا تھا۔

وہ جیب سے گاڑی میں بیٹھی تھی یہی باتیں سوچ رہی تھی، کومیل نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے بارہا بیک مرر سے اسے دیکھا تھا جو سپاٹ چہرے کے ساتھ شیشے کے پار سڑک پہ رواں ٹریفک کو دیکھ رہی تھی، وہ عجیب مسٹری سی لڑکی تھی، کبھی بہت خوش دیکھائی دیتی اور کبھی بالکل خاموشی سادھ لیتی۔

بالآخر دوبئی مال کے پارکنگ ایریا میں گاڑی لگا کر کومیل نے گاڑی سے نکل کر اس کی جانب کا دروازہ کھولا تھا۔

ذوناش نے یلو ڈھیلی ڈھالی شرٹ کے ساتھ بلیک منی اسکرٹ اور اسکرٹ کے نیچے بلیک ٹائٹ پہن رکھا تھا، بلیک بیگ اور بلیک شوز پہنے، وہ کسی اپسرا سے کم نہیں لگ رہی تھی، اس نے اپنی لوز سی شرٹ کی کمر پہ بلیک لیدر کی بیلٹ باندھ رکھی تھی جس پہ وقفے وقفے سے ڈائمنڈ جڑے ہوئے تھے۔

ویک اینڈ ہونے کی وجہ سے وہاں رش بھی بہت دیکھائی دے رہا تھا کومیل ذوناش کے دائیں بائیں نگاہ دوڑاتے ہوئے اس کے بالکل ساتھ ساتھ چلنے لگا، دوبئی مال کے اندر کی شاپس پہ رک کر ذوناش نے دھڑا دھڑ شاپنگ کی تھی۔

ایک شاپ میں وہ اپنے لئے مختلف برانڈ کے کپڑے خرید رہی تھی جب اس کی نظر قریب ہی ایک جیولری کاؤنٹر کے پاس کھڑے کومیل پہ پڑی تھی اور اس نے بے اختیار کومیل کو آواز دی تھی۔

''یس میم؟'' وہ اس کے قریب آیا۔

''یہ دیکھو، ان دونوں میں سے کون سا ڈریس مجھ پہ سوٹ کرے گا؟'' وہ نہایت بے تکلفانہ انداز میں یورپی اسٹائل کے ہینگرز میں لٹکے دونوں ڈریسز اس کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھنے لگی، جواباً اس کا دل چاہا کہ وہ اسے بتائے، اس پہ ہر رنگ ہر ڈریس ہی سوٹ کرتا ہے جیسے وہ اسی کے لئے بنا ہو، مگر وہ یہ بات کہہ نہیں سکا تھا اور نہ کہنا چاہتا تھا۔

''سوری میم! مجھے لیڈیز شاپنگ کے بارے میں بالکل بھی علم نہیں ہے۔'' کومیل نے روکھا سا جواب دیا۔

''میں تمہاری مشکل آسان کرتی ہوں، اب

بتاؤ کون سا زیادہ اچھا لگ رہا ہے مجھ پہ۔" اس نے ہنوز بے تکلفی سے باری باری ہینگر اپنے ساتھ لگائے۔

"میم آئی سوئیر، مجھے عورتوں کی شاپنگ وغیرہ کے معاملات سے بالکل بھی دلچسپی نہیں ہے آئیم سوری، میں اس معاملے میں آپ کی ہیلپ نہیں کرسکتا۔" کومیل نے شرمندہ ہوتے ہوئے جواب دیا اور جھوٹ بولا۔

"تو ابھی تم اس عورتوں والے جیولری کارنر کے قریب کھڑے کیا کر رہے تھے؟ اگر تمہیں ان معاملات میں دلچسپی نہیں تو؟" ذوناش نے وہ دونوں ڈریسز واپس رکھتے ہوئے خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورا تو وہ گڑبڑا گیا۔

"تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ آئندہ مجھ سے جھوٹ مت بولنا، کیونکہ تم بہت بھونڈے انداز سے جھوٹ بولتے ہو۔" ذوناش اس کے قریب رک کر اسے سرزش کرتی ہوئی شاپ سے باہر نکل گئی تھی اور وہ شرمندہ سا اس کے پیچھے آیا تھا۔

"Aquarium کی طرف جانا ہے مجھے۔" اس نے کومیل کی جانب دیکھے بغیر اسے اطلاع دی، وہ خفا بھی بہت جلد ہو جاتی تھی۔

"اوکے میم۔" کومیل نے مودبانہ انداز میں کہا اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا، پھر Aquarium میں کافی دیر گھومنے کے بعد وہاں سے نکلتے نکلتے سات بج گئے تھے، پارکنگ میں کھڑی گاڑی میں شاپنگ بیگز رکھتے ہوئے اچانک اس نے کومیل سے کہا تھا۔

"گاڑی کو لاک لگا کر یہیں رہنے دو، مجھے میٹرو بس میں بیٹھنا ہے۔"

"مگر کیوں میم؟" وہ حیران ہوا۔

"میں عام لوگوں کی طرح عام ٹرانسپورٹ میں سفر کرنا چاہتی ہوں۔" اس کے لہجے میں ایک حسرت چھپی ہوئی تھی۔

"اوکے۔" وہ مسکرایا، اس نے گاڑی کو لاک کیا اور وہ دونوں چلتے چلتے پارکنگ سے باہر نکل آئے اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد وہ اس کے ساتھ میٹرو بس میں بیٹھی ہوئی تھی۔

کھڑکی کے پاس بیٹھی ذوناش کسی معصوم بچے کی طرح خوش ہو رہی تھی، اس کے لمبے اور کھلے بال ہوا سے بار بار اڑ کر اس کے ساتھ والی نشست پہ بیٹھے کومیل کے چہرے کو چھو رہے تھے، وہ بار بار اپنے بالوں کو سمیٹتی تھی اور اس کے بال ہوا کی شرارتوں پہ بار بار بے قابو ہو کر اس کے چہرے پہ بکھر جاتے۔

اس کے قیمتی برانڈڈ کلون اور اس کے بالوں سے آنے والی مہک کومیل کے دل کو مسحور کر رہی تھی، انہیں میٹرو بس میں بیٹھے ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔

"کومیل مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" ذوناش نے گردن موڑ کر اپنے ساتھ بیٹھے کومیل آفریدی سے کہا۔

"اوکے ہم اس بس سے اترتے ہیں۔" کومیل نے اٹھ کر ڈرائیور کو بس روکنے کو کہا۔

میٹرو بس سے نیچے اترنے کے بعد وہ سڑک کے کنارے بنے ٹریک پہ پیدل چلنے لگے، یہ دوبئی کا ایک سستا سا علاقہ تھا۔

"کومیل تم دیکھو یہاں کہیں کوئی ڈھابہ ٹائپ ہوٹل ہے تو وہاں چل کر کھانا کھاتے ہیں۔" ذوناش کی بات پہ کومیل نے از حد حیرت سے اپنے ساتھ چلتی ہوئی اس لڑکی کو دیکھا جو اس وقت دنیا کے مہنگے ترین سیون اسٹار ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھی اور اس سے کسی سستے ہوٹل پہ کھانا کھانے کی فرمائش کر رہی تھی۔

"اگر تمہیں میری دماغی حالت پہ شبہ ہو رہا ہے تو پلیز ایسا مت سوچو میں تقریباً دنیا کے ہر فائیو اور سیون اسٹار ہوٹلز میں کھانا کھا چکی ہوں سوائے کسی دیہی ڈھابے پہ دیسی کھانا کھائے ہوئے، خاص چیزیں اب مجھے خاص نہیں لگتی ہیں، عام اور معمولی چیزیں زیادہ فیسی نیٹ کرتی ہیں مجھے۔" وہ کومیل کی حیرت بھانپ کر مسکراتی ہوئی اسے بتانے لگی۔

"میم آپ کی کلاس کی لڑکیاں ایسے نہیں سوچتی ہیں، آپ کی سوسائٹی کی لڑکیوں کی خواہشیں اتنی چھوٹی نہیں ہوتیں، پھر آپ ایسا کیوں سوچتی ہیں؟"

"تم نے ٹھیک کہا کومیل، ہماری کلاس کی لڑکیاں اور ان کی خواہشات چھوٹی نہیں ہوتیں، میری ہمیشہ بڑی بڑی خواہشوں کو پورا کیا گیا اور چھوٹی چھوٹی خواہشوں کو نظر انداز کیا گیا ہے، پھر نہ جانے کب میری وہ چھوٹی چھوٹی خواہشیں بڑی بڑی خواہشات میں بدل کر میرے دل میں حسرتوں کے ڈھیر لگانے لگیں، اب وہ بڑی بڑی خواہشات میرے لئے بے معنی ہو کر رہ گئیں ہیں اور تمہیں ایک بات بتاؤں؟ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں، کاش میں ایک عام سے گھر میں پیدا ہونے والی ایک عام سی لڑکی ہوتی اور ایک عام سی زندگی گزارتی۔"

"مگر میم لڑکیاں تو ایسی شاہانہ زندگی کے خواب دیکھتی ہیں اور آپ ہیں کہ......" کومیل نے جملہ ادھورا چھوڑا۔

"ہاں لڑکیاں ایسی زندگی کے خواب دیکھتی ہیں مگر وہ غلط کرتی ہیں، میرے پاس دنیا کی ہر آسائش ہے، ماں نہیں ہے، میرا باپ ایک مشہور ڈائمنڈ ڈیلر ہے، مگر ان کے پاس میرے ساتھ وقت گزارنے کا ٹائم نہیں ہے، میں ایک بہت بڑے بنگلے میں رہتی ہوں مگر وہاں میرا کوئی بھائی بہن نہیں ہے جس کے ساتھ میں ہنس سکوں، بول سکوں یا دل کا بوجھ ہلکا کر سکوں، مجھے اکثر اس وسیع و عریض گھر میں ڈپریشن کے دورے پڑتے ہیں میں اکثر سیلپنگ پلز لے کر سوتی ہوں، اس گھر میں دن کی تنہائیاں مجھے ڈستی ہیں اور راتیں اکثر خوف بن کر مجھے ڈراتی ہیں، میں کھڑے کھڑے لاکھوں کی شاپنگ کر سکتی ہوں مگر اپنے لئے کسی کا محبت کرنے والا دل حاصل نہیں کر سکتی میں اپنے لئے سکون نہیں خرید سکتی، میں ایک ہنستی مسکراتی زندگی نہیں خرید سکتی۔" وہ اس کے ساتھ چلتے چلتے نم لہجے میں کہتی گئی۔

کومیل کو اس کی بے بسی پہ افسوس سا ہونے لگا، مگر جواباً اسے کچھ بھی نہ کہہ سکا، کیونکہ اس کے پاس اسے تسلی دینے کے لئے لفظ نہیں تھے، اس کا ذوناش کے ساتھ ایسا کوئی رشتہ نہیں تھا جس کی بنیاد پہ وہ اسے تسلیاں دیتا۔

"تم کچھ کھو گئے نہیں، میری باتوں سے بور ہو رہے ہو کیا؟" اس نے گردن موڑ کر کومیل آفریدی کو دیکھا جس کے چہرے پہ اب سنجیدگی سی چھا گئی تھی۔

"نہیں میم میں آپ کی باتوں سے بور نہیں ہو رہا بس افسوس ہو رہا ہے مجھے۔" اب کہ کومیل نے اپنے اندر کے سچ کو دبایا نہیں تھا، اس کی بات پہ ذوناش اس کے ساتھ چلتی چلتی دھیرے سے مسکرا دی تھی۔

"آج کل لوگ دوسروں کے دکھوں پہ صرف افسوس ہی کرتے ہیں کیونکہ آج کل کی زندگی بھی بالکل فیس بک کی طرح ہو گئی ہے لوگ آپ کے مسائل اور پریشانیاں لائیک کریں گے، انہیں حل کرنے کی فرصت شاید کسی کے پاس بھی نہیں کیونکہ آج کل سب اپنے اپنے مسائل

اپڈیٹ کرنے میں مصروف ہیں۔" وہ اب اپنی ہی بات پہ مسکرانے لگی تھی، کومیل اب خاموش ہو گیا تھا وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی ذوناش کے سچ نے اسے چپ کروا دیا تھا۔

توقف کے بعد اس نے سر اٹھایا تھا اور اس کی نظر سامنے سڑک کے پار کومیل کو ایک ڈھابہ ٹائپ انڈین ہوٹل دکھائی دیا تھا۔

"میم وہ دیکھیں سامنے ایک انڈین ہوٹل کا بورڈ دکھائی دے رہا ہے مگر وہاں تک پہنچنے کے لئے ہمیں یہ روڈ کراس کر کے جانا ہوگا۔" کومیل نے رک کر ہاتھ کے اشارے سے اسے بتایا۔

"یہ تو بہت خطرناک ہوگا۔" سڑک پہ رواں دواں ٹریفک کے اژدھام کو دیکھ کر گھبرائی اور پھر کومیل کو دیکھ کر دھیرے سے بولی۔

"بٹ ڈونٹ وری تم میرے ساتھ...... چلتے ہیں، مگر تم میرا ہاتھ پکڑ لو، میں نے کبھی ایسے روڈ کراس نہیں کیا۔" ذوناش نے اپنا ہاتھ کومیل کی طرف بڑھایا۔

جسے چند لمحوں کی کشش و پنج کے بعد اس نے تھام لیا تھا، اس کا ہاتھ اتنا نرم و ملائم تھا کہ کومیل کو کئی بار ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے روئی کے کسی گالے کو تھام لیا ہو، وہ اس کا ہاتھ تھامے دائیں بائیں دیکھتا ہوا احتیاط سے روڈ کراس کر لایا تھا، روڈ کراس کرتے ہی اس نے ذوناش کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا اب وہ چلتے چلتے اس انڈین ہوٹل کے اندر آ گئے تھے، وہ ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا، جس کے اندر بیٹھنے کے لئے یہ چھوٹا سا ہال بنا دیا گیا تھا اس ہال میں بمشکل چھ سات چھوٹے چھوٹے ٹیبل رکھے گئے تھے۔

"میم آپ یہاں بیٹھئے۔" کومیل نے اسے ایک ٹیبل کی جانب آنے کا اشارہ کیا اور اس کے لئے چیئر ہٹائی، ذوناش چیئر پہ بیٹھ کر مینو کارڈ دیکھنے لگی۔

"مجھے یہ ڈشیز کھانی ہیں، مگر ضروری نہیں ہے کہ تم بھی مجبوراً میرے ساتھ یہی کھاؤ، تم اپنے لئے کچھ اور آرڈر کر سکتے ہو۔" ذوناش نے اسے اپنے مقابل چیئر گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے دیکھ کر کہا، کومیل نے اس کے مینو کارڈ پہ ڈشیز کے اوپر رکھی انگلی کے ساتھ دیکھا۔

"آپ پالک پنیر کھائیں گی اور یہ...... یہ دال ماش؟" کومیل کے لہجے میں حیرانگی تھی۔

"آف کورس، دیسی ڈھابے میں دیسی کھانا ہی کھاؤں گی ناں، اب یہاں میں چائینیز یا اٹالین منگوانے سے تو رہی۔" ذوناش نے بے تکلفی سے اسے مسکراتے ہوئے دیکھا۔

"اوکے میں آرڈر کرتا ہوں۔" کومیل نے مسکراتے ہوئے ویٹر کو قریب آنے کا اشارہ کیا اور کھانا آرڈر کیا اور ویٹر کے جانے کے بعد اس نے ریسٹ واچ دیکھتے ہوئے ذوناش سے کہا۔

"میم آپ مریم خاتون کو بتا دیں، ہمیں واپس جاتے جاتے دیر ہو جائے گی۔"

"ڈونٹ وری میں نے ہوٹل سے نکلتے ہوئے ممی کو بتا دیا تھا واپسی پہ ہمیں دیر ہو جائے گی۔" ذوناش نے اپنے بیگ سے اپنا سیل فون نکال کر چیک کرتے ہوئے بتایا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد مایوس ہو کر دوبارہ سیل فون بیگ میں رکھ دیا۔

"مرسل جانتا ہے میں اس وقت دوبئی میں ہوں، مگر ہمیشہ کی طرح اس کی کوئی مسڈ کال یا مس یو کا میسج نہیں آیا۔" اس نے تاسف سے کہا اور کومیل دل میں سوچنے لگا، مرسل کیسا بدذوق آدمی تھا؟ وہ جس قدر خوبصورت تھی اسے تو ایک لمحے کے لئے بھی خود سے دور نہیں کیا جا سکتا تھا مگر وہ کیسے اس حسن کی مورت سے اتنا بے گانہ رہتا

تھا؟"

اس کے لب خاموش تھے، تبھی ویٹر کھانا لگانے لگا، ٹیبل پہ صرف دو ہی ڈشیز تھیں، پالک پنیر اور دال ماش، ساتھ چٹنی رائتہ سلاد اور کچھ ٹن پیک کوک تھیں، ذوناش نے فریش روٹی توڑ کر آدھی کومیل کی جانب بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"تم نے اپنے لئے کچھ آرڈر کیوں نہیں کیا؟"

"میں نے ضروری نہیں سمجھا میم۔" کومیل نے اس کے ہاتھ سے روٹی لیتے ہوئے کہا۔

ذوناش نے اپنی پلیٹ میں سالن ڈالتے ہوئے اس کی پلیٹ میں بھی ڈالا۔

"کیوں ضروری نہیں سمجھا تم نے؟" اس نے لقمہ بنا کر منہ میں ڈالا۔

"میں کھانے میں نخرے نہیں کرتا، سب کچھ کھا لیتا ہوں۔" وہ مسکرایا اور اپنے لئے لقمہ بنانے لگا۔

"گڈ پھر تو تمہاری بیوی کو خاصی آسانی رہے گی، تمہارے نخرے نہیں جھیلنے پڑیں گے اسے۔" ذوناش نے ایک نظر اس پہ ڈالی، مگر وہ کچھ نہیں بولا، توقف کے بعد وہ بولا تھا۔

"میم یہاں اے سی کی کولنگ اتنی زیادہ نہیں ہے، آپ کو گرمی تو نہیں لگ رہی؟" کومیل نے ٹن پیک کھول کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔

"سب پرفیکٹ ہے مجھے بالکل بھی گرمی نہیں لگ رہی ہے۔" وہ کھانا کھاتے ہوئے مسکرائی۔

اس کی بات پہ کومیل کی بے ساختہ نظر اس کے ماتھے پہ گئی تھی جس پہ پسینے کے ننھے ننھے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔

"پالک پنیر بہت مزے کا ہے، ہمارا کک بنگالی ہے مگر اس نے کبھی یہ نہیں بنایا۔" ذوناش نے رغبت سے کھانا کھاتے ہوئے اسے اطلاع دی، اب وہ اپنی پلیٹ میں دال ماش ڈال رہی تھی، اس نے اپنی آدھی روٹی ختم کر لی تھی، مگر کومیل کے ہاتھ میں روٹی جوں کی توں تھی وہ کھانا کم کھا رہا تھا اور ذوناش کو زیادہ دیکھ رہا تھا۔

"تم کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟ پسند نہیں آیا کیا؟" اس نے دوبارہ روٹی توڑتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"ج...... جی...... میم...... میں کھا رہا ہوں کھانا۔" کومیل نے دوسرا لقمہ بنایا، وہ امیر زادی جسے سرو کرنے کے لئے کمال پیلس میں نوکروں کی ایک فوج موجود تھی وہ امیر زادی اس کے ساتھ ایک سستے ترین ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھاتے ہوئے کومیل کو سرو کر رہی تھی۔

"کاش میں تمہیں کہہ سکتی کہ تم مجھے میم مت کہا کرو۔" ذوناش نے ٹن پیک اٹھا کر لبوں سے لگاتے ہوئے اسے دیکھ کر کہا، جواباً کومیل اسے دیکھ کر رہ گیا، اس کے لئے آج کا دن بہت حیران کن تھا۔

"Fantastic تھوڑی مرچیں ہیں مگر مزے کا ہے۔" ذوناش نے قریب رکھے ٹشو کے ڈبے سے ٹشو نکال کر مرچوں کی بدولت آنکھوں میں آیا پانی صاف کرتے ہوئے تبصرہ کیا، ساتھ میں وہ شوں شوں بھی کر رہی تھی کومیل اس کے انداز پہ مسکرا دیا۔

"آج میری ڈائٹ پلان کا ستیاناس ہو گیا ہے، میں نے زندگی میں کبھی ایک ٹائم میں پوری روٹی نہیں کھائی۔" وہ خوشی سے کومیل کو بتانے لگی۔

"آپ کی صحت دیکھ کر لگتا ہے کہ آپ بہت کم کھاتی ہیں۔" کومیل بھی کھانا ختم کر چکا تھا، نہ

جانے کیسے وہ بے تکلفی سے یہ جملہ کہہ گیا تھا۔

"میں ویک نہیں سمارٹ ہوں اور صرف زندہ رہنے کے لئے کھاتی ہوں۔" ذوناش نے ایک بار پھر ٹشو نکالتے ہوئے اپنا ناک رگڑتے ہوئے باور کروایا تو وہ دھیرے سے سر ہلا گیا، اس کے لب مسکرا رہے تھے جانے وہ اسے یہ اطلاع کیوں دے رہی تھی۔

اب وہ بوڑھا ویٹر برتن اٹھانے لگا تھا، اس کے بال اور داڑھی میں سفیدی اتر رہی تھی اور وہ شلوار قمیض پہنے ہوئے تھا یقیناً وہ مسلم اور پاکستانی ہی تھا، ذوناش نے اپنے بیگ سے ایک بھاری رقم نکال کر اسے ٹپ کے طور پہ دی تو وہ اتنے زیادہ پیسے دیکھ کر اس آدمی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں تھیں اور وہ ذوناش کو ڈھیروں دعائیں دینے لگا، اس کے ساتھ بیٹھے شخص کے ساتھ اس کی جوڑی سلامت رکھنے کی دعائیں، اس کی صحت و تندرستی کی دعائیں، اس کے ہاں چاند سے بیٹے کی ولادت کی دعائیں، وہ اس بوڑھے ویٹر کی دعاؤں سے گڑبڑا گئے تھے وہ شاید انہیں میاں بیوی سمجھ رہا تھا، اس ہوٹل سے باہر نکلتے ہوئے کاؤنٹر پہ رک کر ذوناش نے ایک بار پھر اپنے بیگ سے اپنا والٹ نکالا تھا۔

"میم پلیز آپ باہر جائیں، میں پے کر کے آتا ہوں۔" کومیل کی بات پہ اس نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"نہیں میں کرتی ہوں پے بل کہاں ہے، مجھے بتاؤ؟"

"میم آپ رہنے دیں، میں دیتا ہوں، بل اتنا کم ہے کہ میں آپ کو بتاتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے۔" کومیل نے اپنے والٹ سے درہم نکالے، جو اس نے آنے سے قبل ہوٹل سے کرنسی چینج کروائی تھی۔

"اوکے ایز یو وش۔" وہ مسکراتی ہوئی باہر آ گئی، چند لمحوں کے بعد کومیل بھی بل پے کر کے باہر آ گیا تھا، رات کے دس بج رہے تھے۔

کومیل نے سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر ٹیکسی روکی اور انگلش میں ٹیکسی والے کو برج العرب جانے کو کہا۔

ذوناش تب تک ٹیکسی میں پچھلی سیٹ پہ بیٹھ چکی تھی، کومیل ڈرائیور کے ساتھ اگلی نشست پہ بیٹھ چکا تھا ٹیکسی اب دوبئی کی سڑکوں پہ دوڑ رہی تھی۔

کومیل کی نظروں کے سامنے ابھی تھوڑی دیر پہلے ذوناش کی دریا دلی کا وہ منظر گھوم رہا تھا جب اس نے بوڑھے ویٹر کی ایک بھاری رقم سے مدد کی تھی اور وہ کس طرح روتے ہوئے اسے ڈھیروں دعائیں دے رہا تھا اور جواباً وہ اس کے تشکرانہ انداز پہ شرمندہ سی ہو رہی تھی، اس کی رحم دلی نے کومیل کو متاثر کیا تھا اور اسی لئے وہ بالکل خاموش بیٹھا، اس کے بارے میں سوچ رہا تھا، کہ اچانک گاڑی کی پچھلی نشست سے ذوناش نے ٹیکسی ڈرائیور سے انگلش میں اس علاقے کے سب سے اچھے اور مشہور نائٹ کلب کے بارے میں پوچھا تھا۔

کومیل کے ذہن سے لفظ نائٹ کلب نے ہر سوچ بھک سے اڑا دی تھی، ذوناش پیچھے بیٹھی اب انگلش میں ٹیکسی ڈرائیور کو اس علاقے کے سب سے بہترین نائٹ کلب کی طرف جانے کو کہہ رہی تھی، ڈرائیور نے آگے سے ایک جگہ یو ٹرن لیا اور گاڑی کو ایک دوسری سڑک پہ موڑ دیا۔

"میم آپ نائٹ کلب جاتی ہیں؟" کومیل نے گردن موڑ کر بے یقینی سے پوچھا، پتہ نہیں وہ ذوناش کے منہ سے کیا سننا چاہتا تھا۔

"آف کورس، اندر کی فرسٹریشن اور ڈپریشن

دور کرنے کے لئے نائٹ کلب جانا چاہیے،
مرسل اکثر مجھے نائٹ کلب لے کر جاتا ہے۔''
ذوناش نے نا صرف اعتراف کیا بلکہ اسے بھی
مشورہ دے ڈالا، وہ تاسف سے سیدھا ہو کر بیٹھ
گیا تھا، نہ جانے کیوں کومیل کو اس کے اس
انکشاف پہ افسوس سا ہوا تھا، حالانکہ اسے بالکل
بھی افسوس نہیں ہونا چاہیے تھا، ذوناش اور مرسل
کا تعلق جس کلاس سے تھا، وہاں یہ چیزیں بہت
عام اور معمولی سمجھی جاتی تھیں۔
ٹھیک دس منٹ کے بعد ٹیکسی ڈرائیور نے
گاڑی ایک نائٹ کلب کے باہر روک دی تھی،
ذوناش نے ڈرائیور کو پے کیا اور کومیل کے ساتھ
فٹ پاتھ پہ چڑھ آئی، سامنے نائٹ کلب کے
باہر لگا بورڈ جگمگا رہا تھا، کومیل کا چہرہ بے تاثر تھا
سپاٹ تھا، وہ کسی ربوٹ کی طرح اس کے ساتھ
چل رہا تھا۔
نائٹ کلب کا اندرونی ماحول ویسا ہی تھا
جیسا نائٹ کلبوں کا ہوا کرتا ہے ایک طرف بار بنا
ہوا تھا، جہاں لڑکے لڑکیاں ڈرنک لے رہے تھے
اور کاؤنٹر پہ ہی کچھ بیٹھ کر پی بھی رہے تھے،
قریب ہی صوفوں کی ایک لمبی لائن لگی ہوئی تھی
جہاں لڑکے لڑکیاں شراب نوشی میں مصروف تھے،
وہاں کا بے ہودہ ماحول دیکھ کر کومیل شرم سے پانی
پانی ہو رہا تھا، نازیبا ماحول قیامت کی نشانی بن کر
کومیل کے اوسان خطا کر رہا تھا۔
سامنے وسیع ڈانسنگ فلور تھا جہاں بلند آواز
میں مشہور عرب سنگر **Amr diab** کا ہٹ
سونگ **Elleila habibila elleila**
گونج رہا تھا، ڈانسنگ فلور پہ لڑکے اور لڑکیاں اس
سونگ اور میوزک پہ تھرک رہے تھے۔
ذوناش بار کی طرف بڑھ رہی تھی، کومیل
اپنی ڈیوٹی نبھاتے ہوئے لوگوں کے ہجوم سے
راستہ بناتا ہوا اسے بار تک لے آیا تھا، وہاں پہنچ
کر ذوناش نے کاؤنٹر پہ اپنی پسندیدہ ڈرنک آڈر
کی تھی، کومیل مسلسل حیرت سے ذوناش کو دیکھ رہا
تھا، تھوڑی دیر پہلے اس کے دل میں ابھرنے
والے ذوناش کے حوالے سے خیالات اب
دھندلے ہونے لگے تھے، ذوناش دونوں ہاتھوں
میں گلاس پکڑے اس کی جانب پلٹی۔
''لو یہ تمہارے لئے۔'' ذوناش نے گلاس
کومیل کی جانب بڑھایا۔
''میں یہ نہیں پیتا۔'' مختصر جواب۔
''تو کوئی اور ڈرنک آڈر کر لو، جو تمہیں پسند
ہو؟'' ذوناش کی بات پہ اسے نہ جانے کیوں غصہ
آیا۔
''میں کسی بھی قسم کی ڈرنک نہیں پیتا۔'' دو
ٹوک انداز میں باور کروایا گیا۔
''اوہ رئیلی۔'' وہ مسکرائی اور لائن کے ساتھ
لگے ایک خالی صوفے پہ بیٹھ گئی، کومیل اس کے
سرہانے پروفیشنل انداز میں کھڑا ہو گیا۔
''تم کھڑے کیوں ہو؟ یہاں بیٹھ جاؤ
میرے پاس۔'' ذوناش نے اپنے ساتھ صوفے
پہ خالی جگہ کی جانب اشارہ کیا۔
''تھینکس میم، میں یہاں ایزی ہوں۔''
''مگر میں ایزی نہیں ہوں، کم آن یہاں
بیٹھو۔'' اس نے گلاس اپنے قریب رکھ کر اسے
بازو سے پکڑ کر زبردستی اپنے ساتھ بٹھایا۔
''یہاں لڑکیاں اپنے باڈی گارڈ کے ساتھ
نہیں اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ آتی ہیں۔''
ذوناش اپنے ساتھ مجبوراً بیٹھے کومیل کی معلومات
میں اضافہ کیا اور پھر ایک گلاس اٹھا کر اس کی
جانب بڑھایا۔
''لو تھوڑی سی ٹرائی کرو۔'' کومیل کا جی چاہا
کہ اس کے ہاتھ سے گلاس پکڑ کر زمین پہ دے

مارے نہ خود پیئے اور نہ اسے پینے دے، مگر اسے پینے سے روکنے کا کوئی رشتہ کوئی تعلق بھی تو نہیں تھا جس کی بنیاد پہ وہ ذوناش کو روکتا۔

''میم میں نے کہا ناں میں یہ سب نہیں پیتا۔'' اب کے اس کے انداز میں نہایت بے زاریت تھی اور اس نے اپنی جانب بڑھ ہوا ذوناش کا گلاس والا ہاتھ غصے سے پیچھے کیا تھا، گلاس سے ڈرنک چھلک کر ذوناش کے کپڑوں پہ گر گئی تھی۔

''اسٹوپڈ مین، تمہاری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو منٹوں میں اسے جاب سے فارغ کر دیتی۔'' ذوناش نے اپنے بھیگے کپڑوں کو دیکھ کر قدرے غصے اور خفگی سے کہا، تو وہ شرمندہ سا ہو گیا۔

''سوری میم!'' کومیل نے معذرت کی، ذوناش خاموشی سے ڈرنک پینے لگی۔

''کہتے ہی مفت کی شراب قاضی بھی نہیں چھوڑتا تم کیسے مرد ہو؟ تمہیں تو مفت شراب کے ساتھ پلانے والی کا مفت میں ساتھ بھی مل رہا ہے؟'' ذوناش نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کرتے ہوئے اسے ذومعنی انداز میں دیکھا، وہ اس کے بے حد قریب بیٹھی تھی۔

''حرام چیز، مفت میں ملے یا روپے خرچ کر کے حاصل کی جائے حرام کو میں حرام ہی سمجھتا ہوں۔'' کومیل نے لب بھینچے درشتگی سے دوٹوک انداز میں کہا تو وہ مسکراتی ہوئی اس کا آدھا چھلکا ہوا گلاس اٹھا کر پینے لگی۔

وہ گلاس بھی خالی کر دینے کے بعد اب وہ جھک کر اپنے شوز اتارنے لگی، کومیل نے اس کو حیرت سے دیکھا، اب وہ نہ جانے کیا کرنے والی تھی؟

شوز اتارنے کے بعد وہ ڈانسنگ فلور کی جانب بڑھ گئی، نا چاہتے ہوئے بھی کومیل لوگوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا اس کے ساتھ اس کے پیچھے چل رہا تھا، اس کے ساتھ رہنا، اس کی حفاظت کرنا، اس کی ڈیوٹی تھی اور وہ اپنی ڈیوٹی نبھا رہا تھا۔

فاسٹ میوزک اور گانے کے بول ذوناش کو تھرکنے پہ مجبور کر رہے تھے، دھیرے دھیرے ذوناش پہ نشہ چڑھ رہا تھا اور وہ نشہ اپنا اثر دکھا بھی رہا تھا، وہ ڈانس کرتے کرتے کئی بار لڑکھڑائی تھی اور کومیل نے کئی بار اسے گرنے سے بچایا تھا نہ جانے کیوں ذوناش کے اس روپ نے اسے ہرٹ کیوں کیا تھا؟ وہ اس کا ذاتی ڈرائیور اور باڈی گارڈ تھا، اسے اس کی حفاظت کے لئے رکھا گیا تھا، عام لفظوں میں وہ ذوناش کا ملازم تھا، اس کا تعلق صرف اتنا ہی تھا اس کے ساتھ۔

اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ جس سوسائٹی سے تعلق رکھتی تھی وہاں یہ چیزیں روٹین کا حصہ تھی، اس کے باوجود نہ جانے کیوں اسے ذوناش کی اس حرکت پہ افسوس ہوا تھا، حالانکہ اس کے پاس افسوس کرنے کا بھی کوئی حق موجود نہ تھا، پھر بھی جانے کیوں؟ وہ بار بار اس کی حالت دیکھ کر اسے تاسف سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ہائی سوسائٹی کے والدین اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخل کروا کر دینی تعلیم و تربیت دینا کیوں بھول جاتے ہیں؟ انہیں دنیا کے سب سے خوبصورت مذہب اسلام کے بارے میں آگاہی کیوں نہیں دلائی جاتی؟ انہیں گناہ اور ثواب کے بیچ فرق کیوں نہیں سمجھایا جاتا؟ شاید اسی لئے اس سوسائٹی کے بچے اپنے مذہب سے یتیمی والی زندگی گزارتے ہوئے ہمیشہ خراب اور حرام چیزوں میں سکون حاصل کرتے ہیں اور اپنی زندگی اپنے ہی ہاتھوں برباد کر کے گزار دیتے ہیں، وہ اپنی ہی سوچوں میں گم اس سے قدرے

فاصلے پہ کھڑا یہ باتیں سوچ رہا تھا، جب وہ نشے میں ڈانس کرتی ہوئی یک دم اس کے قریب آ گئی تھی۔

''کم...... آن...... کومیل...... میرے ساتھ ڈانس کرو ناں، میرا کوئی پارٹنر نہیں ہے، آج رات یہ بھول جاؤ کہ تم میرے باڈی گارڈ ہو۔'' ذوناش نے بکھری سانسوں کے ساتھ اس کے گلے لگتے ہوئے اصرار کیا۔

''میم یہ...... یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟ پلیز پیچھے ہٹیئے مجھے یہ سب نہیں آتا۔'' کومیل نے گڑبڑاتے ہوئے اسے خود سے دور کیا۔

''تم بہت بورنگ انسان ہو۔'' اس نے لڑکھڑاتے ہوئے اس کے سینے پہ مکا مارا، وہ اب بھی اس کے سینے سے لگی کھڑی تھی۔

''میم پلیز، آپ اس وقت نشے میں ہیں، دور ہٹیئے مجھ سے۔'' کومیل نے زچ ہو کر اس موم کی گڑیا کو پرے دھکیلا، جو اس کا ایمان خراب کرنے پہ تلی ہوئی تھی۔

''ایک خوبصورت لڑکی تمہیں اپنے ساتھ ڈانس کرنے کی آفر کر رہی ہے اور تم...... بدذوق آدمی، اسے انکار کر رہے ہو اسے خود سے دور کر رہے ہو؟ اگر میں چاہوں تو ابھی اسی وقت میرے ایک اشارے اور آفر پہ اس کلب کے تمام مرد میرے ساتھ ڈانس کرنے کے لئے بے تابی سے میری طرف لپک پڑیں گے، سنا تم نے۔'' وہ نشے میں اس کے یوں اسے خود سے دور کرنے پہ کومیل کو سخت سست سنا رہی تھی۔

''آئی ڈونٹ نو...... تت...... تم خود کو...... کیا سمجھتے ہو؟''

''میم آپ چلئے یہاں سے، آپ کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔'' کومیل نے اس کا بازو پکڑ کر ڈانسنگ فلور سے اترنا چاہا، مگر اس کی خفگی سے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔

''ہاتھ مت لگاؤ مجھے، تم ایک فضول آدمی ہو، خواہ مخواہ اپنی شرافت کا ڈھنڈورا پیٹنے والے، ضرورت سے زیادہ شریف آدمی، یہ...... یہ شرافت تمہیں کچھ نہیں دے گی اسٹوپڈ مین۔'' وہ نشے میں اس پر برس رہی تھی اور اب لڑکھڑاتی ہوئی ڈانسنگ فلور سے خود ہی نیچے اتر آئی تھی، وہ کومیل کے لئے ایک آزمائش بنتی جا رہی تھی، چلتے چلتے وہ کئی بار لڑکھڑائی، کئی لوگوں سے ٹکرائی، وہ اس کے عقب میں لپکا، اس سے پہلے کہ وہ ہاتھوں میں شراب کے گلاسوں کی بھری ٹرے پکڑے بار کے ویٹر سے ٹکراتی عجلت میں کومیل نے عقب سے اسے شانوں سے تھام لیا تھا، اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا، آہستہ آہستہ اس کا ذہن مکمل طور پہ نشے میں ڈوب رہا تھا اب وہ منہ ہی منہ میں دھیرے دھیرے کچھ بڑبڑا رہی تھی، اس کا وجود جیسے اپنا بوجھ اٹھانے سے عاری ہو رہا تھا، کومیل نے اس شانوں سے تھام رکھا تھا اور بار سے باہر نکل آیا تھا، اب وہ مکمل طور پہ مدہوش ہو کر اس پہ گر گئی تھی اور وہ بڑی مشکل سے اسے سہارا دے کر کسی ٹیکسی کو ڈھونڈ رہا تھا، وہ اس کی بانہوں میں تھی ہوش خرد سے دنیا سے بیگانہ، اس کے نفس کو جھنجھوڑتی ہوئی اس سے لڑتی ہوئی، اسے شکست دینے پہ اس کے نفس کو مارنے پہ تلی ہوئی، وہ خود سے نشے میں ڈھے گئی تھی اور اب اس کے اندر کی دنیا کو ہلانے کی کوشش کر رہی تھی، رات کے دو بج رہے تھے خدا خدا کر کے اسے ایک ٹیکسی نظر آئی تھی جسے کومیل نے ہاتھ کے اشارے سے روک لیا تھا، ٹیکسی ڈرائیور کو ہوٹل جانے کا کہہ کر وہ ذوناش کو اپنی بانہوں میں لئے گاڑی کی پچھلی سیٹ پہ آ بیٹھا۔

ٹیکسی ڈرائیور ہوٹل کو جانے والی سڑک پہ

گاڑی ڈال چکا تھا، کومیل نے دھیرے سے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے، اس کا سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا تھا، اس کے لمبے اور ریشم جیسے خوبصورت بال اس کے چہرے پہ اس کے دائیں بائیں کندھوں پہ بکھرے ہوئے تھے غیر محسوس انداز سے اس نے اس موم کی گڑیا کو دیکھتے ہوئے دھیرے سے اس کے چہرے پہ بکھرے بالوں کو ہٹایا تھا، اس کے صبیح چہرے سے نظریں ہٹنا مشکل ہو رہا تھا کومیل کے لئے۔

اس کی بڑی بڑی بند آنکھیں اور لمبی پلکیں اس کے گلابی گالوں پہ سایہ کیے ہوئے تھیں، اس کا ستواں ناک اور ناک میں موجود ایک باریک نقطے جیسا ڈائمنڈ کا نوز پن، چمکتا ہوا اسے اپنی نظریں نہ ہٹانے پہ مجبور کر رہا تھا، اس کے تراشے ہوئے خوبصورت ہونٹوں پہ لگی ریڈ لپ اسٹک اب اس کے ہونٹوں سے اوپر اپر لپ اور ٹھوڑی پہ بھی پھیلی ہوئی تھی، اس نے بے ساختہ اپنی پاکٹ سے ٹشو نکالا تھا اور اس کے ہونٹوں سے پھیلی لپ اسٹک صاف کرنے لگا۔

اس دوران ٹیکسی ڈرائیور نے ایک جگہ خالی سڑک دیکھ کر تیزی سے یوٹرن لیا تھا اور وہ ایک بار پھر کومیل کی جانب لڑھک گئی تھی اس کا سر کومیل کے کندھے پہ تھا اور وہ تقریباً اس پہ گری ہوئی تھی، وہ ایک عجیب سچویشن میں گھر گیا تھا، اس موم کی گڑیا اس ساحرہ کے وجود سے اٹھتی مہک، اس کا نازک سا سراپا، اس کے لئے ایک سخت آزمائش بن کر اس نے نفس کو کمزور کرنے لگا تھا، اس کی بکھری سانسیں کومیل کو اپنی گردن پہ محسوس ہو رہی تھیں۔

اس کی بے ساختہ نظروں نے اس کی خوبصورت گردن پہ موجود سیاہ تل کو دیکھا، جو مزید اس کے سوئے ہوئے جذبات کو بغاوت پہ اکسانے لگا تھا۔

اس کے کندھوں کے پیچھے حائل اپنے بازو کو کومیل نے دھیرے سے حرکت دی تھی اور بے اختیار، اس کے ہاتھ کی انگلیوں نے ذوناش کی گردن پہ موجود اس سیاہ تل کو چھوا، جو اس کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔

وہ مکمل ہوش و حواس میں اس کے قریب آئی تھی تو کتنی آسانی سے کومیل نے اسے دھتکار دیا تھا، اب وہ ہوش خرد سے بیگانہ تھی تو بھی وہ اس کے بے انتہا قریب تھی مگر اب چاہتے ہوئے بھی وہ اسے خود سے ہٹا نہیں پا رہا تھا، اسے دھتکار نہیں پا رہا تھا، اس کی قربت کومیل کو یک دم اتنی بھلی لگی تھی کہ وہ اپنے نفس سے لڑتے لڑتے جیسے ہارنے لگا تھا۔

اس کی نظریں ایک بار پھر اس کے حسین چہرے کا طواف کرنے لگی تھیں، بے اختیار وہ اس کے ماتھے پہ جھک کر اپنے لبوں کی مہر لگانے لگا تھا، کہ معاً اس کی پاکٹ میں اس کا سیل فون بج اٹھا تھا، وہ جیسے ایک دم سے اپنے سیل کی رنگ ٹون بجتے ہی ہوش میں آ گیا تھا۔

اسے اپنے ہی عمل پہ از حد شرمندگی ہونے لگی تھی اور اس نے گھبرا کر پاکٹ سے اپنا سیل فون نکالا تھا، مریم خاتون اسے فون کر رہی تھیں، کومیل نے کال ریسیو کی۔

"کومیل کہاں ہو تم دونوں؟ اور ذونا ڈارلنگ کا سیل فون کیوں بند ہے، ہم کب سے اسے کال کر رہا ہے، مگر اس کا نمبر بند ہے، سب ٹھیک تو ہے کومیل؟ ٹینشن سے ہمارا برا حال ہو رہا تھا۔" وہ ایک ہی سانس میں بے ساختہ بولیں۔

"مریم خاتون آپ پریشان مت ہو، بیٹری لو ہو جانے کی وجہ سے میم کا فون بند ہو گیا ہو گا، آپ پریشان مت ہوں، میم نائٹ کلب چلی گئی

تھیں، فی الحال بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، میں انہیں لے کر آرہا ہوں، آپ بے فکر ہو جائیں۔" کومیل نے انہیں تسلی دی اور فون بند کر دیا، اب وہ گردن موڑے شیشے سے باہر دیکھ رہا تھا اسے اپنے آپ پر اور اپنی بے ساختگی پہ حیرت ہو رہی تھی، وہ اپنی ہی حرکت پہ خود سے شرمندہ ہو رہا تھا، صرف ایک لمحہ، ایک لمحہ لگا تھا اسے بہکنے میں، اگر اس کے فون کی گھنٹی نہ بجتی تو؟ وہ اس سوالیہ نشان کے آگے کانپ گیا تھا، وہ بے خودی میں اگر کوئی غلطی کر بیٹھتا تو کبھی خود کو معاف نہ کر پاتا، وہ خود کو لعنت ملامت کرنے لگا شاید اس کی کوئی نیکی اس کے کام آگئی تھی جو وہ اس کے حسن کے آگے اپنے نفس اور ضمیر کی حدود نہیں توڑ پایا تھا۔

یہ لڑکی، یہ نوکری اس کے لئے ایک بہت بڑی آزمائش بن رہی تھی، وہ اپنی سوچوں میں الجھا بس سوچے ہی جا رہا تھا کہ گاڑی برج الحرب کے سامنے رک گئی تھی۔

کومیل نے اس ٹیکسی ڈرائیور کو پے کیا تھا اور ایک بار پھر اسے سہارا دے کر اندر کی جانب بڑھ آیا تھا، اسے پہلے کی طرح اپنے بازو میں لئے وہ لفٹ کے ذریعے اوپر آیا تھا اور اسے لے کر اپنے سویٹ کی جانب بڑھ آیا تھا، اس نے ایک ہاتھ سے بڑی مشکل سے اپنی پاکٹ سے ایک کارڈ نکالا تھا اور سویٹ کے ڈور میں ایک خاص جگہ پہ پھیر کر دروازے کا لاک کھولا تھا۔

اور اسے ہنوز اسی طرح سہارا دیئے اندر لے آیا تھا اور اسے اس کے روم میں پہنچا کر اپنے روم کی طرف بڑھ گیا، روم میں آکر اپنی شرٹ اتاری تو شرٹ پہ ذوناش کی ریڈ لپ اسٹک کے نشان تھے، اس کے ہاتھ لاشعوری طور پہ رک گئے تھے، لپ اسٹک کے ان نشانات میں کومیل کو اس کی قربت کے وہ پل یاد آئے جب وہ اس کے گلے آلگی تھی کومیل نے اسے دور ہٹایا تھا، پھر وہ غصے میں برس پڑی تھی اس پہ اور پھر وہ نشے میں گرتی لڑکھڑاتی ہوئی خفا ہو کر جا رہی تھی، وہ اس کے پیچھے لپکا تھا اور پھر باہر نکلتے نکلتے وہ ہوش و خرد کی دنیا سے بیگانہ ہو گئی تھی۔

پھر کومیل نے اسے مجبوراً سہارا دینے کے لئے اس کے گرد اپنے بازو کا حصار بنایا تھا، اسے ٹیکسی میں بٹھایا تھا، اس کے بال اس کے چہرے سے ہٹائے تھے اس کا منہ صاف کیا تھا اور پھر وہ ایک بار پھر اس کے کندھے سے آلگی تھی اور اس بار کومیل نے اسے خود سے الگ نہیں کیا تھا۔

اس کی سفید اور دودھیا گردن پہ موجود سیاہ تل نے اس کے ایمان کو ڈگمگایا تھا، اس کے ستواں خوبصورت ناک میں موجود اس ننھی سی چمکتی ہوئی ڈائمنڈ نوز پن نے اس کے نفس کو کمزور کر دیا تھا۔

اس کے وجود سے اٹھنے والی اس کے مخصوص قیمتی کلون کی مہک اس کی بے ترتیب زلفیں، اس کی بکھری سانسیں، سب باری باری اس کی آنکھوں کے سامنے فلم کی مانند چلنے لگی، اب اس کے ہاتھ غیر محسوس انداز سے لپ اسٹک کے ان نشانات کو چھو رہے تھے، اس کے دل کی کیفیت بہت عجیب ہو رہی تھی، اس نے اپنی آنکھوں میں ابھرنے والے ان مناظر کو جھٹکا، اپنے دل سے اس کی قربت کے خیالات کو سختی سے نکال کر خود شرٹ اتار کر صوفے پہ پھینکتے ہوئے واش روم میں گھس گیا تھا اور کافی دیر شاور لیتا رہا، شاور لے کر اس کا ذہن کچھ فریش ہوا تھا۔

وہ سونے کے لئے اپنے بیڈ پہ لیٹا مگر آنکھیں بند کرتے ہی پھر سے کچھ دیر پہلے کے تمام مناظر کسی فلم کی طرح اس کی آنکھوں کے

سامنے چلنے لگے تھے۔

وہ لیٹا لیٹا اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور بے ساختہ اس کا ہاتھ سائیڈ ٹیبل پہ موجود پانی کے گلاس کی جانب بڑھا تھا، جو اس نے اٹھا کر اگلے ہی لمحے ایک سانس میں خالی کر دیا تھا۔

زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی نے اس کے دل کی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا، اس کے دماغ کو بری طرح جکڑ لیا تھا۔

وہ بہت عجیب قسم کی لڑکی تھی، اوور ری ایکٹ کرنے والی نہ اس سے خوشی برداشت ہوتی نہ غم اور نہ غصہ، پہلی بار وہ کسی لڑکی کے بارے میں یوں متفکر ہوا تھا، بے بس ہوا تھا۔

بالآخر اس کی بے بسی نے کومیل آفریدی سے یہ فیصلہ کروالیا تھا کہ اسے دوبئی سے واپس جاتے ہی اس نوکری کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دینا تھا۔

اب دوبئی میں قیام کے دوران اسے اس پاگل اور ناسمجھ میں آنے والی لڑکی کی حرکتوں کو برداشت کرنا تھا، چند دن محض چند دن، فیصلہ کرتے ہی اس کا دل مطمئن ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن کی صبح ناشتہ کومیل نے اور مریم خاتون نے اکیلے ہی ڈائننگ ٹیبل پہ کیا تھا، ذوناش ابھی نہیں اٹھی تھی اور مریم خاتون نے اسے جگایا بھی نہیں تھا، ناشتے کے بعد وہ اپنے پسٹل لے کر نیچے اسٹڈی میں آ گیا تھا اور صوفے پہ بیٹھ کر انہیں صاف کرنے لگا تھا۔

انٹر کام پہ اس نے اپنے لئے وہیں چائے منگوالی تھی، وہ چائے بھی پی رہا تھا اور ساتھ میں پسٹل بھی صاف کر رہا تھا جب اسے کسی کے سیڑھیاں اتر کر نیچے آنے کا احساس ہوا تھا، اس نے گردن موڑ کر عقب میں دیکھا۔

ذوناش ڈارک بلو پاؤں تک زیادہ سے طیر والی نائٹی میں ملبوس بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹے، ننگے پاؤں چلتی ہوئی اسی کی جانب آ رہی تھی، اس کے ہاتھ میں کچھ شاپنگ بیگز بھی تھے۔

''السلام علیکم میم!'' کومیل نے سر جھکائے مودبانہ انداز میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اسے سلام کیا تھا، پچھلی رات کا ایک ایک منظر اسے دیکھتے ہی پھر سے اس کی آنکھوں کے سامنے لہرانے لگا تھا۔

''وعلیکم السلام!'' وہ اس کے سلام کا جواب دے کر اس کے مقابل صوفے پہ بیٹھ گئی تھی۔

''بیٹھ جاؤ۔'' ذوناش نے اسے بیٹھنے کو کہا اور وہ خاموشی سے اپنی نشست پہ بیٹھ گیا۔

اس دوران مسلسل ذوناش کی نگاہیں اسے اپنے چہرے پہ گڑی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

''میم آپ کو کوئی کام تھا مجھ سے؟'' اس نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں کام ہے۔'' ٹانگ پہ ٹانگ رکھتے ہوئے ذوناش نے دھیرے سے کہا تو اس نے اپنی جھکی نظریں اٹھائیں۔

''کیسا کام؟''

''مجھے تم سے ایکسکیوز کرنا ہے۔'' اطمینان سے جواب دیا گیا۔

''مگر کس لئے؟'' وہ اب کے سچ میں حیران ہوا۔

''رات میں نے تم سے خاصا مس بی ہیو کیا۔'' ذوناش کی بات پہ اس کے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوا اس کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا تھا اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ ذوناش کو کیا جواب دے لہٰذا اس نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا تھا۔

''میری بات کا جواب نہیں دو گے؟'' وہ

متفکر ہو کر سیدھی ہو بیٹھی۔
''کچھ باتوں کے جواب نہیں دیئے جاتے۔'' مختصر جواب۔
''مگر میں لینا چاہتی ہوں جواب، تمہاری خاموشی مجھے بہت تکلیف دے رہی ہے۔'' وہ بے چین ہوئی۔
''مگر کیوں؟ آپ کو کیوں تکلیف دے رہی ہے میری خاموشی؟'' اب کے اس نے حیرت سے ذوناش کے چہرے کو دیکھا۔
''میں نہیں جانتی اس کیوں کا جواب۔'' اس کے چہرے پہ کرب تھا۔
''میں آپ کا ڈرائیور ہوں، آپ کا باڈی گارڈ، دوسرے لفظوں میں آپ کا ملازم ہوں آپ کو مجھ سے نہ ایکسکیوز کرنا چاہیے نہ میری خاموشی کو فیل کرنا چاہیے۔'' کومیل نے لفظ ڈرائیور، باڈی گارڈ اور ملازم پہ زور دیا۔
''حالانکہ تم کہیں سے بھی میرے ملازم نظر نہیں آتے۔'' وہ بے چین ہوئی۔
''نظر آنے اور ہونے میں بڑا فرق ہوتا ہے میم۔'' کومیل کا انداز دوٹوک تھا۔
''ہوتا ہوگا، مگر مجھے نہیں لگتا۔'' وہ دھیرے سے بولی، وہ بے چین ہو کر اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔
''نہیں لگتا تو پلیز خود کو سمجھا لیں، میں آپ کا ملازم ہوں۔'' اسے اب غصہ آ گیا تھا۔
''تم بہت عجیب آدمی ہو، میں اس فرق کو مٹانا چاہتی ہوں اور تم ہو کہ۔'' وہ بھی بے ساختہ اپنی نشست سے اٹھ کر بے خودی میں کہہ گئی تھی، کومیل کو اس کے جملے نے گھما کر رکھ دیا تھا، اس کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا، غصے سے اس نے لب بھینچ لئے۔
''میں آپ کا ملازم ہوں، مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آپ مجھے کچھ بھی الٹا سیدھا کہیں گی اور وہ میں سنتا چلا جاؤں گا، آپ کو اپنے اور میرے درمیان اخلاقی حدود کا ایک فاصلہ رکھنا ہوگا اور یہ بات آپ جتنی جلدی ہو سکے سمجھ جائیں۔'' کومیل نے گویا اسے وارننگ دی تھی، اب غصہ واضح طور پہ اس کے چہرے سے عیاں ہونے لگا تھا اس کے لہجے سے عیاں ہونے لگا تھا، جواباً وہ دھیرے سے مسکراتے ہوئے اس کے مقابل آ کھڑی ہوئی تھی۔
''غصہ تم پہ بہت سوٹ کرتا ہے کومیل، مجھے شروع سے ہی تم جیسے مرد کی تلاش تھی، تم جیسے ساتھ کی تلاش تھی، مجھے بزدل مرد بالکل اچھے نہیں لگتے۔'' ذوناش نے دھیرے سے اس کے کالر کو درست کرتے ہوئے اطلاع دی۔
''میم پلیز...... فار گاڈ سیک...... آپ پھر سے بہک رہی ہیں، مجھے اتنا مجبور مت کریں کہ میں ابھی اور اسی وقت اس جاب کو خیر باد کہہ دوں۔'' کومیل نے اس کا ہاتھ پرے کیا۔
''تم بہت گھمنڈی ہو، بہت مغرور، تم میں ایک عجیب کشش محسوس ہوتی ہے مجھے۔'' اس نے بے ساختگی سے کومیل کا ہاتھ تھاما۔
''میرے ساتھ ایسے اجنبی بن کر رہو گے تو مشکل ہو جائے گی میرے لئے۔''
''جسٹ شٹ اپ میم۔'' وہ نہایت غصے میں اس کا ہاتھ جھٹک کر دھاڑا۔
''کیا مسئلہ ہے آپ کا؟ آپ جو چاہتی ہیں مجھ سے، وہ امپاسیبل ہے، سمجھیں آپ؟ مجھے یہ جاب کسی صورت قبول نہیں ہے اور اس سلسلے میں مجھے ابھی اور اسی وقت سر کمال سے بات کرنا ہو گی۔'' وہ دوٹوک انداز میں قریب ہی صوفے پہ رکھا اپنا موبائل اٹھانے لگا۔
''رک جاؤ کومیل، تم ڈیڈ سے بات نہیں کرو

گے۔'' وہ اس کے راستے میں آئی۔

''میرا ان سے بات کرنا اب ضروری ہو گیا ہے۔'' ہنوز دوٹوک انداز تھا کومیل کا۔

''اگر تم نے یہ جاب چھوڑی تو یاد رکھنا، میں خود کو شوٹ کرلوں گی اور اس کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔'' وہ غصے اور بے بسی سے چلائی، وہ اس کی بات پہ ورطہ حیرت سے اسے دیکھے گیا، وہ ایک پاگل لڑکی کے ہاتھوں مجبور ہو رہا تھا۔

''آپ مجھے اس طرح کی فضول دھمکیاں دے کر بلیک میل نہیں کر سکتی ہیں۔'' کومیل نے موبائل پہ کمال قریشی کا نمبر ملانا شروع کیا۔

ذوناش نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، صوفے پہ رکھا، گولیوں سے بھرا پسٹل اٹھا کر اپنی کنپٹی پہ رکھ لیا۔

''میں تمہیں دھمکی نہیں دے رہی ہوں، اس بات کا اندازہ تمہیں ابھی ہو جائے گا۔'' اس کے جنونی انداز پہ کومیل کے ہاتھ سے موبائل چھوٹ گیا تھا اور اگلے ہی لمحے اس نے پسٹل ذوناش کے ہاتھ سے جھپٹ لیا تھا، کومیل کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، اگر وہ پسٹل چلا دیتی تو، اس تو سے آگے، اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا کر دیا تھا۔

''پاگل ہو گئی ہیں آپ؟ آپ کو کسی باڈی گارڈ کی نہیں سائیکاٹرسٹ کی ضرورت ہے۔'' وہ نہایت غصے میں اسے گھور رہا تھا۔

''آئی نو، مرسل بھی یہی کہتا ہے۔'' وہ دھیرے سے مسکرائی اور وہ اسے حیرت سے دیکھے گیا، کومیل نے واقعی اس جیسی عجیب لڑکی نہ دیکھی تھی، وہ میتھ کے ایک مشکل ترین سوال کی طرح تھی جس کا جواب ڈھونڈنا کومیل کو ناممکن دکھائی دے رہا تھا۔

''آئم سوری میرا مقصد تمہیں پریشان کرنا نہیں ہے۔'' ذوناش نے اس کے چہرے پہ چھائی پریشانی دیکھ کر کہا۔

''آپ جانتی ہیں کہ پریشان کرنا کسے کہتے ہیں؟'' اس کا طنزیہ انداز دیکھ کر وہ مسکرائی۔

''ہاں جانتی ہوں، مگر چھوڑو، پلیز لیو دس ٹاپک، میں نے تمہارے لئے کچھ کپڑے خریدے تھے میں تمہیں وہ دینے آئی تھی، یہ لو۔'' وہ ایک بار پھر دوستانہ انداز میں بیگز اٹھا کر اس کے مقابل آ کھڑی ہوئی۔

''مگر کیوں؟'' کومیل نے اچنبھے سے استفسار کیا۔

''بس میرا دل چاہا تھا۔'' دھیرے سے جواب دیا گیا۔

''اپنے دل کو سمجھا لیں وہ ایسی خواہشیں مت کرے، کچھ خواہشات انسان کو بربادی کی طرف لے جاتی ہیں۔'' کومیل نے دھیرے سے سمجھایا۔

''مگر کچھ خواہشات اتنی منہ زور ہوتی ہیں کہ چاہتے ہوئے بھی ان پہ بس نہیں چلتا، وہ کس ندی نالے کے پانی کی طرح بہا کر لے جاتی ہیں انسان کو۔'' اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں جواب دیا، تو وہ پہلو بدل کر رہ گیا۔

''میم میں یہ نہیں رکھ سکتا۔'' اب کے اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''مگر کیوں؟'' وہ حیران ہوئی تھی۔

''آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ یوں میرے لئے شاپنگ کریں، آپ کے پاس یہ حق صرف مرسل صاحب کے لئے ہے۔'' ہنوز دوٹوک انداز میں باور کروایا گیا تھا، اس کی بات پہ وہ غصے میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی، نہ جانے کیوں ایسے کومیل پہ غصہ آ جایا کرتا تھا، جس کا وہ برملا اظہار بھی کر دیا کرتی تھی۔

''تم بہت مغرور انسان ہو، ضرورت سے

کچھ زیادہ ہی خوددار میں نے تمہارے لئے یہ
خریدے تھے، مرسل کے لئے نہیں اور آئندہ مجھے
یہ بتانے کی کوشش مت کرنا کہ کون کس چیز کا
حقدار ہے؟ سب معلوم ہے مجھے۔" غصے میں اس
کا ستواں ناک پھول گیا تھا، ماتھے پہ بل پڑ گئے
تھے اور اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔

نہ جانے وہ کومیل پہ اپنے ایسے رویئوں سے
کیا اور کیوں حق جتاتی تھی؟ کومیل کا جی چاہا کہ
اس سے پوچھے کیا کبھی اسے کسی نے بتایا کہ وہ
غصے میں کتنی غضبناک لگتی ہے؟ غصہ اس پہ کس
قدر سوٹ کرتا ہے؟

"سوری میم۔" وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا
ہوا تھا۔

"میں یہ نہیں رکھ سکتا ہوں، سوری اگین۔"

"سوری مت کرو مجھ سے، غلطی میری ہے،
ان بیگز کو اٹھاؤ اور باہر کی ڈسٹ بن میں پھینک
دو۔" وہ غصے میں اپنا جملہ مکمل کرنے کے بعد تیز
تیز قدم اٹھاتی سیڑھیاں چڑھ کر اس کی نظروں
سے اوجھل ہو گئی تھی، وہ اس کا غصہ پتہ نہیں کیوں
سہہ جاتا تھا، اس نے کبھی کسی کا غصہ برداشت
نہیں کیا تھا پھر وہ غیر محسوس انداز میں شاپنگ
بیگز کھول کر دیکھنے لگا، جن میں Levis اور
Mustang کی قیمتی جینز تھیں، Nike اور
Marks and spencer کی شرٹس تھیں،
جنہیں خریدتے ہوئے دیکھ کر کومیل یہی سمجھا تھا
کہ وہ مرسل کے لئے خرید رہی ہے۔

کومیل نے وہ شاپنگ بیگز اٹھائے اور
اپنے روم میں آ گیا اور اس ساحرہ کے پل پل
بدلتے رویئوں اور پیاز کے پرتوں جیسی شخصیت
کے بارے میں سوچتے سوچتے نہ جانے اس کب
اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

☆☆☆

وہ ساری رات ٹھیک سے سو نہیں پایا تھا،
شاید اسی لئے وہ سویا تھا تو گہری نیند سو گیا تھا،
اچانک اسے احساس ہوا تھا جیسے کوئی اس کے
کمرے کا دروازہ بجا رہا ہو، اس نے تکیہ منہ سے
ہٹایا، اور سیل فون اٹھا کر دیکھا وہ سائلنٹ پہ تھا
اور ذوناش کی پانچ مسڈ کالز سکرین پہ آئی ہوئی
تھیں۔

وہ ایک جھٹکے سے بستر سے اٹھا اور اس نے
عجلت میں دروازہ کھولا، دروازے میں مریم
خاتون کھڑی تھیں۔

"کومیل ایوننگ ہو چکا ہے، تم کافی دیر
سے اپنے روم میں پڑا سو رہا تھا، تم ٹھیک تو ہے
ناں؟" مریم خاتون نے فکرمندی سے پوچھا۔

"جی مریم خاتون میں ٹھیک ہوں، بس
گہری نیند سو گیا تھا، آپ کو کوئی کام تھا مجھ سے؟"

"ذونا ڈارلنگ کہیں باہر جانا چاہتا ہے، تم
جلدی سے ریڈی ہو جاؤ۔" مریم خاتون نے
اسے اطلاع دی۔

"او کے میں دس منٹ میں فریش ہو کر آتا
ہوں۔" کومیل نے انہیں بتایا اور واش روم میں
گھس گیا اور پھر جب وہ فریش ہو کر اپنے روم
سے باہر نکلا تو وہ گہرے نیلے رنگ کے سلکش
سے ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس بالوں کی اونچی سی
پونی بنا کر دائیں کندھے سے بالوں کو آگے کیے،
کانوں اور گلے میں ڈائمنڈ کی باریک سی جیولری
پہنے گلاس وال کے قریب کھڑی سمندر کو دیکھ رہی
تھی۔

"آئی ایم ریڈی میم!" عقب سے کومیل
کی آواز نے اسے پلٹنے پہ مجبور کیا تھا اور پھر اسے
دیکھ کر وہ بے ساختہ مسکرائی تھی، وہ Levis کی
جینز اور Nike کی لیمن کلر کی ٹی شرٹ پہنے اس
کے سامنے کھڑا تھا۔

"بالآخر میرے غصے نے اپنا کام کر دیکھایا۔" وہ مسکراتی ہوئی اس کے مقابل آ کھڑی ہوئی۔

"یو آر سوہینڈسم!"

"تھینکس میم!" وہ بھی دھیرے سے مسکراتے ہوئے سر جھکا گیا۔

"بے بی ڈارلنگ ہم کہاں جا رہے ہیں، تم بتاتا کیوں نہیں؟" مریم خاتون اپنے کمرے سے نکل کران کے قریب آئیں۔

"ممی آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں، میں آپ کو کسی سیارے پہ نہیں لے کر جا رہی، ہم Mall of the emirates جا رہے ہیں۔" ذوناش نے مسکراتے ہوئے انہیں دیکھا اور قریب ہی صوفے پہ رکھا اپنا شولڈ بیگ اٹھا کر کندھے پہ ڈالا، پھر وہ تینوں سویٹ سے نکلنے لگے تو کومیل کو جیسے کچھ یاد آیا۔

"میم وہ گاڑی تو کل دوبئی مال کی پارکنگ میں تھی؟"

"میں نے دن میں نصیر انکل کو کال کر کے گاڑی منگوائی تھی ان کا ملازم گاڑی یہاں چھوڑ گیا تھا۔" ذوناش نے گاڑی کی چابی اس کی جانب بڑھائی اور پھر تینوں ہوٹل سے نکل کر گاڑی میں بیٹھے اور اپنے مطلوبہ مال کی طرف روانہ ہو گئے، پھر Mall of the emirates میں بھی اس نے ڈھیروں شاپنگ کی تھی اور وہیں انہوں نے ایک اٹالین ریسٹورنٹ میں رات کا کھانا بھی کھایا تھا اس کے بعد ذوناش انہیں اسی مال کے اندر موجود Snow park میں لے آئی تھی، وہاں آ کر کومیل کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی سچ مچ برفانی علاقے میں آ گئے ہوں۔

ذوناش کو SKI کا بہت شوق تھا اور ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ Snow park میں آتی اور SKI نہ کرتی؟ SKI کا costume پہن کر جب وہ Snow park کے اندر داخل ہوئی تو اس نے مسکرا کر کومیل اور ممی کو ہاتھ ہلایا تھا اور پھر کمال مہارت سے برف پہ SKI کرتی ہوئی دیگر لوگوں کے بیچ راستہ بناتی ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

مریم خاتون کی آنکھیں چھلک پڑیں تھیں، اسے SKI کرتے ہوئے دیکھ کر۔

"ایک وقت تھا جب ذونا بے بی اور ذونین بابا اکٹھے SKI کیا کرتا تھا۔"

"ذونین کو کیا ہوا تھا مریم خاتون؟" کومیل نے سنو پارک کے جنگلے کے پاس اپنے ساتھ آبدیدہ سی کھڑی مریم خاتون سے پوچھا۔

"ذونین اور ذوناش جڑواں بہن بھائی تھا، ان کی اٹھارویں برتھ ڈے والی رات ذونین بابا کا اتنا شدید ایکسیڈنٹ ہوا کہ وہ جانبر نہ ہو سکا اور ہمیں ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلا گیا، تب سے ذونا ڈارلنگ ڈسٹرب رہتا ہے ذونین بابا سے ذونا کا بہت دوستی تھا، دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے مثالی محبت کرتا تھا اور ایک دوسرے کا بہترین دوست تھا، بچپن سے دونوں کو ماں کا پیار نہیں ملا پھر صاحب بھی اپنا بزنس سے ٹائم نکال کران کو ٹائم نہیں دے پاتا تھا، اس لئے ذونین بابا کی ڈیتھ کے بعد ذونا ڈارلنگ کا مزاج بھی بدل گیا اور وہ خود کو اکیلا محسوس کرنے لگا تب سے وہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی Sensitive ہو گیا ہے، ذونا بے بی دل کا بہت اچھا ہے، بہت نرم دل ہے اور بہت رحم دل بھی، اگر وہ بھی تم کو ڈانٹے تو اس کی ڈانٹ کا بھی غصہ مت کرنا، ذونا کا غصہ وقتی ہوتا ہے۔"

"وہ صرف کمپنی مانگتا ہے، مرسل بابا بھی بڑے صاحب کی طرح ہر وقت بزنس میں

مصروف رہتا ہے، وہ بھی ذونا بے بی کو ٹائم نہیں دے پاتا، اس لئے وہ اکیلے پن کا شکار ہو کر ڈسٹرب ہو جاتا ہے اور غصہ دیکھاتا ہے، انجوئیلی اور پھر نہ جانے کون کافر کم بخت میری ذونا بے بی کی جان کا دشمن بنا ہوا ہے، دو سال سے صاحب کو ذونا بے بی کے حوالے سے Threds مل رہا ہے اور پچھلے دنوں تو بے بی پہ قاتلانہ حملہ بھی ہو چکا ہے، اسی لئے صاحب بے بی کی سیکورٹی کے حوالے سے سخت پریشان رہتا ہے، ذونا بے بی میں تو صاحب کی جان ہے۔'' مریم خاتون ازحد فکرمندی سے اپنے ساتھ کھڑے کومیل کو تفصیل بتا رہی تھیں اور کومیل کا دل اس کے لئے اور نرم ہو گیا تھا۔

''ہم ہر وقت اپنے God سے بے بی کی لمبی زندگی کی دعائیں مانگتا ہے God میری ذونا ڈارلنگ کا ہمیشہ حفاظت کرنا۔'' مریم خاتون اپنے مذہب کے مطلب اپنے سینے پہ سلیب کا نشان بنا کر آنکھیں بند کیے ذوناش کی زندگی کی دعائیں مانگنے لگیں۔

انہیں ذوناش سے بہت پیار تھا، انہوں نے ذونین اور ذوناش کو ہمیشہ ایک ماں جیسا ہی پیار دیا تھا۔

''مریم خاتون آپ God پہ بھروسہ رکھیں انشاء اللہ میں اللہ کے حکم کے ساتھ تمیم کی حفاظت اپنی آخری سانس تک کروں گا۔'' کومیل نے سچے دل سے عہد کرتے ہوئے مریم خاتون کے کندھے پہ تھپکی دی تھی۔

اسی اثنا میں ذوناش سامنے سے برف پہ SKI کرتی ہوئی اور مسکراتی ہوئی دیکھائی دی تھی۔

مریم خاتون نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے اسے ہاتھ ہلایا تھا جواباً ذوناش نے SKI کرتے ہوئے کمال مہارت سے جمپ لگایا تھا اور پھر SKI کے مخصوص انداز میں پھسلتی ہوئی خوشی سے چہکتی ہوئی ان کے قریب آ گئی تھی، وہ بہت خوش دیکھائی دے رہی تھی۔

''آج میں نے بہت انجوائے کیا۔'' اس نے خوشی سے بے ساختہ مریم خاتون کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

کومیل نے جب سے اس کے ساتھ باڈی گارڈ کی جاب شروع کی تھی وہ اسے پہلی بار یوں خوش دیکھ رہا تھا، اس رات واپسی پہ ہوٹل جاتے ہوئے اس نے فیصلہ سنایا تھا کہ وہ ساحل سمندر پہ جانا چاہتی ہے۔

''ذونا مائے ڈارلنگ ہم بہت تھک چکا ہے، تم کومیل کے ساتھ چلی جاؤ اور ہم کو ہوٹل ڈراپ کر دو۔'' مریم خاتون نے اسے کہا، ان کے چہرے سے تھکاوٹ چھلک رہی تھی۔

''می می آپ واقعی بوڑھی ہو گئی ہیں اور مجھے بالکل بھی کمپنی نہیں دیتی ہیں آپ۔'' ذوناش نے نروٹھے انداز میں اظہار کیا، کومیل نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے بیک مرر سے اس کی خفگی دیکھی وہ غصے اور خفگی میں اور بھی حسین لگتی تھی۔

''تو ہم نے کون سا کہا ہے کہ ہم جوان ہے، ہم تو اعتراف کرتا ہے کہ اب ہم بوڑھا ہو گیا ہے۔'' مریم خاتون نے پیار سے اسے خود سے بھینچ لیا۔

''کومیل ہے ناں بے بی تمہارے ساتھ، آئم شیور یہ تمہیں بور نہیں ہونے دے گا، کیوں کومیل ہم سچ کہہ رہا ہے ناں؟'' مریم خاتون نے مسکراتے ہوئے اسے تسلی دی تھی اور خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرتے کومیل سے پوچھا، تو وہ بھی مسکراتے ہوئے سر ہلا گیا تھا۔

''جی مریم خاتون۔'' اور پھر کومیل نے

انہیں سمندر کے بیچ واقع سیون اسٹار ہوٹل برج العرب ڈراپ کر دیا تھا اور وہ گاڑی واپس موڑ کر اسی سمندر کے ساحل پہ لے آیا تھا۔

رات کے دس بج چکے تھے ساحل سمندر پہ ہوا خاصی تیز چل رہی تھی، کومیل نے اپنی جینز کے پائنچے فولڈ کر لئے تھے وہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

ہوا سے اس کے بال بار بار بکھر رہے تھے اور وہ بار بار انہیں چہرے سے ہٹا رہی تھی وہ اس کے ساتھ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ایک ٹرانس کی کیفیت میں بتانے لگی۔

''مرسل مجھے کبھی کسی بیچ پہ لے کر نہیں آیا، اس نے کبھی مجھے کسی مال میں شاپنگ نہیں کروائی، اس نے کبھی شوق سے میرے ساتھ ٹائم نہیں گزارا اسے بالکل نہیں معلوم کہ مجھے کیا پسند ہے اور کیا ناپسند، اسے بالکل نہیں معلوم کہ مجھے کیا چیزیں خوشیاں دیتی ہیں اور کیا چیزیں ہرٹ کرتی ہیں؟ میرا فیورٹ کلر کون سا ہے میں کھانے میں کیا شوق سے کھاتی ہوں؟ اسے میری پسند اور ناپسند کا کوئی آئیڈیا نہیں ہے اور ڈیڈ نے اسے میرے لائف پارٹنر کے طور پہ چنا ہے اور یہ میری زندہ زندگی کو ختم کرنے کے لئے کافی ہے، کہ مرسل مجھ میں ایک رتی بھی انٹرسٹ نہیں لیتا ہماری کیمسٹری آپس میں بالکل بھی نہیں ملتی ہے۔'' ذوناش کی نظریں وسیع سمندر پہ مرکوز تھیں وہ دھیرے سے اپنے ساتھ چلتے کومیل کو بتا رہی تھی، اس کے لہجے میں بے پناہ دکھ تھا، کومیل کو بھی اس کی باتیں سن کر دکھ ہوا تھا۔

''مجھے اکثر حیرت ہوتی ہے میم کہ مرسل صاحب آپ جیسی خوبصورت لڑکی میں انٹرسٹ کیوں نہیں لیتے؟ کوئی بھی شخص آپ کو دیکھ کر با آسانی آپ کی محبت میں گرفتار ہو سکتا ہے کیونکہ آپ بہت خوبصورت ہیں۔'' کومیل نے اس کی ہمدردی میں بالکل عام سے لہجے اور دوستانہ انداز میں اعتراف کیا تھا، مگر ذوناش اس کے عام سے لہجے اور ہمدردی میں ادا کی گئی خاص بات سن کر رک گئی تھی اور مجبوراً کومیل کو بھی رکنا پڑا تھا، اس نے حیرت سے ذوناش کو دیکھا تھا کہ وہ جانے کیوں رک گئی تھی؟ مگر وہ اس کو مسکراتے چہرے اور گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''کیا واقعی کوئی بھی شخص میری خوبصورتی سے متاثر ہو کر با آسانی میری محبت میں گرفتار ہو سکتا ہے؟ میرا دیوانہ بن سکتا ہے؟''

''یس میم، میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' وہ جیسے اپنے ہی جملے پہ جز بز سا ہو رہا تھا، بے ساختگی اور ہمدردی میں وہ جانے کیسے اس کی تعریف کر گیا تھا۔

''اگر سچ مچ ایسا ہے تو میں چاہوں گی تم میری محبت میں گرفتار ہو جاؤ، تمہیں مجھ سے عشق ہو جائے لازوال عشق۔'' ذوناش نے آنچ دیتے ہوئے لہجے میں اس کے ہاتھ تھام لئے تھے۔

''تم میں ایک مقناطیسی کشش ہے کومیل، ایک ایسی کشش جو خود بخود مجھے تمہاری طرف کھینچتی ہے، تم میرے آس پاس رہتے ہو تو مجھے اچھا لگتا ہے، تمہاری کمپنی مجھے دلی سکون اور خوشی دیتی ہے، تمہارے ساتھ رہ کر مجھے کسی قسم کا کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا، میں ریلیکس فیل کرتی ہوں تمہارے ساتھ۔''

''تم...... تم اچھے لگتے ہو مجھے اور یہ پسندیدگی روز بہ روز بڑھتی جا رہی ہے نہ جانے کیوں؟'' وہ فرط جذبات میں اس کے مقابل کھڑی اس کے لئے محبت ہی محبت تھی کوئی اور مرد ہوتا تو یقیناً اس سچویشن میں خوشی محسوس کرتا اور جواباً اظہار محبت کرتا، اس کے جذبات کو سراہتا

اس کی دکھ میں ڈوبی ہوئی باتیں سن کر چند لمحوں کے لئے کومیل کا دل نرم ہوا تھا۔

"تم میں ایک مقناطیسی کشش ہے کومیل، ایک ایسی کشش جو مجھے خود بخود نا چاہتے ہوئے بھی تمہاری طرف کھینچتی ہے تم...... تم میرے آس پاس رہتے ہو تو مجھے اچھا لگتا ہے، تمہارے ساتھ مجھے تحفظ کا احساس ہوتا ہے، تم ...... تم میری ضرورت بنتے جا رہے ہو میری عادت بنتے جا رہے ہو، مجھے ایسا لگتا ہے میری پسندیدگی کا یہ راستہ ایک دن مجھے تمہاری محبت میں مبتلا کر دے گا، ایسی محبت جہاں سے واپسی میرے لئے ناممکن ہو جائے گی۔" وہ دیوانگی میں اپنے دل کا حال اس پہ عیاں کر رہی تھی۔

"پلیز اسٹاپ اٹ آپ پھر سے انتہائی فضول باتیں کر رہی ہیں۔" کومیل نے نفرت اور غصے سے اس کے ہاتھ جھٹکے، اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی خوبصورت آسیب اسے چمٹ گیا ہو۔

"کومیل یہ فضول باتیں نہیں ہیں، یہ میرے دل کی گواہی ہے، تم...... تم مجھے اچھے لگنے لگے ہو۔" وہ دیوانہ وار اسے بتا رہی تھی، اس کی نظروں میں کومیل کے لئے محبت تھی۔

کومیل کی جگہ کوئی اور مرد ہوتا تو اس سچویشن میں یقیناً بہت خوشی محسوس کرتا، اس کے جذبات کو سراہتا، خوشی سے پھولا نہ سماتا۔

ایک حسین ترین اور دولت مند لڑکی، کومیل سے محبت کا اظہار کر رہی تھی، مگر وہ کوئی اور مرد نہیں تھا، وہ کومیل آفریدی تھا، وہ اپنی حدود، اس کے اور اپنے بیچ فرق، حیثیت اور مرتبے کو بخوبی سمجھتا تھا۔

"میم پلیز فار گاڈ سیک، خود کو سمجھائیں اور آپ مجھ سے غلط امیدیں مت لگائیں، میرے دل میں آپ کے لئے ایسی کوئی فیلنگز نہیں ہیں اور نہ کبھی ایسی فیلنگز میرے دل میں جنم لے سکتی ہیں، آپ میری مالکن ہیں میں آپ کا ملازم ہوں اور بس، اس بات کے آگے آپ فل اسٹاپ لگا دیں، یہی میرے اور آپ کے بیچ کی حقیقت ہے سچ ہے۔" کومیل نے اب کے اسے غصے کی بجائے پیار سے سمجھانا چاہا تھا۔

"کومیل تمہارے اندر مجھے اپنی زندگی دکھائی دیتی ہے، تم...... تم میرے خوابوں میں آنے والے سپر ہیرو ہو، میرے آئیڈیل ہو تم، تم پہلی نظر میں ہی میرے دل میں گھر کر گئے تھے، تم میری زندگی میں آنے والے پہلے مرد ہو جس کے آگے میں خود کو بے بس محسوس کرتی ہوں، تمہارے لئے میرے دل میں جو فیلنگز ہیں وہ تم سے پہلے کبھی کسی مرد کے لئے بیدار نہیں ہوئیں، آئی سوئیر کومیل میں سچ کہہ رہی ہوں۔" ذوناش رو دینے کو تھی۔

"اور میں چاہتی ہوں میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں، تمہاری بن کر۔" وہ اس کے بے حد قریب آتے ہوئے بے ساختگی سے بولی، اس وقت وہ ہذیانی کیفیت میں تھی۔

"آپ کا دماغ خراب ہو چکا ہے، آپ کس مٹی سے بنی ہوئی ہیں، کیوں آپ کو میری بات سمجھ نہیں آ رہی، میں کتنی بار آپ کو سمجھاؤں کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔" نا چاہتے ہوئے بھی اس کی آواز بلند ہو گئی تھی۔

"کیوں ممکن نہیں ہو سکتا؟ سب کچھ ممکن ہو سکتا ہے اگر تم چاہو تو۔" ذوناش ہنوز اپنی بات پہ قائم تھی، وہ اس وقت ایک ٹرانس کی کیفیت میں تھی، اب اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے، اس کی ڈھٹائی نے کومیل کا دماغ خراب کر دیا تھا۔

"آپ نہ میری منزل ہیں نہ میری

آئیڈیل، میرے جیسے شخص کی زندگی کا کوئی راستہ آپ تک نہیں جاتا، آپ کی منزل مرسل قریشی ہے کومیل آفریدی نہیں، میں ایک معمولی سا انسان ہوں خدارا مجھے اتنے بڑے اور کٹھن امتحان میں نہ ڈالیں، آپ مجھے مسلسل گمراہ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، مجھے ایک ایسے راستے پہ قدم رکھنے پہ اکسا رہی ہیں جس پہ قدم رکھتے ہی سوائے بربادی کے اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا، مجھے میری ڈیوٹی ایمانداری سے نبھانے دیں اور بخش دیں مجھے، آپ کے ساتھ ڈیوٹی نبھاتے ہوئے مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں کسی پل صراط پہ چل رہا ہوں، اس جاب کو میرے لئے ایک بھیانک غلطی مت بنائیں اور معاف رکھیں مجھے اپنے عشق اور محبت سے۔" غصے اور طیش سے کومیل کا سانس پھول گیا تھا، وہ تنگ آ گیا تھا اس کی ایسی باتوں سے اور پھٹ پڑا تھا، چیخ اٹھا تھا، اس کے کیرئیر میں آج تک ایسی سچویشن سے اس کا واسطہ نہ پڑا تھا کومیل کو حقارت اس کا غصہ، اس کے دوٹوک الفاظ اس کی آنکھوں سے آنسو بن کر بہنے لگے تھے۔

اس کا رویہ، اس کا انداز، اس کی دھتکار ذوناش کے لئے بہت انسلٹنگ تھی، جان لیوا تھی، ایسی بے بسی ذوناش نے کبھی زندگی میں محسوس نہ کی تھی، آنسوؤں سے اس کا چہرہ بھیگ رہا تھا۔

"But you are my favorite mistake میں سمجھتی تھی مرنے کے لئے زہر کی ضرورت ہوتی ہے مگر نہیں، کبھی کبھی کسی کی حقارت، کسی کا غرور، کسی کے جملے ہی انسان کی جان لے لیتے ہیں اور جانتے ہو یہ موت بڑی تکلیف دے ہوتی ہے I am the biggest fool of this world تم ایک پتھر ہو، گھمنڈی ہو، مغرور ہو، میں نے ایک ایسے شخص سے محبت کی بھیک مانگی جس کی جیب ان سکوں سے خالی ہے ایسی التجا اگر میں نے مرسل سے کی ہوتی تو اس کا کٹھور دل بھی نرم ہو جاتا، مگر نجانے کیوں میں اپنی انا کو اپنے پیروں تلے روند کر تمہارے آگے کیوں گڑگڑائی؟ تم سچ کہتے ہو، تمہاری زندگی کا کوئی راستہ مجھ تک نہیں آتا، میری منزل مرسل قریشی ہے، کومیل آفریدی نہیں پھر کیوں میں بھٹک کر تمہارے پاس آئی کیوں؟" ذوناش کی آواز دکھ حیرت اور افسوس سے کانپ رہی تھی، اس کے لئے یہ سب کچھ انتہائی انسلٹنگ تھا اس نے ایک ناسمجھ اور ضدی بچے کی طرح زندگی کے بازار میں سے ایک ایسا کھلونا مانگ لیا تھا جو اس کے لئے نہیں بنایا گیا تھا۔

"I can not bear this. You insulted me alot تم نے میری ہی نظروں سے گرا دیا ہے، میں آئینہ دیکھوں گی تو وہ مجھ پہ ہنسے گا، میرا مذاق اڑائے گا You insulted me alot۔" وہ ہذیانی انداز میں بولتی ہوئی اس کے سامنے سے ہٹ گئی تھی اور تیز تیز قدموں سے دور جا رہی تھی، اس کے آنسوؤں نے کومیل کے قدم وہیں جکڑ لئے تھے، اس کے آس پاس ذوناش کے الفاظ اس کے جملے گونج رہے تھے، اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کے ہاتھ پاؤں رسی سے باندھ کر اسے سمندر میں پھینک دیا ہو، ایسی بے بسی کومیل نے بھی کبھی زندگی میں محسوس نہ کی تھی، اس کے قدم وہیں جمے ہوئے تھے مگر اس کا دل اب دھیرے دھیرے دھڑک رہا تھا اسے اکسا رہا تھا کہ وہ ذوناش کا ہاتھ تھام لے۔

(باقی اگلے ماہ)

امیدِ سحر

سندس جبیں

سنہری صبح بھیگ رہی تھی جب اس کی آنکھ کھلی، اس نے فوراً سے بستر چھوڑ دیا، آج تو دوبارہ نیند آنے کا سوال ہی نہ تھا، آج اس کا یونیورسٹی میں آخری دن تھا، آج کے دن کا رنگ ہی انوکھا تھا، آج کی تیاری سب سے بڑھ کے تھی، اس نے جینز کے اوپر ڈیزائنر کرتا پہنا اور گلے میں اسکارف ڈال کر بالوں کو یونہی کھلا چھوڑ دیا، کانوں میں مما کے لائے ٹاپس پہنے جن میں زمرد جڑے تھے اور وہ اس کے گول چہرے پر سج کر اسے مزید چمکا گئے۔

اس نے موبائل سائیڈ ٹیبل سے اٹھایا اور ہینڈ بیگ تھامتی باہر بھاگ گئی، اسے آج کسی صورت لیٹ نہیں ہونا تھا، کیسی شاندار زندگی تھی، ان کی یہ یونیورسٹی کی شاندار زندگی اور اس سے جڑی بے پناہ یادیں۔

ناولٹ

وہ سنیعہ مبشر، بی ایس سی ایس کی اسٹوڈنٹ ان کا پانچ لوگوں کا گروپ تھا۔

سنیعہ مبشر! ایک مضبوط اعصاب کی مالک اور لائق اسٹوڈنٹ گھر بھر کی لاڈلی اور ضدی۔

سعد میر! خوبصورت ذہین اور کسی حد تک بگڑا امیر زادہ، اس میں اور سنیعہ میں صرف ایک چیز یکساں تھی، دونوں کی ضد، ورنہ وہ کم گو تھی جبکہ سعد بے تحاشا بولنے والا، وہ دلیل کے بحث کرتی جبکہ سعد بحث برائے بحث میں سب کو پیچھے چھوڑ دیتا تھا۔

اس کے بعد حبیب عارف تھا، قدرے صحت مند اور بے حد جاندار حس مزاح رکھنے والا، میر کی سب سے زیادہ انڈرسٹینڈنگ اٹیچ منٹ حبیب سے تھی، اس کے بعد دانیال نواز تھا، ان کے گروپ کا سب سے خاموش ممبر اور اتنا ہی جینئس اور سب سے آخری نمبر پہ وشمہ کریم تھی۔

سب سے اسٹائلش اور کیوٹ سی وشمہ جس
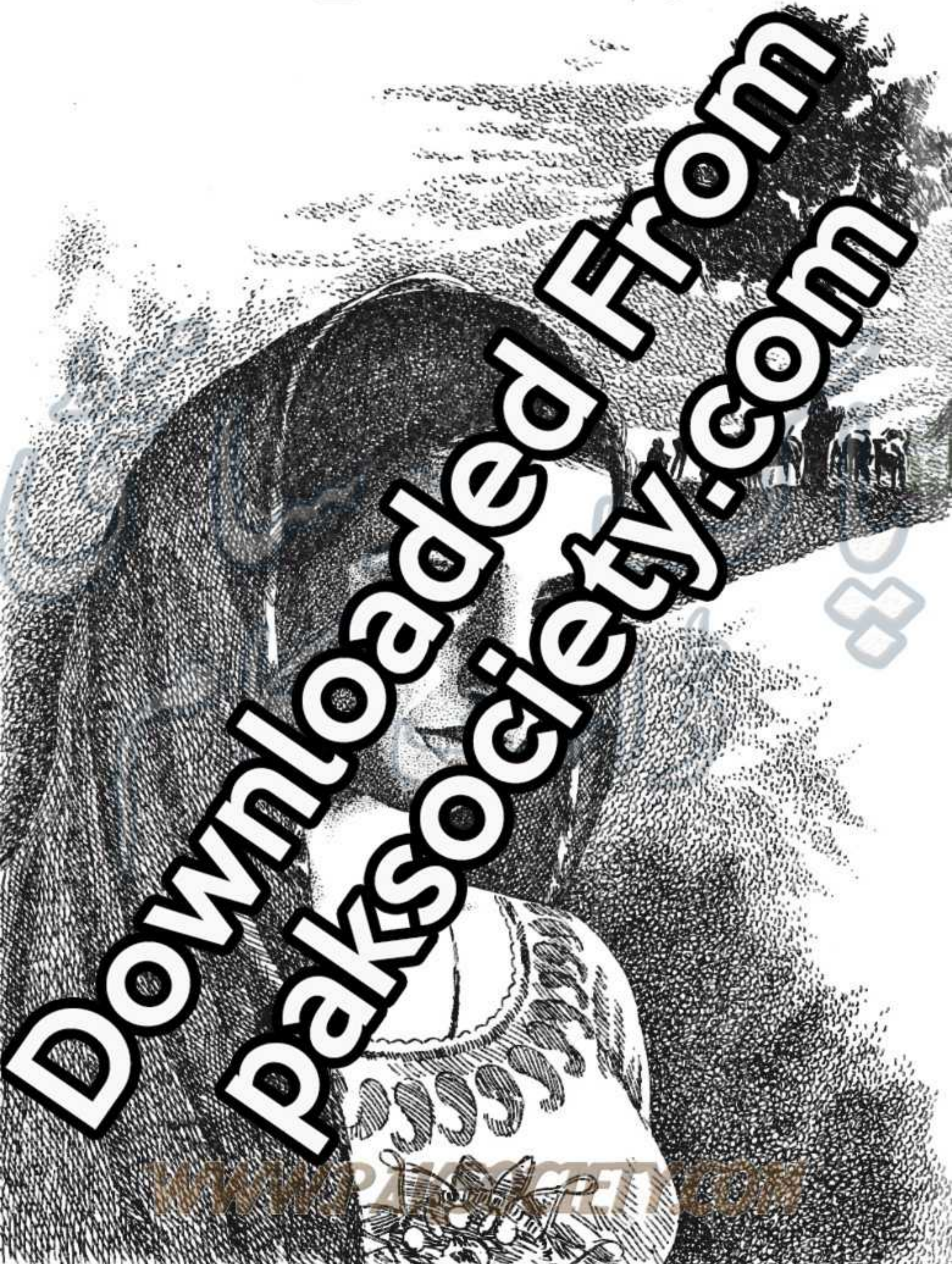
کے پیچھے آدھی یونیورسٹی جھک مارنے کو تیار رہتی تھی اور وہ خود حبیب عارف کے پیچھے جھک مار رہی تھی، میر اس کا مذاق اڑانے کا کوئی موقع نہیں ضائع کرتا تھا۔

سعد، میر وہ اکڑو اور مغرور انسان تھا، جسے یونی کی کوئی لڑکی اپنے اسٹینڈرڈ کی نہیں لگتی تھی، وہ اچھا خاصا ہینڈسم اور گریس فل تھا اور لڑکیاں بھی اسے پسند کرتی تھیں مگر آگے بڑھنے کی اجازت وہ نہیں دیتا تھا۔

سنیعہ کی کالج کے زمانے سے ہی منگنی ہو چکی تھی، اس کا منگیتر شاہ زیب فرانس ہوتا تھا اس لئے اپنے آپ کو ان تمام لغویات سے اپنے تئیں محفوظ سمجھنے والی سنیعہ کو اس ون مین کا انتظار تھا، جو فرانس میں اس کے لئے بینک بیلنس بنا رہا تھا، اس پر بھی میر اس کا مذاق اڑایا کرتا تھا کہ سنیعہ ایسے منگیتر کی مالک تھی، جو اپنی منگیتر کو یوں بھولا ہوا تھا جیسے لوگ گناہ کر کے بھول جاتے ہیں، دانیال کی غم گوئی بھی میر کا نشانہ بنتی رہتی تھی، وہ کسی کو بھی بخشنے کا قائل نہ تھا۔

ہنگاموں سے بھرے چار سال آج ختم ہو رہے تھے، اگلے ماہ سعد میر کو اپنے بابا کی سیالکوٹ والی فرم جوائن کرنا تھی، حبیب سعودی عرب جا رہا تھا، دانیال جاب ڈھونڈ رہا تھا اور سنیعہ مبشر کی شادی تھی۔

کتنی عجیب سی بات تھی وہ ایک ہاتھ کی پانچ انگلیوں کے جیسے پانچ دوست الگ ہو رہے تھے، ان سب کی زندگیاں مکمل طور پر بدلنے والی تھیں، ان کی دلچسپیاں، مشاغل اور ترجیحات کا دائرہ بدلنے والا تھا۔

شاہ زیب پاکستان آ چکا تھا، شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی، وہ خود وشمہ کے ساتھ ہر وقت شاپنگ کرتی پائی جاتی، اگر کبھی غلطی سے میر کا میسج آ جاتا تو وہ رپلائے اتنا لیٹ کرتی وہ جل جاتا، ساتھ ہی طنز کرتا۔

''تم جیسی لڑکیوں کی وجہ سے مارکیٹ چلتی ہے۔'' تم جیسی سے مراد بے وقوف، فضول خرچ اور عقل سے پیدل ہونا تھا۔

جواباً وہ بس ہنسے جاتی، وہ خوش تھی، بے حد خوش، اس کی زندگی بڑی سیدھی سادی سی گزری تھی جس میں شاہ زیب کے علاوہ کسی مرد کا تصور نہ تھا، باقی رہے میر، حبیب اور دانیال، تو وہ صرف دوست تھے، یو نو جسٹ فرینڈز۔

☆☆☆

آج وہ ان سب کو شادی کا کارڈ دینے آئی تھی، فرداً فرداً گھر جانے کی بجائے اس نے سب کو لنچ پر انوائٹ کر لیا تھا، جہاں وہ سب اکٹھے تھے، سب ویسے ہی تھے، حبیب کی اگلے ہفتے فلائٹ تھی، وشمہ اس کے جانے کے غم میں اداس نظر آتی تھی، دانیال کو اسلام آباد جاب مل گئی تھی اور اگلے ماہ سے جوائننگ دے رہا تھا، مگر سعد میر ویسا نہیں رہا تھا، وہ عجیب ہو گیا تھا، اس کے چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی تھی جو اس کے چہرے کا حصہ نہ ہونے کی وجہ سے بالکل سوٹ نہیں کر رہی تھی اور سب سے بڑی بات کہ اس کی بڑی بڑی بھوری آنکھوں کے نیچے ڈارک سرکلز نظر آ رہے تھے۔

سب ہی میر کو دیکھ کر حیران تھے مگر سنیعہ زیادہ ہی حیران تھی، اس کے لئے ہنستے مسکراتے چہرے کی بجائے اس سنجیدگی اور افسردگی کی لپیٹ میں آئے چہرے کو دیکھنا زیادہ مشکل تھا، وہ بار بار استفسار کر رہی تھی مگر وہ ٹال گیا اور وہ جب اس نے حبیب سے پوچھا تو وہ جو خود کو میر کا یار غار کہا کرتا تھا وہ بھی نظریں چرا گیا، سنیعہ کے لئے یہ بات خاصی الجھن بھری تھی مگر وہ ان سب سے

شادی پر آنے کا وعدہ لے کر گھر چلی آئی، اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میر کو کیا پریشانی تھی، بھلا کوئی ایسی چیز تھی جو اسے پریشان کر پاتی وہ تو پریشانی کے سلوشن نکالنے والا بندہ تھا کبھی بھی کسی بات کو خود پر سوار نہ کرتا تھا، پھر اب نجانے ایسا کیا ہوا تھا۔

مگر اسے زیادہ سوچنے کا موقع نہ ملا کیونکہ اگلے ہفتے اس کی شادی کی تقریبات شروع ہو گئیں۔

وشمہ مہندی کے روز اس کی طرف رک گئی تھی، اپنی نگرانی میں اسے مہندی لگوائی گئی، رات دیر تک وہ سب جاگتے رہے، اگلی صبح بہت دیر سے جاگے تھے، مگر چونکہ فنکشن رات کا تھا اس لئے کوئی فکر نہ تھی، گھر بھر میں مہمانوں کا انبار تھا، ہر طرف آوازیں ایسے میں کزنز کی باتیں ہنس ہنس کر اس کی پسلیاں دکھ رہی تھیں۔

بہت دفعہ انسان کو احساس نہیں ہوتا کہ ہنسنا بھی دھیان سے چاہیے، بے جا ہنسنا صرف دل کو مردہ ہی نہیں کرتا بلکہ بعض اوقات مستقبل کی ساری ہنسی بھی چھین لیتا ہے، بالکل ویسے ہی جیسے رزق بھی انسان اپنے حصے کا ہی کھا سکتا ہے اسی طرح غم اور خوشیاں بھی شائد گنے چنے ہوتے ہیں اور انسان کس قدر بے خبر ہے۔

اس نے بے تابی سے گھڑی دیکھی، بارات کو آئے گھنٹہ بھر ہو چکا تھا، مگر ابھی تک نکاح خواں، نکاح شروع کیوں نہیں کر رہا تھا، وہ برائیڈل روم میں وشمہ، کزنز اور کچھ دیگر فرینڈز اور کلاس فیلوز کے ساتھ بیٹھی تھی، سب ہنسی مذاق کر رہی تھیں، پر نجانے کیوں اس کے دل کو عجیب سی بے چینی لگی ہوئی تھی، یکا یک باہر ایک عجیب سا شور اٹھا، بھاگتے دوڑتے قدموں کی آواز اور پھر دھاڑ کی آواز سے دروازہ کھلا اور ایک دراز قامت شخص اندر آیا، جس کے چہرے پر وحشت اور جس کی آنکھوں میں لالی تھی اور وہ سیاہ رنگ کا ایک پسٹل لہرا رہا تھا۔

”جو جہاں ہے وہی بیٹھا رہے گا، خبردار کوئی اپنی جگہ سے ہلا تو۔“ وہ بلند آواز میں دھاڑا تھا۔

سنیعہ فق رنگ کے ساتھ اسے دیکھتی جا رہی تھی، یہ سب کیا ہو رہا تھا اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی اور پھر اس نے نکاح خواں کو اندر آتے دیکھا۔

عجیب سی افراتفری تھی باہر اور پھر ایک فائر کیا گیا، آوازیں چیخیں اور پھر یکلخت خاموشی چھا گئی، اس فائر نے جیسے چابی سے چلتے کھلونوں کو جام کر دیا تھا، اگلے ہی لمحے اس نے حبیب کو اندر آتے دیکھا، وہ بھی ایک خوفناک پسٹل تھامے ہوئے تھا، اس نے آتے ہی نکاح خواں کو دھکا دے کر آگے کیا۔

”انتظار کس چیز کا ہے، نکاح شروع کروایئے۔“ اس کے لہجے میں درشتی اور سختی تھی، نکاح خواں اڑے حواسوں کے ساتھ آگے بڑھے اور اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئے جو غالباً اسی مقصد کے لئے خالی رکھی گئی تھی، کانپتے ہاتھوں کے ساتھ وہ اپنے صفحات الٹ پلٹ رہے تھے، پھر وہ زیر لب کچھ پڑھنے لگے اور اس سے مخاطب ہوئے۔

”سنیعہ بنت مبشر علی کیا آپ کو سعد میر ولد محمد حسن میر بعوض سکہ رائج الوقت پانچ لاکھ روپیہ، اپنے نکاح میں قبول ہیں؟“

”قبول ہیں؟“ وہ پھر سے پوچھ رہے تھے اور سنیعہ کا ذہن جیسے فریز ہو چکا تھا، اس کا ذہن یہ الفاظ سن رہا تھا مگر سمجھ نہیں رہا تھا، وہ پتھرائی ہوئی نظروں سے سامنے کھڑے سعد میر کو دیکھتی جا رہی تھی، مگر وہاں کوئی اور تھا جو اس کی جنگ لڑ سکتا تھا، تڑپ کر سامنے آنے والی یہ ہستی وشمہ

کر یم کی تھی۔

☆☆☆

''شٹ اپ، پاگل ہو گئے ہو تم دونوں کیا ہو رہا ہے یہ؟'' وہ چلا کر پوچھ رہی تھی، میر نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی مگر حبیب تیزی سے آگے آیا، اس نے گن والا ہاتھ سیدھا کیا اور سرد لہجے میں وارننگ دی تھی۔

''اس معاملے سے دور رہو وشمہ۔''

''تم یہ ظلم نہیں کر سکتے، یہ دھوکہ نہیں دے سکتے، یہ جرم ہے۔'' وہ سرخ رنگت کے ساتھ مزید بلند آواز میں چلائی تھی، حبیب کے چہرے پر سرخی ابھری اس نے ضبط نہ کیا اور اس نے الٹے ہاتھ کا بھرپور تھپڑ وشمہ کو مارا، وہ لڑکھڑا کر چیختی ہوئی ایک طرف گر گئی۔

''آپ کو کس چیز کا انتظار ہے مولوی صاحب، نکاح شروع کیجئے۔'' وہ تحکمانہ انداز میں بولا تھا۔

مولوی صاحب ہڑبڑا کر پھر سے سطریں دہرانے لگے، وہ اسی طرح ساکت تھی، وہ اس سے اقرار چاہ رہے تھے، پھر حبیب نے مولوی صاحب کو اشارہ کیا کہ وہ اقرار کو چھوڑیں اور سائن کروائیں، مگر وہ حواسوں میں ہوتی تو کچھ کرتی وہ اسی طرح بے جان ٹانگوں کے ساتھ بیٹھی رہی جب اس نے میر کو اپنے ساتھ بیٹھتے دیکھا، اس کے اندر لمحہ بھر کو ہلچل مچی، اس نے سنیعہ کا ہاتھ پکڑ کر قلم اسے تھمایا اور بہت آہستگی سے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

''سائن کرو سنیعہ۔'' اور سنیعہ نے دیکھا اس کی آنکھوں میں ایسی درندگی اور وحشت تھی کہ لمحہ بھر کو بھی وہ اگر دیر کرتی تو لامحالہ میر نجانے کیا قدم اٹھاتا، اس نے جیسے آنے والے وقت کی تباہی دیکھی اور اپنی ذات کی کرچیاں دیکھیں اور پھر خاموشی سے دستخط کرتی گئی، اس کے بعد میر کے سائن کا مرحلہ آیا اور یوں وہ سنیعہ مبشر سے سنیعہ سعد بن گئی، اس نے میر کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا اور اگلے ہی لمحے اس کا سر اتنی شدت سے گھوما کہ وہ چکرا کر گری تھی۔

دوست وہ ہے
جو ہر برے وقت میں
ہر آزمائش میں
ہر تکلیف میں
آپ کا ساتھ دے
آپ کا بازو بنے
آپ کو سہارا دے
دشمن وہ ہے
جو آپ کے برے وقت کی
تمنا کرے
آپ کی آزمائش پر خوش ہو
آپ کی تکلیف پر شادیانے بجائے
مگر..............
ان دونوں کے علاوہ بھی کچھ لوگ ہیں
دوست نما دشمن
بظاہر سچے دوست
ہر دم آپ کا دم بھرنے والے
ہر لحظہ آپ کا حوصلہ بڑھانے والے
مگر
درحقیقت آپ کی پیٹھ میں خنجر گھونپنے والے
دل ہی دل میں آپ سے حسد کرنے والے
آپ کو ناکام دیکھنے کے خواہاں
آپ کی پشت پر وار کرنے والے......!!!

☆☆☆

کمرے میں گہرا اندھیرا تھا اور وہ دراز قد وجود الٹا بیڈ پر بکھرا ہوا تھا، ہر طرف خاموشی اور تنہائی تھی، پھر آہستہ سے دروازہ چرچرایا اور ایک

اور شخص اندر آیا، اس نے ہاتھ مار کر کمرے کی ساری روشنیاں جلادیں۔

وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہوا، مڑ کر دیکھا تو دانیال تھا، دانیال کا چہرہ بے یقینی کی گرد سے اٹا ہوا تھا اور اس بے یقینی کے پیچھے گہرا افسوس تھا، دانیال کو رات ہی حبیب نے کال کر کے بلایا تھا، وہ اپنی جاب کے سلسلے میں اسلام آباد جا چکا تھا اور اس سارے قصے سے یکسر بے خبر تھا۔

''دانیال!'' سعد نے اسے پکارا۔

''سعد!'' وہ آہستہ سے اس کے سامنے آ بیٹھا اور بغور اس کا جائزہ لینے لگا اور سعد کو یاد آیا وہ اسے سکینر کہا کرتے تھے کیونکہ وہ انسان کا اتنا تفصیلی جائزہ لیا کرتا تھا کہ پل بھر میں جیسے تجزیاتی رپورٹ پیش کر دیا کرتا، اب بھی اس نے سعد کو دونوں شانوں سے تھاما اور گہرے تاسف میں ڈوب گیا۔

''تم نے کیا کر لیا ہے سعد؟ یہ تم نہیں ہو۔'' وہ کتنا صحیح کہہ رہا تھا، یہ روشن چہرے والا سعد کب تھا، یہ تو کوئی ٹوٹا بکھرا انسان تھا جس کا چہرہ وحشت کا ترجمان تھا، آنکھیں سرخی میں ڈوبی تھیں اور ان روشن آنکھوں کے پیچھے گہرا کرب تھا اور ان کے نیچے گہرے حلقے تھے، اس کا دایاں بازو کہنی تک پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا اور اس کے ہونٹ خشک تھے۔

''میں نے یہ کب چاہا تھا دانیال؟ مجھے تو خود سمجھ نہیں آئی کہ یہ مجھے کیا ہو گیا تھا؟ کب میں نے یہ چاہا تھا؟ کب اس کی بربادی کی خواہش کی تھی؟ کب اس کی طلب نے مجھے اتنا بے خود کیا کہ میں صحیح اور غلط کا فرق ہی نہ جان سکا، دیکھو نا دانیال یہ مجھ سے کیا ہو گیا؟'' وہ بولتے بولتے تھک گیا اس کی سرخی بھری آنکھوں میں نمی تھی اور اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

''غلط...... بالکل غلط کہہ رہے ہو تم، کیوں قابو نہ کیا تم نے خود کو؟ کیوں ان سب نے تمہیں اتنا بڑا قدم اٹھانے دیا؟ کیوں تمہارا ساتھ دیا؟'' وہ اسے جھنجھوڑ کر کہہ رہا تھا۔

''دانیال پلیز......'' پیچھے سے حبیب کی آواز آئی، اس نے گردن موڑ کر دیکھا تو حبیب اندر داخل ہو رہا تھا، اپنے پیچھے وہ دروازہ بند کرنا نہیں بھولا تھا۔

''تمہیں یہاں میں نے اس لئے نہیں بلایا کہ تم سعد کو سیلف کنٹرول سکھاؤ، اگر تم مدد نہیں کر سکتے تو Condemn بھی مت کرو۔'' اس کا لہجہ روکھا اور سرد تھا۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے حبیب؟ مجھے غلط کیوں سمجھ رہے ہو؟'' اسے افسوس ہوا تھا۔

''تم دوست ہو، تمہارا کام ہے تم ساتھ دو، نا کہ صحیح غلط کا سبق پڑھاتے پھرو۔'' اس کا انداز مزید دوٹوک ہوا تھا۔

''میں دوست ہوں اسی لئے کہہ رہا ہوں کہ غلط کام میں ساتھ کیوں دوں؟'' اس مرتبہ دانیال بھی چیخ کر بولا تھا۔

''یہ...... یہ اس کو دیکھو۔'' حبیب نے سعد کا بازو پکڑ کر اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا، جو کہ پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔

''یہ مر رہا تھا، اس کے بغیر یہ مر جانا چاہتا تھا، اسے اپنا خون دے کر بچایا ہے میں نے، اس لئے اب تم اسے مارنے کی کوشش مت کرو۔'' حبیب نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگا کر کہا تھا، دانیال کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔

اب وہ دونوں کچھ دیر خاموش رہے، پھر حبیب اسے دھیمے انداز میں بتانے لگا کہ وہ چاہتے ہیں وہ سنیعہ کو کونس کرے، وہ اسے سمجھائے کہ اب مزید واویلے سے کیا حاصل جو

ہونا تھا تو وہ ہو چکا، یہ کام وہ دانیال سے اس لئے کروانا چاہتے تھے کہ سعیقہ نے اسے اس سارے تماشے کے دوران اپنے گھر میں نہیں دیکھا تھا، لازمی بات تھی کہ وہ اسے بے قصور ہی سمجھتی، اسی لئے اس نے خصوصی طور پر دانیال کو اسلام آباد سے بلایا تھا۔

کچھ دیر بعد دانیال، حبیب کے ساتھ اس کمرے میں گیا جہاں سعیقہ تھی اور اس کا چہرہ افسوس و شرمندگی سے سرخ پڑ گیا تھا، چند منٹ بعد ہی وہ واپس آ گیا اور آتے ہی برس پڑا۔

"یار! تم لوگ انسان ہو کہ جانور؟ حد ہو گئی کل سے اسے نیند کا انجکشن دے کر سلایا ہوا، اوپر سے اتنا سامان لدا ہوا اس پر۔" اس کا اشارہ جیولری کی طرف تھا کیونکہ سعیقہ تب سے اب تک مسلسل اسی طرح دلہن کے لباس میں تھی، دانیال کی بات پر تینوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"یہ کام تمہیں ہی کرنا ہو گا سعد۔" دانیال کا لہجہ مدھم تھا، سعد نے قدرے پریشانی سے ہونٹ کاٹے، ظاہر ہے گن پوائنٹ پر ہی سہی، مگر ان کا نکاح ہوا تھا اور وہ اس کا محرم تھا، وہ سست قدموں سے اس کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ بیڈ پر بکھری سی پڑی تھی، سینے تک اسے کمبل اوڑھا دیا گیا تھا، وہ دروازہ بند کرتا آہستہ آہستہ چلتا اس کے پاس آ گیا، بیڈ کے اک طرف اس کی ضرورت کی چیزوں کا ڈھیر لگا تھا، جو اس نے خود خریدا تھا، کتنا یقین تھا اسے کہ وہ اپنے اس مشن میں کامیاب ہو جائے گا، جبھی تو اس نے سعیقہ کے آنے سے پہلے ہی سب خرید لیا تھا۔

اس کے سرہانے بیٹھ کر وہ یک ٹک اس کا چہرہ دیکھتا رہا، اس کا معصوم چہرہ، آنسوؤں کے نشانات سے سجا چہرہ، اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے آہستہ سے ہاتھ بڑھایا اور اس کا ہاتھ تھام لیا، اس کا ہاتھ ٹھنڈا تھا، کسی بے جان کی مانند ٹھنڈا، اسے عجیب سی تکلیف ہوئی، اس نے بے ساختہ اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر رگڑا، جیسے اس میں زندگی کی حدت پھونکنا چاہتا ہو، اس کے ناخن بہت خوبصورت تھے اور ان پر سرخ رنگ کی نیل پینٹ لگی ہوئی تھی، وہ اس کے انگلیوں سے رنگز اتارنے لگا، پھر اس کی کلائیوں سے چوڑیاں، اس کے ماتھے سے بندیا اور جھومر پھر اس کے کانوں سے جھمکے اور آخر میں ان کی گردن کے نیکلس کی باری آئی، ساری جیولری اتار کر اس نے سائیڈ ٹیبل کے دراز میں ڈال دی اور پھر واپس نکال کر اس کا چہرہ صاف کرنے لگا، اس کا چہرہ اور گردن اچھی طرح صاف کرنے کے بعد اس نے اس کے دوپٹے پر لگی بے شمار سفیٹی پنز کھولنے لگا، اس معصوم کے بال برے طرح جکڑے ہوئے تھے جانے اسے کتنی تکلیف ہوئی ہو گی۔

اس کا دل خون ہوا تھا، یہ سنگھار اس کے نام کا نہیں تھا، اس نے یہ مانگ زبردستی اپنے نام کی بندیا سے سجائی تھی، یہ خوبصورت چہرہ اس کی ملکیت کب تھا اس نے یہ حق ملکیت ہتھیار کے زور پر حاصل کیا تھا، اس کا دل اتنا ڈوبا کہ وہ بے ساختہ اسے سینے میں چھپا کر سسک اٹھا، یہ کیا ہو گیا تھا اس سے؟ کمرہ بے بسی کی نمی سے نم تھا اور ہوا سرد خاموش تھی۔

☆☆☆

اس کی سعیقہ سے گفتگو کتنی ہی دیر جاری رہی تھی، وہ مکمل حواس میں تھی اور اس نے خود پر مکمل قابو پایا ہوا تھا، وہ یونیورسٹی کے زمانے والی سعیقہ دیکھائی دیتی تھی، مضبوط اعصاب اور ہر مشکل کے لئے تیار، اس نے دانیال کی بات خاموشی اور

تحمل سے سن رہی تھی جو کہ اسے سعد کی ابتر ذہنی حالت کی تفصیل بتا رہا تھا اور اسے سعد کے اس ایکشن کی ناکام صفائی دینے کی کوشش کر رہا تھا، اس نے دانیال کو نہیں ٹوکا، اسے پتا چل گیا تھا وہ تینوں دوست تھے، جیسے حبیب نے دوستی نبھائی تھی ویسے ہی وہ بھی دوستی نبھا رہا تھا، وہ واقعی صرف آپس میں دوست نکلے تھے۔

اس نے دانیال کی بات ختم ہونے پر صرف اس سے ایک سوال کیا تھا۔

''اگر میری جگہ تمہاری اکلوتی بہن ایمن کے ساتھ یہ ہوتا تو کیا تم اسے یوں سامنے بٹھا کر اپنے دوست کی جسٹی فیکشن دیتے؟'' اس کا انداز چبھتا ہوا سر د اور سخت تھا، دانیال کا رنگ زرد پڑا۔

سنیعہ نے نظریں پھیر لیں، اسے اپنا جواب مل چکا تھا اور جب دانیال واپس سعد اور حبیب کے پاس پہنچا تو اس نے لفظ لفظ ساری کہانی ان کے کانوں میں انڈیل دی، سعد کی آنکھوں میں اک عجیب کیفیت اتر آئی تھی۔

کچھ دیر مزید وہ تینوں آپس میں بات کرتے رہے، آخر کار وہ اسی بات پر متفق ہوئے تھے کہ اب صرف سعد کو ہی آگے بڑھ کر سنیعہ کو مطمئن کرنا پڑے گا، وہ قدرے مضطرب مگر خاموش تھا، حبیب اسے گلے مل کر ڈھیروں تسلیاں دے کر باہر نکلا تھا، مگر دانیال کو ایک ہی دکھ تھا کہ اس کا آنا بیکار گیا تھا، وہ ان کی کوئی مدد نہ کر سکا تھا، جس کا اسے گہرا افسوس تھا۔

☆☆☆

سنیعہ کی شادی کی خبر جس دن اسے ملی وہ پہلا دن تھا جب اس کے دل کو دھکا سا لگا تھا، اس نے ایسا کب سوچا تھا کہ اس کا تلاش گمشدہ والا منگیتر سچ میں واپس لوٹ آئے گا اور یوں یکا یک اس کی شادی بھی فکس ہو جائے گی۔

اس رات وہ سو نہ سکا، ساری رات اس کی راکنگ چیئر جھولتی رہی، اسے وہ ہمیشہ سے پسند کرتا تھا، مگر آج سے پہلے تو اسے یہی لگتا رہا تھا کہ وہ ایک اچھے دوست کی حیثیت سے پسند کرتا تھا، مگر اسے اس دن احساس ہوا تھا کہ وہ دوستی سے آگے جا چکا تھا، مگر تبھی اس نے سوچا کہ اس کا ضمیر اسے اجازت دے گا کہ وہ ایک ایسی لڑکی کے بارے میں سوچ جو عنقریب کسی اور کی ہونے والی تھی؟

پتہ نہیں ضمیر اجازت دیتا تھا یا نہیں مگر وہ اس کے بارے میں سوچ رہا اور رات گہری ہوتی گئی، اس کی سوچوں کی طرح عمیق اور گہری، وہ سوچتا رہا کیا ممکن تھا وہ اس کی ہو جاتی؟

اگلی سحر اس کی آنکھیں سرخ اور اداس تھیں، وہ ٹوٹ رہا تھا، حالانکہ وہ کتنا مضبوط تھا، کتنا مشکل تھا کوئی اس پر اثر انداز ہو پاتا، اگلا دن بیتا اور اداس شام در آئی اور پہلے سے زیادہ خوفزدہ ہو گیا، اسے اپنے جذبوں کی شدت اور بے لگامی سے خوف آنے لگا تھا۔

آہ! یہ محبت!! کس قدر ظالم ہوتی ہے، کسی کو اپنے دل میں بسانے سے پہلے کیسے خود کو توڑنا پڑتا ہے، اپنے دل کا دربار ڈھا کر اس ذی نفس کے لئے دوبارہ سجانا پڑتا ہے، جیسے اسے کرنا پڑا تھا، اگلی شب پھر جاگتے گزری، اس کا چہرہ اترتا گیا، اس کے دل کا دربار ڈھے گیا، وہ اس کے رنگوں میں نہا گیا، وہ ہار گیا، وہ ایک مرد تھا اور جب ایک مرد ہارتا ہے تو تسلیں ہار جاتی ہیں، اسے نہیں ہارنا چاہیے تھا، مگر وہ ہار گیا۔

اور جب یہ احساس اس کے اندر جاگزیں ہو گیا کہ وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تو یہ خوفناک سوال سامنے آ کھڑا ہو گیا تھا کہ اب وہ کیا کر سکتا تھا صرف چند دن بعد سنیعہ کی شادی تھی اور اگلے

دن اس نے سب کو کارڈ دینے کے لئے بلایا ہوا تھا۔

وہ اس رات بھی جاگتا رہا، اس سے ملنے کی آس خوبصورت سہی مگر وہ خوفزدہ تھا وہ اس سے اپنی دیوانگی کیونکر چھپا پائے گا، اگلی سحر جب حبیب اسے لینے آیا تو ششدر رہ گیا تھا، وہ اس کی حالت کی وجہ جاننے پر مصر تھا، سعد اسے ٹالتا رہا۔

مگر وہ بھی اس کا دوست تھا جان چھوڑنے والوں میں سے کب تھا؟ رات کو اس کے ساتھ ہی واپس آیا تھا اور سیدھا اس کے کمرے میں گھس گیا اور بات تقریباً ہاتھا پائی تک جا پہنچی تھی، سعد کسی صورت راز اگلنے کو تیار نہ تھا جبکہ حبیب ہر صورت اگلوانے پر تلا ہوا تھا، خوش قسمتی سے سعد کے پیرنٹس گھر پر نہ تھے، جبھی وہ اس تماشے سے آگاہ نہ ہو سکے۔

اگلی رات حبیب کو اس کا فون رات بارہ بجے آیا تھا، حبیب جو ابھی لیپ ٹاپ بند کر کے اٹھا تھا، اس کی کال دیکھ کر فوراً پک کر لی۔

''سعد!'' اس نے فون اٹھاتے ہی کہا، دوسری طرف اس کی آواز بڑی مدھم اور تکلیف دہ تھی۔

''حبیب! تم...... جاننا چاہتے تھے ناکہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ تمہیں بہت فکر تھی نا میری، میں تمہیں بتاؤں مجھے کیا ہوا ہے؟'' اس کی آواز گھٹی ہوئی تھی وہ بولتا چلا گیا۔

''مجھے سنعیہ سے عشق ہو گیا ہے اور میں اس کے بغیر مر رہا ہوں، اس پل پل کی اذیت سے نجات پانے جا رہا ہوں میں اب اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی اور حبیب تو یوں تھا جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہ ہو۔''

''میں اب اس دنیا میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا، حبیب میری چند آخری سانسیں باقی ہیں میں شاید آپ اس دنیا میں نہ رہوں۔'' وہ اب آنسوؤں سے رو رہا تھا، حبیب کے پیروں کے نیچے سے جیسے زمین نکل گئی تھی، اس کے دل کو جیسے کسی نے خنجر سے دو ٹکڑے کر دیا تھا، وہ پوری رفتار سے بھاگتا ہوا اپنی گاڑی تک آیا اور اس رات اس نے اپنی زندگی کی خوفناک ڈرائیونگ کی تھی، اس کے گھر سے سعد کے گھر کا فاصلہ پندرہ منٹ کا تھا جو اس رات اس نے چار منٹ میں طے کیا تھا اور گاڑی سے اتر کر بنا دروازہ بند کیے وہ اسی طرح بھاگتا ہوا سعد کے کمرے کی طرف آیا تھا، وہ لاکڈ تھا، اس نے اتنی وحشت سے دروازے کو ٹھوکر ماری کہ وہ پہلی بار میں ہی ٹوٹ گیا، وہ اندر داخل ہوا تو سعد اس کے سامنے تھا، وہ کارپٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کی دائیں کلائی خون سے بھری ہوئی تھی اور اس کی آنکھیں بند تھیں، وہ زندگی اور موت کی سرحد پر کھڑا تھا، چند سانسیں باقی تھیں شاید، گنتی کی چند سانسیں اور بس، وہ اڑتا ہوا اس تک آیا اور اِدھر اُدھر کسی چیز کی تلاش میں نظریں دوڑائیں تھیں مگر پھر اس نے اگلے ہی لمحے شرٹ اتاری اور اس کے بازو کو سختی سے باندھا، اسے اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور واپس گاڑی کی طرف آیا اور چند لمحوں کے بعد اس کی گاڑی ہاسپٹل کے گیٹ پر رک رہی تھی، وہ جانتا تھا یہ پولیس کیس تھا، ہاسپٹل انتظامیہ کسی صورت اسے ایڈمٹ نہ کرے گی مگر وہ اس کا انتظام بھی کر سکتا تھا اور اس کے لئے اسے صرف چند فون کرنے پڑے تھے۔

ان کا بلڈ گروپ میچ کرتا تھا، بلڈ کی ضرورت پڑی تو اس نے اپنے دونوں بازو آگے کر دیئے، حبیب عارف نے اس رات سعد میر کو بچا لیا تھا۔

یہ بات اس کے سامنے بعد میں آئی تھی کہ

سعد کے پیرنٹس لندن گئے ہوئے جہاں ان کی اکلوتی بیٹی بیاہی ہوئی تھی اور اس رات وہ گھر میں بالکل اکیلا تھا، بلکہ پچھلے کئی دن سے وہ تنہا ہی تھا ورنہ اس کی حالت پر لازمی سوالات کیے جاتے، اگلے دن اسے ڈسچارج کر دیا گیا، وہ حبیب سے بہت خفا تھا، وہ اس سے بات نہیں کرتا تھا مگر جب حبیب اپنی نگرانی میں اس کی بینڈیج چینج کرتا تو وہ بس چپ رہتا تھا، جب حبیب اس کے لئے سوپ لے کر آتا تو وہ منہ دوسری طرف کر لیتا اور جب وہ زبردستی اسے پلاتا تو وہ پی لیتا تھا، ہاں وہ اس سے بہت ناراض تھا، بھلا کیوں بچایا تھا اس نے اسے؟

وہ دلگرفتی سے سوچتا رہتا، دو دن تک حبیب اس کا سایہ بنا رہا تھا، وہ اسے اک پل کے لئے تنہا چھوڑنے کو تیار نہ تھا اور تیسرے دن جبکہ سنیعہ کی مہندی کا فنکشن تھا، حبیب کی سربراہی میں وہ سات لوگوں کا گروپ تھا جس میں پانچ لوگ یونیورسٹی کے وہ نامی گرامی بدمعاش تھے جن کی بات گولی اور گالی سے شروع ہوتی تھی اور جن کے پاس اسلحہ میٹھی گولیوں کی مانند ہوتا تھا اور ان میں سے دو کے ساتھ حبیب کی اچھی خاصی علیک سلیک تھی اور وہ دو باقی تینوں کو لے کر آئے تھے اور وہ اپنے دوست حبیب کے دوست (سعد) کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار تھے۔

ادھر وہ اپنے ہاتھوں پہ مہندی لگا رہی تھی اور دوسری طرف وہ اس کے گھر کی لوکیشن ڈسکس کر رہے تھے۔

طے یہ پایا تھا کہ دو لوگ فرنٹ سنبھالیں گے، تین لوگ اندر والا پورشن اور حبیب اور سعد نکاح خواں کو دیکھیں گے، غالب امکان یہی تھا کہ سیکورٹی کا بندوبست نہ ہونے کے برابر تھا اور وہ ویسے بھی شادی میں شرکت کے لئے پوری طرح تیار ہو کر جا رہے تھے، سب کچھ عین اس کی مرضی کے مطابق ہوا تھا، کہیں کوئی رکاوٹ نہ بنی تھی اور یوں وہ نکاح کر کے بحفاظت اسے اپنے سیالکوٹ والے گھر لے آیا تھا، مگر اب اگلا مرحلہ درپیش تھا جو اب تک کے تمام مراحل سے زیادہ سخت اور مشکل تھا۔

☆☆☆

خواب کرچی ہوئے سب اپنے
کیسے آنکھوں میں بس گئے پتھر

وہ اندر داخل ہوا تو بہت کچھ سوچ کر آیا تھا، یہ جگہ محفوظ تھی، وہ آگاہ تھا، اس کے اس ٹھکانے کا حبیب اور دانیال کے علاوہ کسی کو نہیں پتا تھا، ممی پاپا کا واپس آنے کا فی الحال کوئی موڈ نہ تھا، سو وہ محفوظ تھا، مگر پھر بھی احتیاطی تدابیر کے طور پر اس نے اپنی نارمل استعمال میں آنے والی گاڑی چھوڑ کر دوسری گاڑی استعمال کی تھی اور اپنی سم کو بند کر کے اک نیا نمبر لیا تھا۔

اب وہ اندر داخل ہوا تو وہ کمرے میں کہیں نہیں تھی اور باتھ روم سے شاور کی آواز آ رہی تھی، اس نے ایک طویل سانس لے کر دروازہ لاک کر دیا، پھر تسلی سے بیڈ پر آن بیٹھا۔

کمرہ غیر معمولی طور پر سمٹا ہوا تھا ہر چیز ٹھکانے پر تھی، اسے حیرت ہوئی، وہ کچھ سوچتا ہوا بیڈ پر نیم دراز ہو گیا، کچھ دیر بعد باتھ کا دروازہ کھلا اور وہ باہر آئی، سعد کی نظریں اس پر جم گئیں وہ اس کے خریدے گئے ڈریس میں ملبوس تھی اور یہ خریدتے وقت اس نے واقعی نہیں سوچا تھا کہ اس قدر سجے گا اس پر، اک لمحے کے لئے وہ اس پر سے نظر نہیں ہٹا سکا، اس کے بال گیلی لٹوں کی شکل میں اس کے کندھوں پر گرے ہوئے تھے، ان کی کٹنگ بدلی ہوئی تھی اور ان کا کلر بھی مختلف تھا شاید اس نے بال ڈائی کیے تھے، وہ بھی اسے دیکھ

چکی تھی، مگر نظر انداز کر کے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی، دو منٹ میں بال سنوارے اور واپس مڑی پھر اسے دیکھے بغیر بولی۔

"کچن میں جا رہی ہوں۔" اور دروازے کا لاک کھولتی باہر نکل گئی، وہ حیران سا بیٹھا رہ گیا، یہ ری ایکشن؟ اس کا تو خیال تھا کہ وہ ہنگامہ مچا دے گی، روئے گی، چیخے گی، اس سے لڑے گی، اس سے التجا کرے گی کہ وہ اس کے ماں باپ سے رابطہ کروا دے، اس کو واپس چھوڑ آئے، وہ تو یہ سب سوچ بیٹھا تھا اور اس کا خیال ٹھیک ہی تو تھا، اس قسم کے کیسز میں ایسا ہی تو ہوتا ہے۔

مگر اس نے ایسا کچھ نہ کیا تھا، وہ کتنی پرسکون دکھائی دیتی تھی، کیوں؟ وہ جھنجھلا کر اٹھا اور اس کے پیچھے بڑھا تھا۔

وہ کچن میں گیا تو وہ بڑے سکون سے کچن ٹیبل کے گرد چیئر پر بیٹھی جوس کا گلاس سامنے رکھے ہوئے تھی، وہ وہیں کھڑا رہ گیا، وہ جوس کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہی تھی، پھر ایک دم اسے پتا نہیں کیا ہوا اس نے ایک دم گلاس اٹھایا اور پوری قوت سے سامنے دیوار پر دے مارا، گلاس ٹوٹ گیا اور جوس دیوار پر نقش و نگار بناتا نیچے بہہ گیا اور وہ ٹیبل پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، بلند آواز میں، سسکتے، بلکتے، روتے اور کرلاتے، اس کے لبوں پر ایک ہی نام تھا۔

"امی...... امی۔" سعد کا دل اک لمحے کو رک گیا، وہ آگے بڑھا پھر رکا اور پھر واپس پلٹ گیا۔

اچھا ہی تھا وہ رو لیتی، اس کا دل ہلکا ہو جاتا، ورنہ اسے دیکھ کر یقیناً وہ مزید ہسٹریک ہوتی، اس لئے اس نے واپس آنا مناسب سمجھا، وہ لاؤنج کے صوفے پر بیٹھ گیا، اس کے زخمی بازو میں ایک دم شدید درد ہونے لگا تھا، اسے احساس تھا اس نے سنعیہ کی زندگی کے ساتھ بہت بے رحم مذاق کیا تھا اور اسے یہ بھی بہت اچھی طرح پتہ تھا کہ اس نے اک معصوم لڑکی سے اس کے خواب چھین لئے تھے، اس کی آنکھیں ویران کر دی تھیں اس کا دل بنجر اور اس کی زندگی برباد۔

آہ! یہ کیا ہو گیا اس سے؟

اس کی آنکھیں جل رہی تھیں، کتنا بے رحم ہوتا ہے انسان، اپنا دل آباد کرنے کے لئے دوسروں کے دل اجاڑ دیتا ہے، اپنا وجود بچانے کے لئے دوسروں کو مار دیتا ہے۔

اسے اندازہ تھا کہ اتنی آسانی سے وہ دونوں نارمل نہیں ہو سکیں گے، وہ وہیں بیٹھا سوچتا رہا۔

وہ اتنا ظالم نہیں تھا، اس نے کبھی کسی کے ساتھ ظلم نہیں کیا تھا، اس نے تو کبھی چڑیا کا بچہ تک نہیں مارا تھا، کبھی کسی کا دل نہ دکھایا تھا، کبھی جھوٹ نہ بولا تھا، کبھی کسی کا حق نہ مارا تھا، کبھی چوری نہ کی تھی، وہ اخلاقی برائیوں سے کوسوں دور تھا، اس کے ماں باپ کی تربیت بہت بہترین تھی، جب سب کچھ اتنا بہترین تھا تو کمی کہاں رہ گئی تھی۔

ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کمی رہ جاتی ہے، کہیں نہ کہیں کمی کیوں رہ جاتی ہے انسان میں، بظاہر اس قدر مکمل تربیت کے باوجود انسان اس طرح کا قدم کیوں اٹھا لیتا ہے کہ نسلوں کی تربیت کو رسوا کر دیتا ہے؟

وہ اسی طرح بیٹھا رہا، جانے کتنی دیر گزری کہ اسے لاؤنج میں سنعیہ کی موجودگی کا احساس ہوا، وہ صوفے کی بیک پر کھڑی اسے یک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔

اور زندگی میں پہلی بار وہ ہچکچایا، جھجکا اور نظر چرا گیا، اس کا نظر چرانا قیامت ہو گیا، اس نے

سعنیہ کی بے تاب سسکیاں سنیں اور پھر وہ بھاگتی ہوئی اس کمرے کی طرف چلی گئی، دھاڑ کے ساتھ دروازہ بند ہوا اور کمرا اس کی چیخوں اور آنسوؤں میں ڈوب گیا۔

اس کے دل کو کچھ ہوا تھا، وہ تیزی سے اٹھا اور اس کے پیچھے کمرے کے دروازے تک آیا تھا، اس نے آہستگی سے دروازہ کھولنا چاہا مگر وہ لاکڈ تھا، وہ دروازہ بجانے لگا۔

''سعنیہ...... سعنیہ...... دروازہ کھولو...... سونی...... پلیز۔'' اس کا انتظار التجائیہ تھا، وہ مسلسل دروازہ پیٹ رہا تھا، دوسری طرف صرف اس کی سسکیوں کی آواز تھی۔

''سونی پلیز۔'' اس کی آواز بے بسی سے پر تھی، پھر وہ تھکے ہوئے انداز میں زمین پر گر سا گیا۔

اب وہ دونوں دروازے سے سر ٹکائے رو رہے تھے، فرق صرف اتنا تھا کہ وہ اندر تھی اور دروازے کے اس پار!!

☆☆☆

کیا تمہیں میرا چہرہ یاد ہے؟
کیا تمہارے پاس میرا چہرہ موجود ہے؟
مجھے اپنا چہرہ بھول گیا ہے
یا شاید......
میں اپنا چہرہ کھو بیٹھا ہوں
میرا چہرہ ایسا نہیں تھا
میرا چہرہ مکمل تھا
خوبصورت تھا
مگر اب وہاں کچھ نہیں
صرف ویران، بے خواب اور بنجر آنکھیں
جلی ہوئی پیشانی
رسوائی سے بھرے ہونٹ
اور آنسوؤں سے بوجھل پلکیں!!
یہ میرا چہرہ ہے!!!
مگر یہ میرا چہرہ نہیں ہے

وہ ساری رات وہیں بیٹھا رہا تھا، اگلی صبح سعنیہ نے دروازہ کھولا تو اسے دیکھ کر چونک گئی، دونوں کا حال ایک جیسا ہی تھا، رات بھر کی جاگی متورم اور سوجی آنکھیں، آنسوؤں کے نشانات سے بھرا چہرہ اور سرخ ہونٹ اور ناک اور سعنیہ اسے دیکھ کر ایک بار پھر ششدر رہ گئی، یہ کیا کر لیا تھا اس نے خود کو؟ یہ وہ سعد میر کب تھا جس کے ساتھ اس نے یونیورسٹی کے چار سال گزارے تھے، بے شمار قہقہے لگائے تھے، ان گنت محفلیں سجائی تھیں، ٹورز کیے تھے، کھانے کھائے تھے، یہ تو پتا نہیں کون سا سعد تھا، جسے وہ آج پہلی بار مل رہی تھی، اسے وقتی طور پر یہ بھول گیا کہ وہ اس کا کتنا عظیم نقصان کر چکا تھا، اس کے دل پر ہمدردی غالب آ گئی، وہ بے ساختہ اس کے ساتھ زمین پر بیٹھ گئی۔

اس نے آہستہ سے میر کے چہرے کو چھوا، اس کی آنکھوں پہ سعنیہ کی انگلیاں ذرا سی کیا لگیں وہ آنکھیں جھیلوں کی مانند بہنے لگیں، اس نے سعد کے گال پہ ہاتھ رکھا اور سسک اٹھی۔

''یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے سعد؟ یہ...... یہ تم نے خود کو کیا کر لیا ہے؟'' سعد کو اس مسیحائی کی توقع کب تھی، اس نے بے تابی سے سعنیہ کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور اپنے ہونٹوں سے لگا کر والہانہ انداز میں آنکھوں سے لگانے لگا۔

''سونی...... مجھے معاف کر دو......سونی میں مر جاتا تمہارے بغیر، میری حالت دیکھو سونی، مجھ پر ترس کھاؤ، پلیز۔'' وہ اس کو التجائیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں نمی تھی سعنیہ زور زور سے رونے لگی، سعد نے اک لمحے کو کچھ سوچا اور پھر بے ساختہ دونوں بازو اس کے گرد لپیٹ

دیئے، اب وہ دونوں رو رہے تھے۔

☆☆☆

اس کی آنکھیں کھلیں تو کمرہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، کمرے میں ہلکی سی خنکی تھی اس نے کروٹ لی تو چونک گیا، وہ اس کے ساتھ ہی موجود تھی، گہری نیند میں گم، ہاتھ گال کے نیچے دھرے، اس کی طرف کروٹ لئے دونوں ٹانگیں اکٹھی کر کے پیٹ سے لگائے، کسی معصوم بچے کی مانند سو رہی تھی۔

شاید اسے بھی سردی لگ رہی تھی، اس نے پیروں میں پڑی چادر اٹھائی اور اسے اوڑھا دی اور تھوڑی سی اپنے اوپر بھی ڈال دی اور سیدھا لیٹ گیا۔

اس کی آنکھوں میں شدید جلن ہو رہی تھی اور وہ سوجی ہوئیں تھیں، اسے یاد آیا کہ وہ اس سے لپٹ کر روتی بار بار ایک ہی سوال کر رہی تھی۔

''سعد! بتاؤ ناں میرا کیا قصور تھا؟ مجھے کس چیز کی سزا دی تم نے؟'' اور چونکہ سعد کے پاس ان سوالات کے جوابات نہ تھے اس لئے وہ خاموشی سے اس کے بال سہلاتا رہا اور جب نڈھال ہوگئی تو اس نے اسے بازوؤں میں اٹھایا اور کمرے کے اندر لے آیا، بیڈ پہ اسے لیٹا کر وہ بھی ادھر ہی لیٹ گیا، وہ آہستہ آہستہ غنودگی سے گہری نیند میں جا رہی تھی وہ اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتا رہا، کچھ دیر بعد وہ سوگئی۔

اور وہ بھی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سو گیا، وہ اس قدر تھکا ہوا تھا کہا سے فوراً ہی نیند آ گئی۔

اسے ایک دم وایبریشن کا احساس ہوا، یہ اس کا موبائل تھا جس پر حبیب کے میسج آ رہے تھے۔

''کدھر ہو تم؟'' حبیب کا سوال تھا۔

وہ فون سائلنٹ پر لگا کر جواب لکھنے لگا۔

''سو رہا تھا؟''

''اس وقت؟ خیریت؟'' حبیب کو تشویش ہوئی۔

''ہاں رات سو نہیں سکا۔''

''کیوں؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں......بس جاگتا رہا۔''

''سعیہ کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہے۔''

''کدھر ہے وہ؟''

''وہ بھی سو رہی ہے۔''

''کوئی بات ہوئی اس سے؟''

''ہاں۔''

''کیا؟''

''کچھ خاص نہیں بس روتی رہی۔''

''پھر؟''

''میں نے سنبھال لیا۔''

''پھر؟''

''سلا دیا۔''

''پھر؟''

''کیا پھر؟'' اب کے اسے غصہ آیا۔

''تم نے کیا کہا؟''

''کچھ کہنے والا کام کیا ہے میں نے؟'' اس کا انداز اذیت بھرا ہوا۔

''پھر بھی؟''

''روتا رہا ہوں بس۔'' اس نے اعتراف کیا۔

''شٹ۔'' حبیب کو اس کا رونا پسند نہ آیا۔

''اس کے سامنے روئے؟''

''ظاہر ہے۔''

''شرم نہیں آئی؟'' اس نے تاؤ دلایا۔

''نہیں...... بلکہ شرمندگی ہوئی تھی۔''

''کچھ بولی وہ آگے سے؟''

''نہیں......سوال کرتی رہی۔''

''کیسے سوال؟''

''اندازہ کرلو خود ہی، یہی کہ میں نے یہ ظلم کیوں کیا؟''

''اوہ......پھر؟''

''پتہ نہیں یار......مگر ایک بات کہوں؟''

''کیا؟''

''مجھ سے اس کا یہ حال دیکھا نہیں جا رہا۔''

''صبر کرو یار اب، اتنا بڑا معرکہ مارا ہے اس کے آفٹر ایفیکٹس تو ہوں گے نا۔'' حبیب نے حوصلہ دیا۔

''پچھتاوا شروع ہو گیا میرا۔'' اس کے لہجے میں درد تھا۔

''اوں ہوں، اداس مت ہو۔''

''تو کیا کروں؟''

''محنت کی ہے اب پھل کھاؤ۔'' وہ ہنس دیا تھا۔

''دفع ہو جاؤ۔'' اسے برا لگا۔

''او کے۔'' وہ واقعی دفع ہو گیا، بیسٹ فرینڈ کا فائدہ، ہر موڈ کو سمجھتا تھا۔

سعد نے ایک طویل سانس لے کر فون ایک طرف ڈال دیا اور دوبارہ سے اسے دیکھنے لگا، وہ ابھی تک سو رہی تھی۔

اور اسے یوں دیکھنا کتنا دلکش اور خوشنما نظارہ تھا، اس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی، وہ کتنی پیاری لگ رہی تھی یوں سوچتے ہوئے کہ سعد بس اسے دیکھتا جا رہا تھا، حبیب صحیح کہہ رہا تھا اسے اس پل اس سے اتفاق ہوا تھا۔

☆☆☆

سعد میر اپنی من مرضی کرتے ہوئے صرف ایک بات بھول گیا تھا وہ یہ کہ سعدیہ مبشر کی سب سے بڑی خامی اس کی ضد تھی۔

ضد جو ہر رشتے کی خوبصورتی گہنا دیتی ہے، ضد جو انسان کو غلط ہونے کے باوجود غلطی تسلیم کرنے نہیں دیتی اور اپنے غلط ہونے پر ہی ڈٹ جانے پر مجبور کر دیتی ہے۔

اور پچھلے گیارہ دن سے وہ مسلسل اس کی ضد کو بھگت رہا تھا، وہ اپنی ضد پر اتر آئی ہوئی تھی، دل کرتا تو کمرے میں باہر آتی ورنہ پورے دن کے لئے کمرہ بند، وہ دروازہ بجاتا رہتا، دل کرتا تو اس کے منتیں کرنے پہ دو نوالے لیتی ورنہ منہ بند کر کے اک طرف پڑی رہتی اس کے لاکھ منانے پر، درخواستیں کرنے پر بھی اس کی بات سننے پر آمادہ نہ ہوتی اور اس کی یہ ضد اس کی صحت پر بری طرح اثر انداز ہو رہی تھی وہ بے خبر نہ تھی بس وہ اس کو اسی طرح ذلیل کرنا چاہتی تھی شاید۔

شروع دنوں میں ایسا بھی ہوا کہ اس نے بڑے تحمل سے سعد سے اس کے اس فعل کی وضاحت بڑے آرام سے مانگی تھی، وہ بزنس پڑھی ہوئی تھی، ہر بات لوجک اور ریزن کے ساتھ کرتی تھی، نہیں جانتی تھی کہ وہ پگلا وہ جھلا جس جال میں پھنس چکا تھا وہاں لوجک اور ریزن کا کیا کام؟

جس آگ میں وہ جل رہا تھا وہ تو گھر کے گھر خاک کر دیتی، کہاں اس چیز کا دھیان کہ اس نے اک لڑکی کی شادی ختم کروا دی تھی، تھی نا وہ پاگل؟

مگر اس ضد کا انجام یہ ہوا کہ ایک ایک کر کے اس نے گھر کے تمام کمروں کے لاک خراب کر دیے، اب کم از کم وہ کمرہ بند نہیں ہو سکتی تھی، مگر اس کے اس عمل کے بعد وہ اسے کھانے کے معاملے میں پہلے سے بھی زیادہ تنگ کرنے لگی، یہاں تک کہ دوسرے ہفتے اس کا ضبط ٹوٹ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

گیا۔

وہ سعد میر بھی اپنی ضد پہ اتر آیا اور یہ بہت بڑا نقصان تھا۔

"ایک ضدی دوسرے ضدی کے مقابل آ جائے تو دونوں ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں گے۔"

نقصان دونوں کا ہی ہونا تھا، اس نے اپنی ضد سے سعد میر کی ضد کو جگا دیا تھا اور اب بھگتان اسے ہی بھگتنا تھا۔

☆☆☆

صبح وہ جاگا تو سعیہ کہیں نہیں تھی، اس کا سر گھوم گیا اس کی تلاش میں باہر آیا تو وہ لاؤنج کے صوفے پہ بے ترتیب سی پڑی تھی، وہ طویل سانس بھرتا اس کے پاس آ بیٹھا۔

"ناشتہ کیا؟" اس نے نرمی سے سوال کیا، جواب ندارد۔

"سعیہ...... سونی!" اس نے پیار سے بلایا، کوئی جواب نہ تھا، اب کی بار اس نے نرمی سے بازو پہ ہاتھ رکھا، وہ کرنٹ کھا کر دور ہوئی، سعد بے حد محظوظ ہوا۔

اس نے ایک بار ہاتھ آگے کیا تو سعیہ نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا، وہ اٹھ لئے بغیر اٹھ کر اس کے مقابل آیا، ہلکا سا جھک کر اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑے اور کچھ مزید جھک کر اس کی مذاحمت کو صاف نظر انداز کرتے ہوئے اس کی پیشانی کو چوما اور اسے چھوڑ کر سیدھا ہو گیا، وہ تڑپ کے پیچھے ہٹی تھی، وہ مسکراتا ہوا شاور لینے چلا گیا۔

اب اس کے ہاتھ اک نیا پتہ لگ گیا تھا، تڑپ کا پتہ، وہ اس سے بھاگتی تھی، اس سے بچتی تھی، یہ اس نے پہلے کبھی نوٹس ہی نہ کیا تھا، اب تو وہ اسے بڑے آرام سے اپنی ہر بات منوا سکتا تھا۔

"ان دونوں کو ادھر ہی چھوڑ کر ہم دوبارہ واپس سعیہ مبشر کے گھر چلتے ہیں، وہاں کا جائزہ لیتے ہیں، ادھر کیا گزری؟"

☆☆☆

وہ تھپڑ کھا کر وشمہ کریم کے آگے ایک دفعہ دنیا گھوم گئی تھی، اسے احساس ہوا تھا کہ جسے وہ اپنے من مندر کا دیوتا مان کر مان سمان دیتی آ رہی تھی وہ تو اتنا کم ظرف اور گرا ہوا نکلا تھا کہ اپنے ایک غلط فعل کو کرنے کے لئے ہر صورت اسے راستے سے ہٹانے پر تیار تھا، وہ تو سعیہ کو نکاح کر کے لے گیا مگر وشمہ کریم کے مستقبل کے آگے ایک مستقل سوالیہ نشان لگا گیا، حبیب نے اس کا پورا ساتھ دیا تھا، کیوں؟

اس نے روتے چلاتے ہوئے سعیہ کے ماما پاپا کو ساری ڈیٹیل بتائی تھی کہ وہ سب یونیورسٹی بوائز تھے اور یہاں تک کہ اس نے سعد کے گھر کا ایڈریس بھی بتا دیا تھا، اس کے گھر کا نمبر، اس کا نمبر بھی، سب بتا دیا تھا، حبیب کو بھی کہاں چھوڑا تھا، اس کے متعلق بھی سب راز عیاں کر دیئے۔

یہ ایک سراسر اغواء اور نکاح بالجبر کا کیس تھا، شادی کا گھر ماتم کدہ بن گیا، اس کی ماما ماجدہ مبشر کو مسلسل غشی کے دورے پڑ رہے تھے اوپر سے آس پڑوس کا خوف، رشتے داروں کی باتیں اور طنزیہ سرگوشیاں۔

ان کے گھر کبھی وہ لوگ نہ آئے تھے اس لئے بائے فیس وہ کسی کو نہ پہچان سکے مگر ان کے ناموں سے وہ آگاہ تھے اور باقی تفصیل جب وشمہ نے دے دی تو مبشر حیات نے بروقت اپنے حواس بحال رکھتے ہوئے اپنے کچھ دوستوں کو فون کیے، بات اب چھپانے والی رہی ہی کہاں تھی، جب عین نکاح کے وقت ان کی عزت کی

دھجیاں اڑ گئیں تو اب رہی سہی عزت بچا کر وہ کیا کرتے، اس لئے انہوں نے مکمل تفصیل بتائی تھی، پولیس آفیسر ان کے عزیزوں میں سے تھا ورنہ انہیں نجانے کتنے سوالات کے جوابات دینا پڑتے، مگر اس کے باوجود بھی انہیں جواب دینا پڑا تھا، پولیس آفیسر یہ یقین دہانی چاہتے تھے کہ وہ سعدیہ کی کوئی پرسنل انوالومنٹ نہ تھی، اگر بعد میں نکلی تو وہ کچھ نہ کر پائیں گے، اس کا یقین تو ماجدہ مبشر کو تھا کہ ان کی بیٹی قطعاً ایسے کسی لڑکے کے ساتھ انوالو نہیں ہو سکتی تھی مگر مبشر حیات فکر مند تھے، وہ ماں تھیں، ہمیشہ بیٹی کے متعلق اچھا ہی سوچتیں مگر حقائق سے نظر نہیں چرائی جا سکتی تھی، اپنے اس شبے کو دور کرنے کے لئے انہوں نے وشمہ کو بلایا تھا اور اس سے سوال کیا تھا کہ کہیں خدا نخواستہ سعدیہ کی تو اس لڑکے کے ساتھ؟ مگر وشمہ نے سختی سے ان کے خدشے کی تردید کی تھی اور اس نے قسم کھا کر انہیں بتایا تھا کہ یہ سب کیا دھرا سعد اور حبیب کا تھا اور سعدیہ معصوم ایک پرسنٹ بھی انوالو نہ تھی، وشمہ کے اتنے یقین سے کہنے پر ان کا دل مضبوط ہوا تھا، خدا کا شکر تھا کم از کم ان کی بیٹی تو بے قصور تھی۔

سعد کے گھر پولیس ریڈ بے کار گیا تھا کیونکہ وہاں سوائے چوکیدار اور ملازموں کے سوا کوئی نہ تھا، دوسری طرف حبیب ملک سے نکل چکا تھا اور اس کے گھر والے اس معاملے سے قطعاً بے خبر تھے، ان کے لئے یہ بہت بڑا دھچکا تھا، شاید انہیں یقین بھی نہ آتا جو مبشر حیات کے پاس وہ ویڈیو موجود نہ ہوتی۔

ویڈیو؟

شادی کی تقریب میں آنے والا ہر فرد موبائل لازماً ساتھ لاتا ہے، اب وہ روایتی کیمرہ لے کے آنے کا رواج تو ختم ہوتا جا رہا ہے اور فلمی سین جیسے گن پوائنٹ پر ہونے والے اس نکاح کو وہاں برائیڈل روم میں ایک لڑکی نے بڑی خاموشی سے مووی میں قید کر لیا تھا۔

اور اس ویڈیو میں وشمہ کو تھپڑ پڑنے سے لے کر نکاح تک اور بعد میں جب سعد نے اسے بازوؤں میں اٹھایا اور حبیب گن لے کر چوکنے انداز میں اس کے پیچھے تھا سارا سین بڑے نمایاں انداز میں کیچ کیا گیا تھا۔

اور جب یہی ویڈیو مبشر حیات نے حبیب عارف کے والدین کو دکھائی تو اس کی والدہ کا چہرہ یوں تھا جیسے انہیں ابھی اٹیک ہو جائے گا، یہ ہتھیار تھامے دھاڑتا ہوا لڑکا ان کا بیٹا تو نہیں تھا، وہ تو اتنا ٹھنڈا مزاج تھا کہ گھر میں کبھی اس کی بلند آواز بھی نہ سنی تھی کسی نے اور اب؟ اور وہ دوسرا لڑکا، جس کی آنکھیں بری طرح لال تھیں اور جس کے بازو پر بینڈیج تھی، اس لڑکے کو تو وہ بڑی اچھی طرح جانتی تھیں، یہ تو بڑا مودب اور ہنس مکھ سا لڑکا تھا ان کے حبیب کا دوست تھا اکثر وہ گھر بھی آیا کرتا تھا، انہیں تو کبھی لگا ہی نہیں تھا کہ ان کے بیٹے کی دوستی ایسے لوگوں کے ساتھ تھی جو کہ دوسروں کی عزتوں پر ہاتھ ڈالتے پھرتے تھے۔

بدقسمتی سے باقی لڑکوں کو کوئی شناخت نہ کر پایا تھا اور جب حبیب سے رابطہ کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ ہر جگہ سے غائب تھا، موبائل نمبر بند، واٹس ایپ بند، فیس بک اکاؤنٹ اور ساری سوشل سائٹس بلاک۔

اس کے والد نے تو اپنے سر کے بال نوچ ڈالے تھے، یہ کیا کیا تھا ان کے سپوت نے؟ کیا اس دن کے لئے مانگتے ہیں لوگ بیٹے؟ انہوں نے بے ساختہ مبشر حیات کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے تھے، بھلا اس کے سوا وہ کیا کر سکتے تھے۔

وہ اس قدر شرمندہ تھے کہ ان کا بس چلتا تو

وہ اپنی جان دے کر بھی سنعیہ کو واپس لے آتے مگر مجبوری یہ تھی کہ ظالموں نے سارے سراغ ہی غائب کر دیے تھے، سعد کی گاڑی اس کے موبائل سب کچھ اس کے گھر سے برآمد ہو گیا تھا، آخر کار اس کے والدین سے رابطہ کیا گیا جو کہ لندن میں تھے، ان پر بھی اک قیامت ٹوٹی تھی۔

حبیب کے والدین تو شاید کسی طرح بری الذمہ ہو جاتے کہ ان کا بیٹا صرف شریک جرم تھا مگر سعد، وہ تو خود مجرم تھا اور کیا کیا تھا اس نے؟ کچھ اسلحہ بردار لڑکوں کو لے کر شادی کی تقریب میں گھس کر زبردستی اک لڑکی سے نکاح کیا تھا اور پھر......؟ اس کے آگے کے بریڈ کو مبہم غائب تھے، وہ گروپ کہاں غائب ہوا کوئی نہیں جانتا تھا۔

مگر سعد کے پیرنٹس پہلی فلائٹ سے واپس آ گئے تھے، مبشر حیات نا چاہتے ہوئے بھی ان سے ملنے پر مجبور تھے، حسن میر کا چہرہ زرد تھا، ان کے بیٹے نے وہ کام کیا تھا کہ وہ ساری زندگی سر اٹھانے کے قابل نہ رہے تھے، وہ مبشر حیات سے نگاہیں ملا کے بات نہ کر پا رہے تھے، کرتے بھی کیسے؟ بیٹے نے جو کارنامہ کیا تھا وہ اس لائق تھا کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے گولی مار دیتے۔

انہوں نے مبشر حیات کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے تھے اور قسم کھا کر کہا تھا کہ وہ ہر صورت اسے ڈھونڈیں گے اور اس کے بعد وہ چاہیں اس کے ساتھ کریں، وہ اف تک نہ کہیں گے، مگر یہ سب تو اس صورت میں ممکن ہو گا جب وہ اسے ڈھونڈ پاتے۔

مگر انہیں ہر صورت سعد کو ڈھونڈنا تھا، اسے مبشر حیات کی عدالت میں پیش کرنا تھا اور سب سے بڑھ کر ان کی بیٹی کو واپس لانا تھا، مگر اس سارے چکر میں وہ ایک شخص کو بھول گئے تھے اور وہ ''دانیال نواز'' تھا۔

☆☆☆

اس نے واٹس ایپ کھولا تو دانیال کا میسج تھا کہ وہ اسے واٹس ایپ پر کال کرنا چاہ رہا تھا، اس نے کال کا بٹن دبایا اور فون کان کو لگا لیا، تیسری بیل پر ہی فون اٹھا لیا گیا، دانیال بے حد پریشان تھا اور اسے بتا رہا تھا کہ اس کے پیرنٹس واپس آ چکے تھے اور سنعیہ کے والدین اس کے اور حبیب کے گھر تک پہنچ چکے تھے، اسی خوف کی وجہ سے اس نے موبائل سے کال نہیں کی تھی کہ کہیں اس کا نمبر ٹیپ نہ کیا جا رہا ہو، سعد جوں جوں اس کی گفتگو سن رہا تھا اس کی پیشانی پر شکنیں بڑھتی جا رہی تھیں، معاملہ اس کی توقع سے زیادہ خراب تھا اور اس کی توقع سے جلدی بگڑ گیا تھا، اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اتنی جلدی اتنا آگے نکل جائیں گے، اگر حسن میر نے مبشر حیات سے کوئی وعدہ کر لیا تھا تو اس کا بچنا اچھا خاصا مشکل تھا، وہ اسے ہر صورت ڈھونڈ نکالیں گے، تو اب کیا کرے وہ؟

یہ اسے خود سوچنا تھا، دوسری طرف دانیال اسے کہہ رہا تھا کہ اگر اس کے پاپا کو سیالکوٹ والے اس گھر کی لوکیشن پتہ ہے تو وہ سب سے پہلے جگہ بدلے، فوراً یہ جگہ چھوڑ دے، اس نے حامی بھر کے فون بند کر دیا، جگہ کے بارے میں اسے پریشانی نہ تھی کیونکہ اس گھر کے متعلق حسن میر آگاہ نہیں تھے، مگر یہ کوئی مستقل سلوشن نہ تھا اسے ایسا حل چاہیے تھا جو واقعی اس مسئلے کا حل ہوتا، اس دوپہر سے لے کر شام تک وہ سوچتا رہا، کبھی لیٹ جاتا کبھی اٹھ کر پھرنے لگتا، حیرت انگیز طور اس دن اس نے سنعیہ کو ذرا بھی تنگ نہ کیا، جو کہ بیڈ کے ایک کونے میں گٹھڑی سی بنی لیٹی تھی، آج بھی اس نے کچھ نہ کھایا تھا مگر آج

سعد نے اسے کھانے کا نہیں کہا۔

رات نے چاروں طرف اپنے پر پھیلائے تو وہ ساری سستی و کسلمندی کو پرے پھینکتا اٹھا اور شاور لینے چلا گیا۔

جب وہ شاور لے کر آیا تو سعیہ ابھی بھی ویسے ہی پڑی تھی، وہ آہستہ سے اس کے پاس آ بیٹھا، وہ ذرا سا چونکی اور پھر پیر سمیٹ لئے۔

''سعیہ!'' اس نے نرمی سے بلایا۔

''ہوں۔'' اس نے آنکھوں پہ ہاتھ رکھا ہوا تھا، اسی طرح بولی تھی۔

''اٹھو میری بات سنو۔''

وہ آنکھوں سے بازو ہٹاتی اٹھ بیٹھی، اس کے بال اس کے گالوں کے گرد پھیل گئے تھے، اس کی آنکھیں بجھی ہوئی اور اداس تھیں اور اس کی صحت پہلے سے خاصا گر گئی تھی، وہ کمزور نظر آتی تھی۔

سعد کے اندر کچھ ٹوٹا تھا، اس نے کبھی ایسا نہیں چاہا تھا، وہ تو اسے خوش رکھنا چاہتا تھا، خوش دیکھنا چاہتا تھا مگر وہ ناکام ہو گیا تھا، اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے بات شروع کی۔

''میں جانتا ہوں میں نے کچھ اچھا نہیں کیا، مگر میں مجبور تھا، یقین کرو شاید میں اپنے آپ کو تم تک آنے سے پہلے ختم کر دیتا اور......'' وہ اک لمحے کو رکا اور اس کا چہرہ دیکھا، وہ مجبوری سے اس کی بات سن رہی تھی اور اس کے چہرے پر واضح بے زاری نظر آتی تھی۔

''اگر اس رات حبیب نہ ہوتا تو شاید میں اب تک یوں تمہارے سامنے نہ ہوتا، اس رات میں نے خود کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی، میں نے خودکشی کر لی تھی۔'' اس کے انداز میں اذیت تھی اور وہ اپنے بازو کو دیکھ رہا تھا جس پر سات لمبی لکیریں تھیں اس نے سات جگہ سے اپنی کلائی پر کٹ لگائے تھے، سعیہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور ان میں بے پناہ خوف بھر گیا، اس نے بے یقینی سے سعد کو دیکھا، سعد نے خاموشی سے اس کے سامنے بازو کر دیا، سعیہ نے اس کے بازو کو دیکھا تو ایک بار پھر چونکی، یہ بازو تو اس کا بینڈیج میں رہا تھا نا کتنے ہی دن، اسے یاد آیا۔

''حبیب نے مجھے بچایا اور پھر، خیر آگے کی کہانی سے تم واقف ہو، میں تمہیں اپنی محبت کا یقین دلانے کی کوشش نہیں کرتا کیونکہ میں جانتا ہوں میں نے جتنا بڑا تمہارا نقصان کیا ہے اس کے بعد میری کسی بھی بات پر تمہیں یقین نہیں آئے گا، اس لئے آج میں تمہارے پاس ایک ایگریمنٹ لے کر آیا ہوں۔''

''کیسا ایگریمنٹ؟'' وہ چونکی۔

''ہم دونوں نے بزنس پڑھا ہے، ہم جانتے ہیں بہت اچھے سے کہ زندگی Give and take کے اصول پہ چلتی ہے، میں چاہتا ہوں تم میرے ساتھ ایک منتھ گزارو، بالکل اسی نارمل طریقے سے جس طرح سارے ہسبنڈ وائف رہتے ہیں، میں بھی تم سے بات کر سکوں اور تم میری بات سنو، بیزاری سے نہیں شوق سے، تم میرا خیال رکھو، تم میرے لئے مسکراؤ، ہاں سوئی میں تمہیں مسکراتا دیکھنا چاہتا ہوں، مگر بے فکر رہو یہ سب صرف ایک مہینے کے لئے ہوگا، اس کے بعد......'' وہ آہستہ سے رکا۔

''اس کے بعد میں تمہیں واپس چھوڑ آؤں گا۔'' اس نے مضبوطی سے کہا، اس نے بے یقینی سے سعد کا چہرہ دیکھا۔

''اور اگر تم اپنی بات سے پھر گئے تو؟'' اس کے لہجے میں بے یقینی بول رہی تھی۔

''میں حلف دینے کو تیار ہوں۔'' وہ تیزی

سے بولا۔

''نہیں حلف نہیں مگر تم وعدہ کرو کہ.......'' وہ بات مکمل بھی نہ کر پائی تھی کہ سعد نے اس کا ہاتھ تھام لیا، اپنے دونوں ہاتھوں میں بہت مضبوطی سے۔

''میں وعدہ کرتا ہوں سنعیہ، میں تمہیں واپس چھوڑ آؤں گا، تم جو بھی فیصلہ کرو گی مجھے قبول ہوگا، میں صرف تمہارے ساتھ کچھ پل خوشی کے گزارنا چاہتا ہوں، کچھ ایسے لمحے جو ہمیشہ مجھے سکون دے سکیں، کچھ یادیں اکٹھی کرنا چاہتا ہوں سونی، مسکراتی ہوئی محبتوں سے لبریز یادیں، جو ہمیشہ مجھے خوش کر دیں، میں تمہارے ساتھ اس ایک مہینے میں اپنی ساری زندگی جینا چاہتا ہوں سنعیہ۔'' اس کی آواز شدت جذبات سے مغلوب ہو رہی تھی، سنعیہ نے امید کی اس کرن کو کھونے نہ دیا۔

''مجھے منظور ہے۔'' وہ بے ساختہ بولی تھی۔

☆☆☆

وہ دونوں اس وقت شاپنگ کے لئے آئے ہوئے تھے، اتنے دنوں بعد باہر نکل کر سنعیہ کو بھی فریش فیل ہو رہا تھا، اسے باہر لے کر آتے ہوئے سعد نے اسے بس اتنا ہی کہا تھا۔

''میں چاہتا ہوں تم میری پسند پہنوں اوڑھو بس۔'' اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی، سنعیہ نے بس دھیمے سے سر ہلا دیا تھا، مگر شاپنگ سنٹر میں آ کر سعد نے سب کچھ اس پر چھوڑ دیا مگر وہ اسے چوائس میں ہیلپ کرتا رہا، سنعیہ تھوڑی الجھی محسوس ہوتی تھی اسے مگر وہ خاموشی سے نظر انداز کرتا رہا، کیونکہ اس کے سوا اس کے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا، وہ اس کی جھجک کا ماخذ سمجھ رہا تھا۔

شاپنگ کر کے جب وہ لوٹے تو رات گہری ہو چکی تھی، وہ اسے فریش ہونے کا کہہ کر خود کافی بنانے چلا گیا، سنعیہ سر ہلاتی باتھ لینے چلی گئی، جب وہ کافی بنا کر لایا تو وہ ڈریسنگ کے آگے براجمان تھی، اس نے سائیڈ ٹیبل پر کافی کا مگ رکھتے ہوئے اسے دیکھا تو دل کھل اٹھا تھا، وہ سفید فراک میں ملبوس تھی جو کہ اس کے گھٹنوں کو چھو رہی تھی، اس کے ساتھ ریڈ دوپٹہ تھا جو اس نے سر پہ لیا ہوا تھا، وہ اس کے قریب چلا آیا، وہ دونوں کلائیوں میں چوڑیاں پہن رہی تھی، سرخ چوڑیاں، وہ خاموشی سے ڈریسنگ سے ٹیک لگائے اسے دیکھتا رہا، بعض منظر بیان کی حد سے باہر نکل جاتے ہیں، اس لئے وہ بیان کرنے سے قاصر تھا کہ اسے کیا محسوس ہو رہا تھا۔

اس نے نظر اٹھا کر سعد کو دیکھا تو اس کے چہرے پہ واضح گھبراہٹ عیاں تھی، سعد کی آنکھوں میں انس اور نرمی تھی، اس نے احتیاط سے قدم آگے بڑھایا اور سنعیہ کو دونوں شانوں سے تھام لیا، پھر بہت آہستگی سے مخاطب ہوا تھا۔

''مجھے ایک اجازت چاہیے سنعیہ؟''

''کیسی اجازت؟''

''میں تمہارے ساتھ گزرے ہر لمحے کو کیمرے میں مقید کرنا چاہتا ہوں، میں یادوں کا یہ سرمایہ اکٹھا کرنا چاہتا ہوں سونی، میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں ان تصاویر کو ہمیشہ سیکرٹ رکھوں گا، نہ تو کسی کو دکھاؤں گا اور نہ ہی کسی اور طریقے سے تمہارے خلاف استعمال کروں گا۔'' اس کا لہجہ مضبوط اور یقین دلانے والا تھا۔

سنعیہ نے بس ہاں میں سر ہلا دیا، سعد کا چہرہ روشن ہو گیا، اس نے بے ساختہ سنعیہ کو اپنے ساتھ لگایا اور دوسرا ہاتھ اونچا کر کے اس لمحے کو قید کر لیا۔

پھر وہ اسے لے کر بیڈ پہ آ گیا، بیڈ پہ اسے

بٹھا کر اس نے سائیڈ ٹیبل کا دراز کھولا اور اندر سے ایک چیک بک نکالی، پھر ایک چیک جو کہ تیار تھا، الگ کیا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''یہ تمہارے حق مہر کا چیک ہے، اب جبکہ ہم دونوں ایک باقاعدہ تعلق میں بندھنے جا رہے ہیں تو میں چاہتا ہوں کہ تم پہ کوئی بھی حق استعمال کرنے سے پہلے اپنا فرض ادا کروں، حق مہر میرا فرض ہے اس لئے میں اسے ادا کرتا ہوں۔'' اس نے چیک سعیہ کی طرف بڑھایا، سعیہ کا چہرہ سفید تھا۔

''مجھے یہ نہیں چاہیے۔'' اس کی آواز مدھم تھی۔

''میں جانتا ہوں، مگر یہ تمہارے کام آئیں گے اور یہ تمہارا حق ہے سوئی، میں فرائض کی ادائیگی کے بغیر تم سے حقوق کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتا ناں۔'' وہ اب معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

سعیہ کے گال تمتما اٹھے، اس نے خاموشی سے چیک پکڑا اور اسی دراز میں پھر سے ڈال دیا۔

کافی کے مگ سے اٹھتی بھاپ اب بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی، اس نے کمرے کی روشنی مدھم کر دی، اب کمرے میں ہلکی نیلی روشنی تھی اور سعیہ کے گالوں پہ جیسے چراغ جل رہے تھے، سعد کھڑکیوں کے پردے گرا رہا تھا۔

تم ابر گریزاں ہو
میں صحرا کی مانند ہوں
دو بوند جو برسو گے
بیکار میں برسو گے
ہے خشک بہت مٹی
ہر سمت بگولے ہیں
اٹھتے ہی تو شعلے ہیں
تم کھل کے اگر برسو!
تو صحرا گلستاں ہو
ہم تم سے کہیں کیسے
تم ابر گریزاں ہو
جل تھل اگر تم کر دو
تن من میں نمی کر دو
ہے خشک بہت مٹی
پوری جو نمی کر دو
پھر تم کو بتائیں گے
تم میری محبت ہو!

نیند میں بھی اس کا چہرہ سچائی کا مظہر تھا، اس کے چہرے پہ افسردگی اور تھکن تھی اور وہ بے سدھ ہو کر سو رہی تھی، حالانکہ وہ اس کے بالکل پاس تھی اس کے ساتھ تھی، یوں کہ اس نے سعیہ کا سر اپنے بازو پہ رکھا ہوا تھا اور اسے بڑی مضبوطی سے اپنے حصار میں جکڑا ہوا تھا مگر کہیں نہ کہیں وہ خود بھی اداس تھا اور ذہن میں بس ایک یہی سوچ تھی۔

''کاش یہ سب یوں نہ ہوا ہوتا۔''
پچھتاوا سا پچھتاوا تھا۔

☆☆☆

محبت میں دکھ کے سوا رکھا ہی کیا ہے محسن
وہ مل بھی جائے تو جدائی کے اندیشے مار دیتے ہیں

وہ اس وقت چناب کے کنارے موجود تھے، رات کا وقت تھا اور چناب کے پانیوں پہ روشنیوں کا عکس بڑا دلکش تھا، وہ خاص طور پر آج اسے ادھر لے کر آیا تھا، ایک لمبا چوڑا آرڈر کرنے کے بعد وہ اوپن ائیر میں بیٹھے تھے، سعد مسلسل بول رہا تھا، اسے آج پتا نہیں کہاں کہاں کی باتیں یاد آ رہی تھیں، سعیہ خاموشی سے اس کی باتیں سن رہی تھی، کبھی کبھار وہ کوئی جملہ بول دیتی، آج وہ

کافی دنوں بعد پرسکون نظر آتی تھی۔

''سعد! کیا اس پانی میں بندہ ڈوب جاتا ہے؟'' اس نے جناب کے پانیوں پہ نظر جمائے اس سے سوال کیا تھا، وہ بھرپور طریقے سے چونکا تھا۔

''اگر بچانے والا ساتھ ہو تو نہیں۔'' وہ اعتماد سے بولا، سعیہ نے اک لحظے کو اسے دیکھا اس کا چہرہ کتنا خوبصورت تھا اور آج کل وہ کتنا خوش رہتا تھا، بقول اس کے وہ اپنی زندگی جی رہا تھا، یادیں اکٹھی کر رہا تھا، وہاں بھی سعد نے اپنی اور اس کی بے تحاشا تصاویر لی تھیں۔

وہ مطمئن تھا کیونکہ سعیہ اب اس کے ساتھ نارمل دکھائی دیتی تھی، وہ اس کے باتیں تو نہیں کرتی تھی مگر اس کی باتیں ضرور سنتی رہتی تھی اور اب وہ اسے ناشتہ بنا کے بھی دیتی تھی، وہ بے حد خوش ہوتا تھا ایک ایک نوالے پر اس کی تعریفیں کرتا اور پھر ضد کر کے بہت پیار سے چند نوالے خود اسے کھلاتا تھا اور جب وہ شاور لے کر آتی تو اسے پاس بٹھا لیتا، اس کے بالوں کی لٹیں اپنی انگلی پہ لپیٹ کے اسے دیکھا جاتا، وہ اتنی با اعتماد سی لڑکی کنفیوژ ہو جاتی اور جب اس سے سوال کرتی کہ وہ ایسے کیوں دیکھ رہا ہے تو وہ بس مسکرا کے اس کے پیشانی چوم لیتا۔

بہت سی باتوں کے جواب میں اس کا یہی ری ایکشن ہوتا تھا جو کہ سعیہ کو خاصا حیران کر دیا کرتا تھا۔

ایک دن وہ اس کے لئے ڈھیروں گلاب لے کر آیا تھا اور پھر بہت خوبصورتی سے اس کے بالوں میں سجائے تھے اور پھر اسے اس پہ بے تحاشا پیار آیا تھا، وہ اس کی بے تابیاں سہتی گلابوں سے سجی گلاب رنگ ہی ہوتی جاتی تھی۔

مگر خوش آئند بات یہ تھی کہ سعد کو اب سعیہ کا رویہ بدلا ہوا محسوس ہوتا تھا وہ اب جیسے اس کو قبول کر چکی تھی، اب وہ کبھی کبھار اس کی معصوم شرارت پہ ہنس بھی دیتی تھی اور ہاں اب وہ اس کی باتوں پہ چپ نہیں رہتی تھی وہ اسے مزے لے لے کر تنگ کرتی تھی، اسے یاد دلاتی تھی کہ وہ یونیورسٹی میں کتنا اکڑو اور بدتمیز تھا، وہ آگے سے شرمندہ ہوئے بغیر ہنس دیتا تھا اور اسے بتاتا تھا کہ وہ اس کے عشق میں کسی کام کا نہیں رہا ورنہ اک زمانے میں لڑکیاں اس پہ مرتی تھیں اب وہ خود اس پہ مرتا تھا، وہ آگے سے سرخ پڑ جاتی۔

کبھی کبھار وہ اس سے عجیب سی فرمائشیں کرتا، کہتا بہت سر درد ہے سر میں مالش کر دو اور ایک دفعہ تو اس نے حد ہی کر دی آدھی رات کو تکلیف سے کراہتا اٹھ بیٹھا کہ اس کے شولڈرز میں پین تھا وہ اس کے شولڈرز دباتی رہی پھر مالش بھی کی، پھر وہ اس کی گود میں ہی سر رکھ کر سو گیا، سعیہ نے بھی اسے تنگ نہ کیا کہ اس بے چارے کو اتنا درد تھا کہ اب وہ اتنی مشکل سے سویا تھا، اس نے کمبل اس پہ درست کیا اور خود بھی ویسے ہی آنکھیں بند کر لیں۔

ایک دن وہ موبائل پہ لگا تھا اور سعیہ ویسے ہی اس کے پاس بیٹھی تھی جب اس نے موبائل سعیہ کی طرف بڑھا دیا۔

''تمہیں بھی تو کینڈی کرش پسند ہے نا، چلو تم کھیلو۔'' اس نے کہتے ہوئے سعیہ کو کھینچ کر اپنے سینے سے اس کی پشت ٹکا دی اور کمبل درست کر دیا، چند لمحے تو وہ ساکت سی رہی، کیا انداز تھا، یعنی کہ وہ سعد کے سینے سے پشت ٹکا کر نیم دراز تھی اور سعد نے دونوں بازو اس کے گرد لپیٹ رکھے تھے اور ٹھوڑی اس کے سر پہ ٹکائی ہوئی تھی اور موبائل اس کے ہاتھ میں دیئے اس کے کھیلنے کا انتظار کر رہا تھا، وہ کچھ ہچکچا کر کھیلنے لگی اور

سعد کے لبوں پہ بے ساختہ گہری مسکراہٹ آ گئی وہ اسے اب تنگ کر رہا تھا، وہ صحیح موو لیتی تو الٹا مشورہ دیتا اور غلط موو لیتی تو ہنستا، وہ بھی اب انجوائے کر رہی تھی، واقعی یہ گیم دانیال کے علاوہ وہ چاروں کھیلتے تھے اور ہمیشہ ایک دوسرے کے ریکارڈ بریک کرتے رہتے تھے۔

اب وہ وقفے وقفے سے اس کے بال اس کا ماتھا اور اس کے گال چوم رہا تھا۔

وہ واقعی جھلا تھا ہر روز دن گنتا تھا اور کتنا اداس ہو جاتا تھا کہ اس کے پاس سعیہ بہت کم مدت کے لئے رہ گئی تھی، جیسے جیسے دن گزر رہے تھے سعد کی آنکھوں میں اک مستقل اداسی اور بے چینی نظر آتی تھی اور اس کی شدتیں بڑھتی جا رہی تھیں۔

☆☆☆

یہ ایک مہینے اور گیارہ دن بعد کی بات تھی جب حسن میر کے گھر کا دروازہ کھلا اور ہموار انداز میں ایک سیاہ کار روش پر پھسلتی ہوئی پورچ میں آ رکی، اوائل دسمبر کے دن تھے اور حسن میر اپنی مسز نائلہ میر کے ساتھ لان میں بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے، پھر کار کے اگلے دروازے کھلے اور سعد اور سعیہ باہر نکل آئے، حسن میر کے ہاتھ میں چائے کا کپ لرز گیا، انہوں نے تیزی سے کپ میز پہ رکھا اور اٹھ کھڑے ہوئے نائلہ کا چہرہ سفید ہو گیا تھا انہوں نے بھی حسن کی پیروی کی اور کھڑی ہو گئیں۔

سعد اور سعیہ اب ان کے قریب آتے جا رہے تھے، یہ سعد تھا؟ ان کو یقین نہ آیا تھا وہ بے حد کمزور دکھائی دیتا تھا مگر اس کی آنکھوں میں چمک تھی اور اس کے ساتھ وہ پیاری سی لڑکی تھی، ہاں وہ سعیہ ہی تھی۔

''السلام علیکم پاپا، ماما!'' اس نے قریب آ کر یوں سلام کیا جیسے روز کا معمول تھا اس کے انداز میں کوئی شرمندگی نہ تھی نہ ہی وہ اوور ایکٹ کر رہا تھا، وہ بہت پرسکون دکھائی دیتا تھا اور اس کا لہجہ بہت ہموار تھا۔

اور اس کے اس اطمینان نے حسن میر کو طیش دلا دیا تھا وہ دانت بھینچتے آگے بڑھے اور اسے کندھے سے تھام لیا۔

''تم...... تم سعد! تمہیں احساس ہے کہ تم کیا کر کے آئے ہو اور تم یوں ری ایکٹ کر رہے ہو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں، تم...... بے غیرت انسان۔'' انہوں نے بے قابو ہوتے ہوئے الٹے ہاتھ کا تھپڑ اس کے چہرے پہ مارا تھا، نائلہ دہل سی گئیں، وہ آگے سے کچھ نہ بولا، بس اسی طرح کھڑا رہا۔

''کتنا ظلم کیا ہے تم نے، تمہیں اندازہ ہے ایک خاندان کی عزت سے کھیلا ہے تم نے، ایک شریف اور عزت دار خاندان کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تم نے بے شرم انسان، کیوں واپس آئے ہو، چلو بھر پانی میں ڈوب کر مر جاتے، کم از کم میں تو لوگوں کی جواب دہی سے بچ جاتا، میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا، اتنا ہی اندھا کیا ہوا تھا عشق نے تو مجھے بتاتے، عزت سے ان کی بیٹی کا ہاتھ مانگ لیتے، ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں تو ان کا تماشا نہ بنتا، ان کی عزت کا جنازہ نہ نکلتا، تمہیں ذرا خیال نہ آیا سعد، ایک بار تو سوچتے کیا کرنے جا رہے ہو۔'' وہ غضبناک ہو کر دھاڑ رہے تھے، وہ خاموشی سے نظریں جھکائے کھڑا رہا۔

''نائلہ! مبشر صاحب کو فون کریں۔'' وہ پھولے تنفس کے ساتھ پیچھے ہٹے اور نائلہ کو مخاطب کیا وہ فوراً سے اندر کی طرف بڑھیں۔

''تم دفع ہو جاؤ یہاں سے، فی الحال میں تمہاری صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔'' انہوں نے

کرختگی سے کہا۔

سعد کی ساکت وجود میں جنبش ہوئی اور وہ اندر کی طرف بڑھ گیا، اس نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا اگر مڑ کر دیکھ لیتا تو پتھر کا ہو جاتا۔

☆☆☆

اس کے بعد کی کہانی میں صرف معافی تلافی تھی، جو کہ حسن میر مسلسل مبشر حیات سے مانگتے تھے، مبشر حیات اور ماجدہ وہاں آ کر سعیہ کو لے گئے تھے اور فی الحال معاملہ بالکل ٹھنڈا پڑ گیا تھا، مگر دونوں خاندان اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ وہ اس زبردستی کے بنائے گئے رشتے کو اتنی آسانی سے ختم نہیں کر سکتے تھے، یہ الگ بات تھی کہ نائلہ اور حسن کو سعیہ اتنی پسند آگئی تھی کہ وہ ہر دوسرے دن اس سے ملنے چلے آتے تھے، جو کہ خاموشی سے اپنے کمرے میں وقت گزارتی تھی اور جب وہ ماجدہ سے ملی تو اس نے اتنا ہی کہا تھا۔

''سعد میرا دوست تھا ماما، یونیورسٹی کے چار سال ہم نے اکٹھے گزارے اور مجھے اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ وہ میرے بارے میں دوستی سے ہٹ کر سوچتا تھا، اب سمجھ میں آتا ہے ماما کہ کیوں اللہ تعالیٰ مرد و عورت کا آزادانہ میل جول پسند نہیں کرتا، کیوں وہ کہتا ہے کہ دوستی کی کوئی بھی قسم مرد و عورت کو بدکاری اور فحاشی کی طرف ہی مائل کرے گی۔'' اس کے لہجے میں آگہی کا کرب تھا۔

''وہ کتنا صحیح کہتا ہے نا ماما؟''

''اور بات میں اللہ سے بڑھ کر سچا کون ہے؟''

''کیسے ممکن ہے کہ مرد و عورت کی دوستی میں جنس نہ آئے، اس کا فیصلہ تو اللہ نے ازل سے کر دیا تھا نا، جب وہ قرآن میں یہ کہتا ہے کہ ''عورتیں مردوں سے نرمی سے بات نہ کریں ورنہ ان کے دل میں روگ پیدا ہو جائے گا'' یہ روگ، یہ خیال ہی تو گندگی ہے جو نہ دل کو پاکیزہ رہنے دیتا ہے نہ اعمال کو۔'' وہ اب آنسوؤں سے رو رہی تھی۔

''میں سوچتی رہی کہ آخر میری غلطی کیا تھی؟ ایسا کون سا گناہ کیا تھا میں نے جو مجھ پر یہ قیامت ٹوٹی، تو مجھے احساس ہوا کہ میں معصوم نہیں تھی، مسلسل چار سال اس کے حکم کی خلاف ورزی کرتی رہی، اس کو جھٹلاتی رہی، مجھے اب پتا چلا کہ ہم جب اس کو رد کرتے ہیں تو درحقیقت ہم اپنے لئے گڑھا کھودتے ہیں۔'' وہ بس روتی جاتی تھی اور ماجدہ اپنی لاڈلی کو سینے سے لگائے اسے چپ کرواتی تھیں۔

☆☆☆

میں ایک ادھ مرے ماحول میں زندہ ہوں
میرے سپنے میں کوئی ان دیکھی وحشت ہے
پیاس ہے، تیرا غم ہے
اور ویرانی
ہے
میں جس دھندلے سپنے میں قید ہوں
وہاں میں تنہا نہیں ہوں
صدیوں کی خاموشی
ہے
تیری باس ہے، تیرا غم ہے
اور ویرانی
ہے
میں نے آرزوؤں کی پامالی کے بدلے
جو متاع بچالی تھی
وہ ایک خلش ہے، ایک رنجش ہے
ایک مسلسل بے کلی جو مجھے راس ہے
تیرا غم
ہے
اور......!!!
ویرانی ہے

آج بہت دن بعد وہ گھر سے باہر نکلی تھی،

ورنہ اس کا دل کب کرتا تھا کہیں جانے کو، بے مقصد سڑکوں پہ گاڑی دوڑاتے وہ صرف اور صرف اس زندگی کے بارے میں سوچ رہی تھی جو اب اسے گزارنی تھی۔

لوگوں کے سوالات سے بچتے ہوئے، پچھتاتے ہوئے اور شاید کہیں نہ کہیں اس گزرے ایک مہینے کو بھی یاد کرنا اس کا نصیب بن چکا تھا، امی ابو نے سب کچھ اس کی مرضی پہ چھوڑ دیا تھا کہ وہ جو بھی فیصلہ کرتی وہ اسے قبول کرتے۔

''فیصلہ؟''

تو کیا فیصلہ کرے وہ؟ وہ ابھی سی واپس آئی تھی۔

اور اس شب اس نے دو رکعت نفل حاجت پڑھ کر رو رو کر اللہ سے دعا مانگی تھی کہ وہ اسے کسی فیصلے پر پہنچا دے اور اگلی صبح اسے اللہ کا فیصلہ مل گیا تھا۔

جس دن سے وہ واپس آئی تھی، سعد نے اس سے کوئی رابطہ نہ کیا تھا، اس نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا، ایک مہینے کے بعد وہ اسے واپس چھوڑ گیا تھا اور فیصلہ اس پہ چھوڑ دیا تھا، اس شب اس نے سعد کو میسج کیا۔

''کیسے ہو؟'' مختصر سوال۔

''ٹھیک، تم کیسی ہو سونی؟'' فوری جواب آیا تھا۔

''میں بھی ٹھیک ہوں۔'' اس نے لکھا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے، اللہ تمہیں ہمیشہ مسکراتا رکھے۔'' اس کے والہانہ انداز، سعیہ کی مسکراہٹ اداس تھی۔

''کیا کر رہے ہو؟'' اس نے بات بڑھانے کی غرض سے پوچھا۔

''یہ کر رہا ہوں؟'' اس نے کہا ساتھ ہی اسکرین پہ سعیہ کا روشن چہرہ ابھرا، سعیہ کا دل لرز اٹھا، وہ اس کی تصویر دیکھ رہا تھا وہ واقعی پگلا تھا۔

''اک بات کہوں؟'' اس نے کہا۔

''کہو ناں۔'' وہ بے تابی سے بولا۔

''کیا تم میری ایک فرمائش پوری کرو گے؟'' چیلنج بھرا انداز۔

''ضرور، تم کہو۔''

''ملنے آ سکتے ہو؟'' دوسری طرف غالباً اسے سکتہ ہو گیا تھا، پھر اس کا فوراً جواب چمکا۔

''اس وقت؟'' غالباً وہ حیران تھا۔

''ہاں۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔

''اوکے۔'' فوراً سے گلا جواب آیا اور ٹھیک نو منٹ بعد اس کے بیڈ روم کے دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی اسے یقین نہیں آیا، اس نے فوراً دروازہ کھولا تو وہ دروازے میں کھڑا تھا، آف وائیٹ شرٹ اور بلیک پینٹ میں بکھرے بالوں سمیت، غالباً وہ بیڈ سے اٹھ کر آیا تھا، سعیہ نے آہستہ سے پیچھے ہٹ کر اس کے لئے راستہ چھوڑ دیا، وہ اندر آ گیا، سعیہ نے دروازہ بند کر دیا، کچھ لمحے خاموشی کی نظر ہوئے، پھر اس نے ہمت کر کے سعد کو دیکھا جو اسے دیکھتا جا رہا تھا۔

''بیٹھ جاؤ نا۔'' اس کے انداز میں جھجک تھی۔

وہ ایک طرف پڑی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا اور سعیہ بیڈ پہ ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی، اسے لفظ جوڑنا تھے اسے بات کرنا تھی، مگر کہاں سے شروع کرے، سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

''میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔'' وہ بدقت بولی تھی۔

سعد کا چہرہ لمحوں میں سفید پڑ گیا، اس نے سعیہ کو یوں دیکھا جیسے کوئی صدیوں کا پیاسا، پانی کو دیکھتا ہو، پھر وہ یکلخت اپنی جگہ سے اٹھا اور اس

کے پیروں میں آن بیٹھا، اس نے دونوں ہاتھ سنعیہ کے گھٹنوں پہ رکھے اور اس کے آگے جھک گیا۔

"تم جو بھی فیصلہ کرو سونی، مگر میری ریکوئسٹ ہے اس سے پہلے مجھے معاف کر دینا۔"

اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور اس کے ہاتھوں کے نیچے اس کی ٹانگیں لرز اٹھیں۔

"سعد!" اس نے سسکی سی لی اور دونوں ہاتھ سعد کے شانوں پہ رکھ دیئے۔

"میں نے تمہیں معاف کیا سعد۔" وہ اس کے بالوں پہ گال رکھے رو رہی تھی۔

"مجھے پتہ نہیں تھا کہ مجھے کیا فیصلہ لینا ہے، فیصلہ تو اللہ نے کروایا مجھ سے، اس نے اس نے مجھے امید کی کرن دی ہے سعد۔" اس کی سسکیاں بے اختیار تھیں۔

"ایک ماہ اکیس دن پہلے جس کالی رات میں، میں نے خود کو پایا تھا، اس تاریک شب کی سحر ہوگئی ہے سعد، وہ آ رہا ہے، اللہ نے اسے مجھے عطا کیا ہے، وہ تمہارا خون ہے مگر مجھے اسے اپنی سانسوں میں سینچنا ہے، اس کے بعد میں کیا فیصلہ لے سکتی تھی، فیصلہ تو اللہ نے کر دیا نا۔" وہ شدت جذبات کے اس دور سے نکل کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی، مگر اس کے گال ابھی بھی بھیگ رہے تھے، جنہیں وہ ہتھیلیوں سے صاف کرتی تھی۔

سعد کسی پتھر کے بت کی مانند ساکت تھا، پھر اس میں حرکت ہوئی اور وہ تڑپ کر اٹھا اور اسے شانوں سے تھام لیا۔

"سونی، تم سچ کہہ رہی ہو؟" شدت جذبات سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اس کی آنکھیں نم تھیں۔

اس نے بے ساختہ اثبات میں سر ہلایا، سعد نے اسے بے قراری سی اسے خود میں سمو لیا،

"سونی میری جان، میری سنعیہ۔" وہ والہانہ انداز میں اس پہ نثار ہو رہا تھا اور جب ان کے اشک تھمے تو وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر بے ساختہ ہنس پڑے۔

سنعیہ نے سچ ہی تو کہا تھا، جس طرح ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے اسی طرح ہر تاریک شب کی امید سحر بھی ضرور ہے، ان دونوں کو بھی اک چمکتا جگنو مل گیا تھا۔

مگر راستہ اتنا آسان بھی نہیں تھا، اسے ابھی سب کو منانا تھا، ممی پاپا، سنعیہ کے پیرنٹس سے معافی مانگنا تھی، حبیب کے پیرنٹس کو منانا تھا، دانیال کا شکریہ ادا کرنا تھا اور سب سے بڑھ کر اس بھگوڑے حبیب کو واپس بلانا تھا جو بے چارہ اس کی دوستی میں مارا گیا تھا اور دو مہینوں سے ایک مفت کی جلاوطنی بھگت رہا تھا، مستزاد سارے دوستوں اور گھر والوں سے بھی کٹا ہوا تھا۔

اور سب سے بڑھ کر ان سب انسانوں کو ادھر ہی چھوڑ کر اسے رب کائنات کے آگے بھی جھکنا تھا جس کی منشاء کے بغیر یقیناً یہ ممکن نہ ہو پاتا۔

☆☆☆

"اعتزاز"

اُم مریم اپنی شادی کی مصروفیات کی وجہ سے اس ماہ آپ کے پسندیدہ ناول "دل گزیدہ" کی قسط لکھ نہ پائی، انشاء اللہ آئندہ ماہ "دل گزیدہ" کی قسط شامل اشاعت ہو گی۔

ہما راؤ

تم نے پوچھا تو ہم بھی بتانے لگے
کس کے آنے سے موسم سہانے لگے
اس کی روشن نگاہوں کا ہے یہ فسوں
ہو اندھیرا بھی تو جگمگانے لگے
اس کی چارہ گری کا یہ اعجاز ہے
چشم نم دفعتاً مسکرانے لگے
ایک ساعت اگر ہاتھ وہ تھام لے
گردش وقت بھی سر جھکانے لگے
جس کے آنے کی تھی زندگی منتظر
اس کو آنے میں کتنے زمانے لگے

سامعہ سرور سے اس کا ایسا ہی دل کا معاملہ تھا، لیکن محترمہ ٹھہری بلا کی نازک مزاج، گھر بھر کے لاڈنے اور باہر والوں نے اس کے حسن کے قصیدے پڑھ کر اسے بگاڑنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

''باجی! بس بھی کرو، تمہاری مشین کی اس چنگھاڑتی بھونڈی آواز سے دماغ بھی جھنجھنا اٹھا ہے۔'' سامعہ سرور نے اسٹائلش ملبوسات والی ماڈل گرلز سے سجا میگزین پٹخ دیا تھا۔

''سامعہ گھر کے حالات تمہارے سامنے ہیں، بجائے کے تم ہماری مدد کرو، تاکہ ہماری آمدنی میں اضافہ ہو زندگی کچھ سہل ہو جائے، لیکن تمہارے لئے دن میں سونا لازم وملزوم ہے اور تم اتنا قیمتی وقت بغیر کسی وجہ کے سو کر ضائع کرتی ہو۔'' رائمہ باجی نے اسے لیکچر دیا۔

''باجی! مجھ سے نہیں ہوتا یہ سب کام اور نہ ہی مجھے پسند ہے۔'' سامعہ بے بسی سے بولی۔

''تمہارے خیال میں ہمیں شوق ہے یہ سب کام کرنے کا یا ہمیں بہت آسان لگتا ہے۔'' رائمہ باجی نے جھک کر دھاگہ توڑتے ہوئے کہا۔

''میں تو آج روٹیاں بنا کر تھک گئی ہوں۔'' سامعہ نے اپنے نازک گلابی ہاتھوں کو سہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا اگر زیاد اٹھ گیا ہے تو چائے بنا دو۔'' رائمہ باجی نے سلائی مشین چلاتے ہوئے کہا۔

''ویسے یہ زیاد صاحب کا ارادہ طویل قیام کا ہی لگ رہا ہے، خالہ کے سسرالی اتنے امیر کبیر ہیں مگر موصوف ہمارا امتحان لینے آن پہنچے۔'' سامعہ نے ناگواری سے کہا۔

''بری بات سامعہ وہ ہمارے مہمان ہیں اور ہم غریب ضرور ہیں مگر تنگ دل نہیں ہیں۔'' رائمہ باجی نے اسے ٹوکا۔

اور اندر لیٹا زیاد سامعہ کی بات سن کر بے حد شرمندہ ہو رہا تھا، وہ باہر والے کمرے میں رہتا تھا، کمرے کی کھڑکی چھوٹے سے صحن میں کھلتی تھی، جہاں سے آوازیں با آسانی سنائی دیتیں تھیں۔

زیاد حیدر آباد سے کراچی جاب کے سلسلے میں آیا تھا، یہاں اس کی پھپھو کا گھر بھی تھا اور چاچو کا بھی مگر اس کا دل چاہا وہ اپنی ثمرہ خالہ کے گھر ٹھہرے۔

یہاں آکر اسے اندازہ ہوا، خالہ کے گھر کے مالی حالات بے حد خراب تھے، دراصل زیاد کی والدہ کا برسوں پہلے انتقال ہو گیا تھا، امی کے انتقال کے بعد زیاد کا اسی کے رشتے داروں سے ملنا جلنا ختم ہو گیا تھا، اس کے ابو پہلے بھی اپنی امی اور بہنوں کی سنا کرتے تھے، آج بھی ان کی دنیا صرف اپنی ماں بہنوں تک تھیں۔

زیاد کو خالہ کا گھر یاد تھا، وہ بچپن میں ایک مرتبہ امی کے ساتھ آیا تھا۔

☆☆☆

''باجی آج کیا پکا ہے؟'' سامعہ نے پوچھا۔
''تم خود دیکھ لو۔'' رائمہ باجی جانتی تھی

اسے کریلے پسند نہیں اور کریلے تو زیاد حسن کو بھی پسند نہیں تھے۔

سامعہ نے آگے بڑھ کر ڈھکن اٹھایا اور پتلی میں جھانکا۔

''کیا پک سکتا ہے ہمارے جیسے گھروں میں آج پھر کریلے۔'' سامعہ کا موڈ بری طرح خراب ہو چکا تھا۔

''آہستہ بولو، گھر میں مہمان ہیں۔'' رائمہ باجی نے سمجھایا۔

''مہمان تین دن کا ہوتا ہے اور موصوف کو دو ہفتے ہو گئے۔'' وہ بے نیازی سے بولی، زیاد جو کچن میں پانی پینے آ رہا تھا، شرمندگی سے واپس پلٹ گیا تھا۔

''روٹیاں بنا کر میں نے ہاٹ پاٹ میں رکھ دی ہیں کھا لینا۔'' رائمہ کو سلائی کے کپڑے مکمل کرنے کی فکر تھی۔

''میں کیا کھاؤں گی؟'' سامعہ روہانسی ہوئی۔

''انڈہ بنا لو۔'' رائمہ باجی نے مشورہ دیا۔

''انڈہ نہیں کھانا ہے۔'' اس نے منہ بنایا۔

''پھر کیا کھانا ہے؟'' رائمہ باجی پریشانی سے بولیں سامع ان کی سب سے چھوٹی بہن تھی۔

''مجھے بریانی کھانی ہے۔'' سامعہ چہکی۔

''دماغ چل گیا ہے تمہارا۔'' رائمہ باجی کہہ کر چل دیں۔

سامعہ بنا کھانے کے ٹی وی دیکھنے لگی، رائمہ باجی نے قمیض مکمل کر کے سکون لیا، امی نماز اور وظائف میں مشغول ہو گئیں تھیں۔

''دروازے پہ دیکھو کون ہے؟'' رائمہ نے تھک کر سامعہ کو مخاطب کیا۔

''میں دیکھتی ہوں، زیاد ہو گا۔'' سامعہ بیزار ہوئیں۔

''یہ بریانی ہے۔'' زیاد نے اسے شاپر پکڑایا۔

''کس خوشی میں؟ کہیں اس نے میری باتیں تو نہیں سن لیں۔'' سامعہ مشکوک ہوئی۔

''میرا دل چاہا میں لے آیا۔'' وہ لاپرواہی سے بولا۔

''اچھا!'' سامعہ نے اطمینان سے شاپر پکڑا، اندر سے آتی بریانی کی خوشبو سے اس کی بھوک چمک اٹھی تھی۔

جلدی سے ایک پلیٹ میں زیاد کو دے کر وہ کچن میں بیٹھ کر کھانے لگی تھی۔

''سوں سوں۔'' مرچیں بہت تیز تھیں، کاش دہی بھی لے آتا، سامعہ نے سوچا۔

''تمہاری خواہش پوری ہو گئی۔'' رائمہ نے اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' وہ کھانے میں مصروف تھی۔

''سامعہ اپنے اندر صبر پیدا کرو، دیکھو اب تم بڑی ہو گئی ہو۔'' رائمہ باجی بولیں۔

''اتنی بھی بڑی نہیں ہوئی ہوں۔'' سامعہ بے ساختہ بولی۔

''سامعہ تمہارا بچپنا نہیں گیا ورنہ آپ کی عمر اب کھلونوں سے کھیلنے کی نہیں رہی ہے۔'' رائمہ باجی بولیں۔

''باجی آپ تو بس رہنے دیں۔'' سامعہ بور ہوئی۔

''باجی! اس بار سردیوں کی زبردست کلیکشن آئی ہے۔'' اتنے دیدہ زیب پرنٹس کے دیکھ کر خریدنے کو دل مچل گیا۔

''تم نے کہاں دیکھ لئے؟'' رائمہ باجی

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبداللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

"ہیں...... میں نے کالج سے واپسی میں دیکھے تھے۔"

"کیا مطلب کالج سے واپسی میں۔" رائمہ باجی الجھیں۔

"مطلب میری بیسٹ فرینڈ ہے نہ عروج اسے کچھ شاپنگ کرنی تھی تو ہم دونوں مال گئی تھیں۔" سامعہ نے بتایا۔

"کتنی بری بات ہے سامعہ گھر والوں کی جازت کے بنا اِدھر اُدھر گھومنا، تمہیں ہم پڑھنے بھجتے ہیں تم سیدھی جایا کرو اور سیدھی آیا کرو۔" وہ خفا ہوئیں۔

"اُف باجی آپ بھی نہ امی کی طرح فرسودہ خیالات رکھتی ہیں۔" سامعہ جھنجھلائی۔

"سامعہ ہم تمہارے بھلے کے لئے کہتے ہیں۔" رائمہ باجی نرمی سے بولیں۔

"تنگ آ گئی ہوں میں اس بھلے سے اس بوسیدہ گھر میں رہتے ہوئے تم لوگوں کے خیالات بھی بوسیدہ ہو گئے ہیں، مجھے تو گھٹن ہونے لگی ہے۔" سامعہ بدتمیزی سے بولی تھی۔

"تم پہ کوئی بے جا پابندیاں عائد نہیں کیں گئیں۔"

"پرانی اور فرسودہ روایت پر عمل کروانا، پابندی نہیں تو کیا ہے؟" سامعہ نے طنز کیا تھا۔

"پتہ نہیں کیوں تم ضدی ہوتی جا رہی ہو۔" رائمہ باجی عاجز ہوئی۔

☆☆☆

"باجی! مجھے دو سو روپے چاہیے تھے۔" سامعہ نے اب کے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مگر کیوں؟" رائمہ چونکی۔

"باجی بس چاہیے پلیز۔" سامعہ نے منت ریز انداز میں کہا تو رائمہ کو ماننی ہی پڑی۔

"اور تم جانتی ہو نہ کہ گھر میں پیسوں کی کتنی قلت ہے۔" رائمہ نے احساس دلانا چاہا تھا۔

"باجی گھر میں تو ازل سے ہی قلت ہے اور رہے گی۔" وہ لاپرواہی سے بولی تھی، رائمہ تاسف سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی، وہ شروع سے ایسی ہی تو تھی، خود غرض، مفاد پرست، اپنی ذات کے لئے جینے والی۔

"بیٹا! آج کچھ مہمان آنے والے ہیں اچھی سی تیار ہو جانا۔" امی نے اسے کہا۔

رائمہ قبول صورت تھی مگر سیرت بہت اچھی تھی، اور بے حد محنتی، حساس لڑکی تھی۔

"بیٹا! آج کچھ لوگ آ رہے ہیں رائمہ کو دیکھنے۔" امی نے زیاد کو بتایا۔

"یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔" زیاد کو خوشی ہوئی وہ رائمہ کی بہت عزت کرتا تھا، وہ اس کا ہی نہیں سب کا یکساں خیال رکھتی تھی۔

"لڑکا کیا کرتا ہے آنٹی؟" زیاد نے پوچھا۔

"لڑکا سرکاری ملازم ہے۔" امی خوشی سے بولیں۔

"مگر کس محکمے میں؟"

"نام تو میں بھول گئیں۔" وہ سادگی سے بولیں، زیاد مسکرا کر رہ گیا تھا۔

"امی مہمان آ گئے۔" سامعہ بولی۔

زیاد نے اسے نظر بھر کر دیکھا، جو اس وقت گہرے سبز سوٹ میں بہت پیاری لگ رہی تھی، زیاد چائے کے ساتھ سموسے اور بسکٹ بھی لے آنا، امی نے ہدایت جاری کیں۔

"جی!" سعادتمندی سے کہا زیاد اسی وقت چل پڑا۔

"رائمہ باجی یہ تیاری کا کون سا طریقہ ہے؟" سامعہ نے گھورا۔

"میں ایسی ہی بھلی۔" رائمہ بے دلی سے

بولی تھی۔
''باجی آپ بہت سادا ہیں ایسی لڑکیوں کو بھلا کون پسند کرتا ہے۔'' سامعہ بولی۔
''سامعہ چپ ہو جاؤ۔'' رائمہ بے زار ہوئی۔
''مرضی ہے۔'' سامعہ نے میگزین اٹھایا، رائمہ نے چائے بنالی تھی بسکٹ اور سموسے رکھے اور ٹرلے لے کر کچھ گھبرائی ہوئی سی اندر داخل ہوئی۔
''السلام علیکم!''
''یہ بیٹی ہے آپ کی؟'' تینوں خواتین نے سر سے پیر تک رائمہ کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا، ان کے اس طرح دیکھنے سے رائمہ نروس ہوگئی۔
''جی یہ میری بیٹی ہے، بی اے کیا ہے اس نے اس کے علاوہ کھانا پکانے اور سلائی کڑھائی میں اسے بہت مہارت ہے۔'' امی نے خوشی سے بتایا۔
''آپ کے میاں کیا کرتے ہیں؟'' بڑی عمر کی خاتون نے اپنی پلیٹ میں دو سموسے اور خوب چٹنی کا بھرتہ بناتے ہوئے پوچھا۔
''ان کا انتقال ہو گیا ہے۔'' امی رنجیدہ ہوئیں۔
''او...... افسوس ہوا۔'' موٹی عورت نے مصنوعی افسردگی سے کہا۔
''شوہر کیا کرتے تھے؟'' تیسری بولی۔
''سرکاری محکمے میں کلرک تھے۔''
''او......کلرک۔'' خاتون کو افسوس ہوا۔
''اور آپ کے بیٹے کتنے ہیں؟'' خاتون صوفے پر پھیل گئی۔
''جی ایک ہے میٹرک میں ہے۔''
''تو گھر کا گزارہ کیسے ہوتا ہے؟'' خاتون کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔

''ایک دوکان ہے اس کا کرایہ آجاتا ہے، کچھ پینشن ہے، عزت سے گزارہ ہو جاتا ہے۔'' امی عاجزی سے بولیں۔
تینوں عورتوں کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی اس کے بعد وہ خاموش ہی رہیں، امی سمجھ گئیں، آج پھر ایسا ہی ہوگا، آنے والیں کھائی کر ان کی پیاری سلیقہ شعار بیٹی کو مسترد کر جائیں گی، ان کی کم مائیگی کی وجہ سے، ان کے گھر آنے والے لوگ بدنصیبی سے سب ہی لالچی ہوتے تھے۔
وہ خواتین چلیں گئیں، رائمہ نے بے دلی سے ٹیبل پر سے برتن سمیٹے اور کچن میں آ گئی۔
''چلے گئے مہمان؟'' زیاد نے حیرت سے پوچھا، آدھا گھنٹہ ہی گزرا تھا۔
''تو اور کیا یہیں ڈیرہ ڈال لیتے۔'' سامعہ چڑ کر بولی۔
مہمانوں کی رائے خالہ کے چہرے پر مایوسی کی صورت میں لکھی تھی، زیاد افسردہ ہوا۔
''آج کیا کھانا نہیں ملے گا۔'' زیاد نے رائمہ کو مخاطب کیا۔
زیاد کی آواز پہ اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا تھا، اس نے تھکے تھکے قدموں سے کچن کا رخ کیا تھا، سالن گرم کیا اور ہاٹ پاٹ سے روٹی نکالی۔
''میں تمہیں بہت بہادر سمجھتا تھا۔'' زیاد نے کہا۔
''تو مجھے کیا ہوا ہے؟'' رائمہ نے نگاہیں چرائیں۔
''کچھ نہیں بس منہ اترا ہوا ہے اور خاموش ہو۔'' زیاد بولا۔
''میں امی کی وجہ سے پریشان ہوں، وہ بہت ٹینشن لیتی ہیں پھر ان کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے، ورنہ میں ان ناقدرے لوگوں کی وجہ

سے پریشان نہیں۔'' رائمہ نے کہا۔
''اللہ بہتر کرے گا۔'' زیاد کو سمجھ میں نہیں آیا اسے کن الفاظ میں تسلی دے۔

☆☆☆

زیاد رات میں صحن میں تازہ ہوا کے لئے آیا تو سامعہ کی دلکش و دل موہ لینے والی ہنسی کی آواز آئی تھی، اعتماد سے لبریز اور فضاؤں میں گھنٹیاں سی بجا دینے والی، زیاد چونکا فضا میں رچی رات کی رانی کی مہک اپنے اندر سمونے لگا۔
وہ اپنی سہیلی عروج سے کالج کے فنکشن پہ تبصرہ کر رہی تھی۔
زیادہ کا دل چاہا وہ اس کے پاس بیٹھے اور بولتی جائے اور وہ اسے سنتا جائے۔
مکمل چاند کی روشنی تھی، سامعہ کے چہرے پر چاند کی چاندی بکھری ہوئی دلکش لگ رہی تھی، وہ بے خود سا اسے دیکھے گیا، ایک ہاتھ سے موبائل کانوں کو لگائے دوسرے ہاتھ سے اپنے اڑتے بالوں کو قابو کرتی بہت انہماک سے باتوں میں مگن تھی، وہ زیاد کی آمد سے بے خبر تھی۔

کبھی یوں بھی تو ہو
دریا کا ساحل ہو
پورے چاند کی رات ہو
اور تم آؤ
کبھی یوں بھی تو ہو
کوئی نہ میرے ساتھ ہو
اور تم آؤ
کبھی یوں بھی تو ہو
بادل ایسا ٹوٹ کر برسے
میرے دل کی طرح ملنے کو
تمہارا دل بھی ترسے
اور تم آؤ
کبھی یوں بھی تو ہو
تنہائی ہو، بادل ہو، برسات ہو
اور تم آؤ
کبھی یوں بھی تو ہو

زیاد کو لگا وہ برسوں سے اسے چاہتا آرہا ہے، سامعہ کا جب گھنٹے کا پیکج ختم ہوا تو وہ اندر جانے کے لئے بڑھی اور زیاد کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔
''آپ یہاں؟''
''موسم اچھا تھا، میں باہر آگیا۔'' زیاد نے کہا۔
''موسم اچھا ہے؟'' ہوا کی رمق تک نہ تھی اور گھٹن اور حبس سے سامعہ کی جان نکلے جا رہی تھی اور وہ کہہ رہا تھا، موسم اچھا ہے، سامعہ کو اس کی دماغی حالت پہ شبہ ہوا۔
''میرے دل کا موسم اچھا ہے۔'' زیادہ نے وضاحت کی۔
''آپ پہ بھی اس گھر کے مکینوں کا اثر ہو گیا ہے، ایویں بلاوجہ خوش ہونے کے بہانے ڈھونڈنا۔'' سامعہ نے کہا۔
''یہ تو بہت اچھی بات ہے، انسان کو ہر حال میں خوش رہنا چاہیے۔'' زیاد نے کہا۔
''تو رہیے۔'' وہ کہہ کر چل دی، زیاد محض اسے دیکھ کر رہ گیا۔
سامعہ کالج سے آئی تو امی اسے صحن میں مل گئیں دیکھتے ہی بولیں۔
''کہاں رہ گئی تھی تم؟ اتنی دیر لگا دی، کتنی بار کہہ چکی ہوں، چھٹی ہوتے ہی گھر آجایا کرو مگر تمہارے کان پر جوں تک نہیں رینگتی، پتہ نہیں دوسروں کے ساتھ فالتو باتیں کرنے میں کیا مزہ آتا ہے۔''
''امی میں عروج کے ساتھ لائبریری میں تھی۔'' زیاد کی موجودگی میں امی کا اس طرح بولنا

مناسب نہیں لگا تھا، مگر انہیں جب غصہ آتا وہ یوں ہی آپے سے باہر ہو جاتیں اور بھی کسی کے سامنے لحاظ نہ کرتیں تھیں، سامعہ کو ان کی یہ عادت بہت بری لگتی تھی، وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں آگئی تھی۔

سامعہ کا چھوٹا بھائی اسفر، زیاد سے پڑھ رہا تھا، زیاد کے آنے کا یہ فائدہ ہوا تھا، زیاد اسفر کو پڑھا دیتا تھا، ٹیوشن کے دو ہزار بچ گئے تھے اور گاہے بگاہے اپنے پیسوں سے کوئی نہ کوئی ضرورت کا سامان بھی لے آتا تھا، خالہ کے دگرگوں معاشی حالات کا اسے افسوس تھا، وہ جانتا تھا سامعہ کو آم بہت پسند ہے، اکثر آتے ہوئے آم لے آتا، خالہ منع کرتیں، رائمہ شرمندہ ہوتی مگر سامعہ مزے سے کھاتی جاتی اور زیاد اسے کھاتا دیکھ کر خوش ہو جاتا تھا۔

☆☆☆

کراچی میں ہی سامعہ کی دور کی پھپھو رہتی تھی، انہوں نے اصرار سے اپنی بیٹی فروا کی شادی میں ان سب کو بلایا تھا، سامعہ تو بہت ایکسائیٹڈ تھی۔

''باجی مجھے نہیں معلوم، مجھے دونوں فنکشن کے لئے نئے جوڑے چاہیے۔'' سامعہ نے چہرے پر بلیچ کرتے ہوئے کہا۔

''دماغ خراب ہو گیا ہے تیرا، آرام سے بیٹھ جا گھر میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔'' امی گرجیں۔

''پھر میں کیا پہنوں گی؟'' وہ چلائی۔

''تمہاری شادی نہیں ہے۔'' امی نے اطمینان سے جواب دیا۔

''میں نہیں جاؤں گی ان پرانے کپڑوں میں۔'' سامعہ رو دینے کو تھی۔

''تمہاری مرضی ہے۔'' امی نے آرام سے کہا، سامعہ کی آنکھوں میں امی کے رویے پہ آنسو آگئے، زیاد تڑپ کر رہ گیا تھا، سامعہ کی آنکھ میں آنسو اسے بے چین کر رہے تھے، اسے سمجھ نہیں آیا، وہ کیا کریں، وہ کچھ دیر بعد گھر سے چلا گیا، واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں شاپر تھا۔

''یہ خالہ تین سوٹ ہیں۔'' زیاد جھجکا، خالہ کی ناراضگی کا بھی ڈر تھا، مگر سامعہ کے دل ٹوٹنے کا بھی ڈر تھا۔

''کس کے سوٹ؟'' انہوں نے ابروں چڑھائیں۔

''میرا دوست ہے زمان اس نے دوکان بنائی ہے، آج افتتاح تھا، کپڑے آدھی قیمت پہ مل رہے تھے میں نے سوچا آپ لوگوں کے لئے لے لوں۔'' زیاد نے بہانہ بنایا۔

''بیٹا! اس کی ضرورت نہیں تھی، تم نے پیسے کیوں برباد کیے، کوئی دیکھے تو کیا کہیں کہ گھر میں رکھ لیا تو اسے لوٹا جا رہا ہے۔'' وہ دکھ سے بولیں۔

''آنٹی آپ مجھے اپنا بیٹا نہیں سمجھتی تب ہی ایسے کہہ رہی ہیں۔'' زیاد نے دکھ سے کہا۔

''بیٹا تم میری مرحومہ بہن کے بیٹے ہو مجھے بڑے پیارے ہو مگر......؟''

''مگر ہمیں اچھا نہیں لگتا کہ آپ اپنے پیسے اس طرح ہم پر خرچ کریں۔'' رائمہ نے بات مکمل کری تھی، رائمہ بے حد حساس، خود دار لڑکی تھی، اسے بہت شرمندگی ہوتی تھی جب زیاد گھر کے لئے کوئی چیز لے آتا تھا۔

''ٹھیک ہے پھر مجھے بھی کوئی کرائے کا گھر دیکھ لینا چاہیے جب آپ لوگ اتنی اجنبیت برت رہے ہیں، پھر تو میرا یہاں مفت میں رہنا اور کھانا پینا بھی مناسب نہیں۔'' زیاد ناراض ہوا۔

''بیٹا! تم غیر تو نہیں ہو پھر ایسی باتیں۔'' امی کو افسوس ہوا۔

''میں ملیر سے آئی ہوں۔'' اس نے بے حد پراعتماد انداز میں کہا۔

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' وہ بے باکی سے بولا، سامعہ مسکرائی تھی، رائمہ رخ موڑ گئی۔

''میں سلیمان ہوں، امریکہ سے آیا ہوں اپنی بہن کی شادی میں۔'' وہ بتا رہا تھا اور سامعہ بے حد متاثر نظر آ رہی تھی، وہ اس کے خوابوں کا شہزادہ نکلا تھا۔

''شادی سے فرصت کے بعد میں آپ کے گھر آؤں گا۔'' وہ لگاوٹ سے بولا۔

''یہ اتنا چھچھورا کیوں ہے؟'' رائمہ ناگواری سے آہستہ سے زیاد سے بولی۔

''ان لوگوں کے پاس پیسہ بہت ہے مگر صرف پیسہ۔'' زیاد نے بتایا۔

''دیکھ چکی ان لوگوں کا ماحول۔'' رائمہ عاجز ہوئی۔

کھانے کے وقت رائمہ امی کے پاس تھی، اسفر اور زیاد ساتھ ساتھ تھے، ایسے میں سلیمان نے چپکے سے سامعہ کا نمبر مانگا اور اسے موبائل میں سیو کر لیا تھا۔

سامعہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی، رات کو اس نے فون کیا، سامعہ کا دل دھڑکنے لگا، جو اس ساتھ ساتھ چھوڑ گئے وہ جس لگاوٹ اور بے تکلفی کا مظاہرہ کر رہا تھا، سامعہ کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

یہ سچ تھا، سلیمان کو وہ بہت پیاری لگی تھی، وہ اس سے شادی کرنا چاہ رہا تھا، فون رکھ کر بھی وہ کتنی دیر اپنے دل کی دھڑکن اپنی سماعت میں دھڑکتا محسوس کرتی رہی، وہ روزانہ فون کرنے لگا، ادھر سامعہ کے اندر نشہ اتر آیا، ہزاروں تشنہ خواہشیں پل بھر میں آنکھوں میں خواب بن کر اتر آئیں۔

سلیمان نے اپنے گھر رشتے کی بات کی تھی تھوڑی سی بحث و تکرار کے بعد وہ بالآخر مان گئے تھے، سامعہ کو اپنی خوش قسمتی پہ ناز ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

میرے ہونٹوں پہ جس رت میں تیری باتیں نہیں ہوتیں
وہ ساون کیوں نہ ہو، اس رت میں برساتیں نہیں ہوتیں
نہ دیکھوں گر تیرا چہرہ تو یوں محسوس ہوتا ہے
کہ اس دنیا میں جیسے چاندنی راتیں نہیں آتیں
یہ گاتا گنگناتا حسن یہ ہنستا ہوا پیکر
کسی کے پاس بن تیرے، یہ سوغاتیں نہیں ہوتیں
محبت جس کو کہتے ہیں، قتیل ایک ذات ہے وہ بھی
کریں جو پیار، اس کے سامنے راتیں نہیں ہوتیں

خوبصورت گمبھیر لہجے میں شاعری اس کی سماعت میں اترنے لگی۔

''آپ۔'' وہ اس کی اتنی محبت پہ حیران رہ جاتی تھی۔

''آپ کے حسن کا پجاری اور یہ آنکھیں ہمہ وقت آپ کی دید کی پیاسی رہتی ہیں۔'' فون کی بیل پر سامعہ نے کال ریسیو کی تو سلیمان نے اپنے خوبصورت لبوں لہجے میں نظم سنائی۔

''کچھ ہوش کریں صبح کے چار بجنے والے ہیں۔'' اس نے شرارت سے کہا۔

''آپ بات کر رہی ہوں تو کس کافر کو ہوش رہے گا اور اگر سامنے ہو تو نجانے کیا ہوگا۔'' وہ نشیلی آواز میں بولا تھا۔

سامعہ شرم سے سرخ پڑ گئی تھی، دوسرے دن واقعی سامعہ کا رشتہ لے کر سلیمان کے گھر والے آ گئے تھے، امی اور رائمہ بہت سے وسوسوں اور واہموں کا شکار تھیں، اتنی دور امریکہ بھیجنے پہ

آمادہ بھی نہ تھیں، سامعہ ان کی بے حد لاڈلی تھی، امی نے سوچنے کا وقت مانگا مگر دل میں انکار کا تہیہ کر لیا۔

''امی اور باجی میں اس رشتے پہ بہت خوش ہوں، میرے خواب تعبیر بن رہے ہیں، آپ لوگوں کے لئے یہ ہی بات کافی ہونی چاہیے کہ میں خوش ہوں۔'' سامعہ نے پیار سے کہا۔

''بیٹا لڑکا امریکہ میں ہے اور ہم تو تجھ سے ملنے کو ترس جائیں گے، اتنی دور رہنا آسان نہیں، دل نہ لگا تو۔'' امی بولیں۔

''امی کچھ نہیں ہوتا، خوش رہنا اہم ہے چاہے فاصلے بھی زیادہ ہوں، مگر قریب ہو اور ہر وقت دکھی رہے تو دل جلتا ہے، آپ بس دعا کریں بیٹیاں جہاں رہیں سکھی رہیں۔'' سامعہ نے منانا چاہا۔

''میں سوچتی ہوں، مگر میرا دل نہیں مان رہا اتنی دور۔'' امی پریشان تھیں۔

''مجھے ان لوگوں کا ماحول پسند نہیں آیا۔'' رائمہ نے ناگواری سے کہا۔

''آپی وہ لوگ امیر ہیں، ماڈرن ہیں، ان کا ماحول ایسا ہی ہے۔''

زیاد کو جب پتہ چلا تو وہ بے چین ہی ہو گیا۔

''سامعہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے لگی لپٹی بغیر کہا۔

''مگر میں آپ سے شادی میں انٹرسٹڈ نہیں ہوں۔'' سامعہ نے منہ بنایا۔

''کیوں؟'' اس کا دل ڈوبا تھا۔

''آپ میرے آئیڈیل نہیں ہیں۔'' اس نے صاف کہا۔

''تمہارا آئیڈیل کیا ہے، مجھے بھی تو پتہ چلے۔''

''سلیمان حیدر میرا آئیڈیل ہے۔''

''تم اسے نہیں جانتی وہ انجان شخص ہے لاکھوں میلوں کے فاصلے پر ہے، سلیمان میں کیا خاص بات ہے؟'' زیاد نے طنز کیا۔

''سلیمان میں سب ہی خاص ہے، وہ اچھی شکل کا ہے، مال و دولت والا ہے۔'' سامعہ بولی۔

''آئی کانٹ بلیو، دولت پیسہ تمہارے لئے اس قدر اہم ہے، محبت، خلوص، وفا، رشتے سب تمہاری نظر میں بے معنی ہیں۔'' زیاد کی نظر میں تاسف، حیرت کیا کچھ نہیں تھا۔

''میں آپ لوگوں کی طرح محض اخلاق، کردار، سیرت پر گزرا نہیں کر سکتی، میرے کچھ خواب ہیں اور ان کی تعبیر اگر مل رہی ہے جائز طریقے سے تو اس میں کیا برا ہے؟'' سامعہ نے سوال کیا۔

''مسٹر زیاد میرے والد ایک معمولی کلرک تھے، ان کی تنخواہ بہت کم تھی، اس لئے زندگی ہمارے لئے کبھی بھی آسودہ نہیں رہی ہے، روپے پیسے کی محرومی رائمہ باجی کی شادی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، رائمہ باجی میں کیا کمی ہے، ان سے اچھی لڑکی خاندان میں نہیں ہے، مگر کسی کو بھی بہو ڈھونڈتے ہوئے رائمہ باجی نہیں نظر آتیں۔'' سامعہ تلخ ہوئی تھی۔

''اس لئے میں اب تنگ آ گئی ہوں اس غربت سے، میں اچھی زندگی گزارنا چاہتی ہوں، اچھے مہنگے کپڑے دل کھول کر شاپنگ کرنا چاہتی ہوں، سفر کے لئے آرام دہ گاڑی چاہتی ہوں، کیا آپ یہ سب مجھے دے سکیں گے؟''

زیاد خاموش رہا اس کا سر نفی میں ہلا، اس کی تنخواہ پندرہ ہزار تھی، فی الوقت مہنگائی کے لحاظ سے اس میں گزارہ آسان نہیں تھا، اس لئے

خاموشی سے راستے سے ہٹ گیا تھا۔

☆☆☆

ابھی کیا کہیں، ابھی کیا سنیں
یونہی خواہشوں کے فشار میں
کبھی بے سبب کبھی بے خلل
کہاں کون کس سے بچھڑ گیا
کسے کس نے کیسے گنوا دیا
کبھی پھر ملیں گے تو سوچنا

شادی کی تاریخ بہت جلد رکھی گئی تھی، سلیمان حیدر کو واپس جانا تھا، نکاح ہو گیا تھا، کیوں کہ وہ اسے ساتھ لے جانا چاہتا تھا، تو ڈاکومنٹس بننے میں وقت درکار تھا۔

نکاح کیا ہوا سلیمان کو تو گویا آزادی مل گئی۔

''میں تمہیں شاپنگ پہ لے کر جاؤں گا۔'' سلیمان نے کہا۔

''امی سے پوچھنا پڑے گا۔'' سامعہ بے چارگی سے بولی۔

''بیوی ہو تم میری۔'' اس نے حق جتایا۔

سامعہ نے رائمہ باجی تک سلیمان کی خواہش پہنچائی، رائمہ نے کسی نہ کسی طرح امی کو منا ہی لیا، گو کہ وہ خوش نہیں تھیں مگر سامعہ اب اس کی منکوحہ تھی، اجازت دینی ہی پڑی تھی۔

سلیمان کی خواہش پہ اس نے ڈارک بلیو قمیض پائجامہ پہنا تھا، مناسب میک اپ کیے اس کی دلکش صورت مزید حسین لگ رہی تھی۔

''مسز سلیمان پہلے ہم آئسکریم کھائیں گے۔'' وہ ڈرائیو کرتے ہوئے بولا وہ مسکرا دی تھی۔

''تم بہت حسین ہو، بہت پیاری میرے دل کی ملکہ ہو تم۔'' وہ بہت محبت سے بول رہا تھا، سامعہ بے حد خوش تھی، اسے سچا قدر دان مل گیا تھا۔

''میں اب تمہارے بنا ایک پل بھی نہیں رہ سکتا، یہ ایک مہینہ کیسے گزرے گا؟ بولو......'' سلیمان نے انگلی سے اس کے گالوں کو چھوا، سلیمان کی بے باک نگاہیں پورے استحقاق سے اس پر جمیں تھیں، سامعہ کی نگاہیں بے ساختہ جھک گئیں تھیں۔

''بولو گی نہیں؟''

''سلیمان پلیز۔'' اس کے چہرے پہ حیا کی لالی دوڑ گئی۔

''چلو ہم اپنی پیاری بیوی کو زیادہ تنگ نہیں کرتے، اسٹیپ بائی اسٹیپ چلیں گے۔'' سلیمان نے ذومعنی انداز میں کہا تھا۔

سامعہ بھلا ان باتوں کا کیا جواب دیتی، وہ گاڑی سے باہر دیکھنے لگی تھی، سلیمان نے اسے بہت زبردست شاپنگ کرائی تھی، رات کو وہ لدی پھندی گھر آئی تھی، امی ناراض تھیں کہ اس نے دیر کر دی اب امی کو کیا بتاتی کہ اس کی سنگت میں وقت کا پتہ کہاں چلتا تھا، وہ سوچتی تھی، وقت ٹھہر جائے، نکاح سے رخصتی تک کا وقت بے حد حسین تھا، رائمہ اس کی شاپنگ دیکھ رہی تھی۔

''رنگ تو بہت مہنگی لگ رہی ہے اور تمام سوٹ بھی، ڈیزائنر کے ہیں، تم تو واقعی مالدار آدمی کی بیوی بن گئی ہو۔''

''ذرا جوتے دیکھیں میرے۔'' سامعہ نے کہا، رائمہ نے نظر اٹھا کر دیکھا، سیاہ رنگ کی بے حد نازک سی سینڈل اس نے پہنی تھی، جو اس کے گورے پاؤں میں بہت بھلی لگ رہی تھی۔

''کتنے کی ہے اور یہ تم پہن کر آئی ہو، خراب کر دو گی۔'' رائمہ باجی خفگی سے بولی۔

''یہ تین ہزار کی ہے اور سلیمان کہہ رہے تھے کہ یہ تمہارے پاؤں میں بہت اچھی لگ رہی

ہے، مت اتارو۔'' سامعہ نے شرمیلے انداز میں کہا تھا۔

''اُف...... یہ سلیمان بھی نہ ہر وقت رومانٹک فلموں کا ہیرو بنا رہتا ہے، خیر یہ سب چیزیں سمیٹ کر الماری میں رکھ دو، میں زیاد کو کھانا دے دوں۔'' رائمہ بولی۔

''میں بہت تھک گئی ہوں، آپ رکھ دو۔'' سامعہ لاڈ سے بولی۔

''اچھا میں رکھ دیتی ہوں، ویسے بھی تم ایک مہینے کی مہمان ہو۔'' رائمہ کی آنکھیں نم ہوئیں، سامعہ بھی افسردہ ہوئی تھی۔

''باجی چھوڑو میں کر لیتی ہوں۔'' سامعہ نے اس کے ہاتھ سے کپڑے لئے اور ہینگر کرنے لگی تھی۔

''تم اب کام کی عادت ڈال لو۔'' رائمہ بولی۔

''یہاں تو آپ نے میری عادتیں خراب کر دی ہیں۔'' سامعہ نے کہا۔

''یہ بھی ٹھیک کہا تم نے اب وہ تمہیں خود ہی سدھار دے گا۔''

''وہ ایسا نہیں ہے اسے ہر وقت گھر کے کاموں میں مشغول اپنے حلیے سے غافل عورتیں پسند نہیں ہیں۔'' سامعہ نے ناز سے کہا، رائمہ نے اسے دل ہی دل میں خوش رہنے کی دعا دی تھی۔

☆☆☆

زیاد کا دل بجھ کے رہ گیا تھا، وہ رات گئے جاگتا رہتا تھا، جاگ کر صحن میں ٹہلتا رہتا تھا، سامعہ وہ پہلی لڑکی تھی جو اسے بھائی تھی، جس کو دیکھ کر اس نے خواب بنے مگر اسے اس کے خوابوں کی تعبیر نہیں ملی تھی، وہ اداس تھا، اسے دکھ تھا، اس کی محبت اتنی ارزاں کیوں ٹھہری، سامعہ کے نزدیک، محبت میں تو بڑی طاقت ہوتی ہے، وہ اپنا آپ منوا لیتی ہے، مگر یہاں تو اس کے برعکس سامعہ نے اس کی محبت کو پہچانا بھی نہیں۔

امی رائمہ سے پہلے شادی کے حق میں نہیں تھیں مگر یہ بھی سچ تھا، رائمہ کے لئے کوئی مناسب رشتہ بھی نہیں مل رہا تھا، پڑوسن سلمٰی نے سمجھایا کہ رائمہ کے انتظار میں سامعہ کا رشتہ گنوانا عقلمندی نہیں ہے کیونکہ سلیمان کو شادی کی جلدی تھی، انتظار وہ کر نہیں سکتا تھا، سلیمان کے بعد پھر کوئی ایسا رشتہ آتا یا نہیں یہ بھی فکر کی بات تھی، سلیمان نے جہیز سے انکار کر دیا تو دیر کرنے کی کوئی بھی وجہ نہ رہی تھی۔

آج وہ عروسی جوڑا لینے سلیمان کے ساتھ آئی تھی، سلیمان بے حد خوش تھا، اگلے ہفتے ان کی شادی تھی، سب کچھ حسب خواہش ہو رہا تھا، وہ بہت ترنگ میں گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا، موسم بہت خوبصورت ہو رہا تھا، بادل گھرے ہو رہے تھے، سامعہ تو تھی خوبصورت موسم اور بارش کی دیوانی اس کا موڈ بھی بہت خوشگوار ہو جاتا تھا۔

تو موسم جانا پہچانا\
تو صندل کا پیڑ\
میں خوشبو کا چاہنے والا\
اک بے عکس پرندہ\
میرا سفر انجانا\
تیرے چہرے پہ لکھا ہے\
ایک اجالا خوابوں جیسا\
تجھ کو پڑھوں تو\
مجھ پر برسے رنگ\
گلابوں جیسا

آخر شادی کا دن بھی آ پہنچا، گھر میں افراتفری کا عالم تھا، وہ ہی ہنگامہ اور جلد بازی جو شادی والے سب گھروں میں نظر آتی ہے، سامعہ مایوں بیٹھی تھی، اس کی کالج فیلو حیران تھی، اتنی

جلدی اتنا شاندار رشتہ اسے کیسے مل گیا اس کا کریڈٹ انہوں نے اس کے ملکوتی حسن کو دیا تھا، سامعہ مزے سے ان کے تبصرے سن رہی تھی، رائمہ اور امی گھر کے کاموں میں ہلکان ہوگئی تھیں، اسفر اور زیاد باہر کے کاموں میں مصروف تھے، کچھ بھی تھا، وہ امیر لوگ تھے، امی کی خواہش تھی کہ بارات کا کھانا شادی ہال میں شاندار ہونا چاہیے، رائمہ کے لئے ڈالی کمیٹی ان کے کام آ رہی تھی۔

بالآخر بارات کا دن بھی آ پہنچا تھا، اپنے وجود میں خوشبو سمیٹے دولہناپے کا روپ سجائے زیورات اور قیمتی جوڑے سے آراستہ اس کا حسن آج چاند کو بھی مات دے رہا تھا، سرخ اور میرون لہنگے میں بہترین میک اپ کے ساتھ، وہ پرستان کی کوئی پری لگ رہی تھی، جس نے بھی دیکھا سراہے بنا نہیں رہ پایا تھا۔

رخصتی کے وقت وہ امی اور رائمہ سے مل کر روئی تو وہ بھی ضبط کھو گئیں۔

سلیمان اسے لے گیا، زیاد اسے دیکھتا رہ گیا، ساری رات زیاد نے دکھ میں جاگ کر کاٹی، اس کے غم کا کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا۔

حجلہ عروسی میں وہ کمرے کا جائزہ لے رہی تھی، بے حد خوبصورت کمرا تھا، قیمتی سامان سے آراستہ اس کی سجاوٹ قابل دید تھی، جب ہی دروازہ کھلا، سلیمان کو دیکھ کر وہ سیدھی ہوگئی تھی، سلیمان کے قریب آتے ہی کولون کی دلکش مہک نے سامعہ کے گرد گھیرا ڈالا تھا، وہ اس کا ہاتھ تھامے اس کی آنکھوں کو چھو رہے تھے اور پھسل کر اس کے لبوں پر اور اس کی صراحی دار گردن پر آ گئے تھے، اس کی پلکیں حیاء سے لرز رہیں تھیں۔

''سامعہ بہت حسین لگ رہی ہو۔'' وہ مخمور لہجے میں بولا تھا، سلیمان کا لمس اس کا دل دھڑکا رہا تھا، رات بیتی جا رہی تھی، دوسرے دن ولیمہ زبردست ہوٹل میں ہوا تھا، سامعہ کو خوش دیکھ کر سب مطمئن لگ رہے تھے، دن پر لگا کر گزر رہے تھے، سلیمان اس کے مہکتے قرب کا عادی ہو گیا تھا۔

دو دن بعد ان کی امریکہ کی فلائیٹ تھی، سامعہ اپنے میکے آئی تھی، امی اور رائمہ کی اداسی دیکھ کر وہ بھی اداس ہوگئی تھی، امی اور رائمہ اس سے جاتے سمے مل کر بہت روئیں، وہ بھی ضبط نہ رکھ سکی، زیاد اسے حسرت سے دیکھ رہا تھا۔

''آپ نے ہمارا بہت ساتھ دیا اس کے لئے آپ کا بے حد شکریہ۔'' سامعہ نے کہا۔

''اس میں شکریے کی کیا بات ہے میں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔'' زیاد طنز سے بولا، سامعہ چپ رہی۔

میری آنکھوں میں رات جلتی ہے
رات میں کئی خواب جلتے ہیں
دیئے جلتے ہیں
اسے یہ کیسے بتاؤں کہ
جاں نہ جلتی ہے
شب پگھلتی ہے
لمحہ لمحہ دل سلگتا ہے
دیئے جلتے ہیں

سامعہ کو لگا سلیمان بہت سوشل تھا، اس کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا، سامعہ نے اس کی مشکل آسان کر دی تھی، خود ہی جانے کے لئے اٹھ گئی حالانکہ آج پوری رات اس کا دل چاہا یوں ہی بیٹھی رہے، اپنوں سے دوری آسان تو نہیں ہوتی۔

وہ امریکہ ائرپورٹ میں بڑی خوشی سے اتری، وہ ہر چیز کو حیرت اور خوشی سے دیکھ رہی تھی۔

سلیمان نے لاک کھولا تو وہ اندر آئی، اپنا گھر دیکھنے کی اسے بڑی جلدی تھی، لیکن یہ کیا ایک کمرے کا تنگ و تاریک گھٹن زدہ فلیٹ اور اس کمرے سے منسلک نام کے کچن اور واش روم اس بوسیدہ کھنڈر کو دیکھ کر سامعہ کا دل گھبرا گیا۔

''سلیمان اتنا چھوٹا فلیٹ ہم یہاں رہیں گے؟''

''نہیں ہم وائٹ ہاؤس میں رہیں گے۔'' سلیمان نے اطمینان سے کہا تھا۔

''مگر یہ تو بہت چھوٹا ہے۔'' سامعہ رو دینے کو تھی، مگر سلیمان اطمینان سے لیٹ گیا۔

''اٹھو کچھ کھانے کو بنالو۔''

''آپ باہر سے لے آئیں میں بہت تھک گئی ہوں۔'' سامعہ بے زاری سے بولی۔

''یہاں بہت مہنگائی ہے۔'' سلیمان نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''تو۔'' وہ الجھی۔

''ہم عیاشی نہیں کر سکتے۔''

سامعہ تھکے قدموں سے سیلن زدہ کچن میں آ گئی تھی، انڈوں کا سالن بنایا، کھانا کھا کر چائے پی، سلیمان تو تھک کر سو گیا مگر سامعہ بے چینی سے جاگتی رہی تھی۔

☆☆☆

سلیمان اسٹور پہ سیلز مین تھا، اس کی تنخواہ معمولی تھی، اس میں بہت مشکل سے گزارہ ہوتا تھا، سامعہ بہت پریشان تھی، ایسی زندگی کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا، سلیمان صبح دس بجے جا کر رات دس بجے آتا تھا، وہ سارا دن بہت بور ہوتی تھی، زبان کا مسئلہ بھی تھا اور یہاں کے لوگوں کے پاس فرصت بھی کہاں تھی، بیٹھ کر اس کے دکھ سکھ سنتیں، ہر شخص محنت کرتا تھا، ہر شخص اپنے حال میں مست تھا، اس کا دل گھبرانے لگا تھا۔

”سلیمان! ہم پاکستان چلتے ہیں، یہاں اتنی تنگی بھی ہے اور میرا دل بھی نہیں لگتا، وہاں آپ کا کتنا بڑا گھر ہے۔“ سامعہ بولی۔

”سامعہ! وہ گھر میرے ابو کو گورنمنٹ کی طرف سے ملا ہے وہ وہاں جب تک کام کریں گے گھر ان کے پاس رہے گا، ریٹائرمنٹ کے بعد گھر چھوڑنا ہوگا، میں وہاں کیا کام کر سکتا ہوں، وہاں اگر پتہ چل جائے تو سب میرا مذاق اڑائیں گے، میری تعلیم بہت کم ہے، وہاں میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔“ سلیمان کی سچائی پر اسے دھچکا لگا تھا۔

”سلیمان ہم یہاں کب تک رہیں گے؟“ اس کا دل ڈوب گیا۔

”سامعہ کچھ نہیں کہہ سکتا، دس سال شاید، جب تک اتنے پیسے ہو جائیں میں وہاں کچھ کام کر سکوں۔“

”دس سال...... یہ تنہائی کا عذاب بھگتنا ہو گا۔“ وہ چلائی تھی اور اس دن بہت روئی تھی، اس کے سب خواب ریزہ ریزہ ہو گئے تھے، سلیمان نے اس کی دلجوئی کے بجائے اسے بری طرح ذلیل کیا۔

”میں سارا دن مشقت کرتا ہوں، تم فارغ بیٹھ کر کھاتی ہو، گھر تھکا ہارا آتا ہوں تو تم منہ بنا کر گلے شکوے کرتی نظر آتی ہو، بہتر ہے حالات سے سمجھوتہ کر لو۔“

سامعہ کے کرب کا اسے اندازہ نہیں تھا، اسے اپنا گھر امی، رائمہ باجی، اسفر ان لوگوں کی محبتیں شدت سے یاد آئیں، وہ بے ساختہ رو دئیں، یہاں کوئی اسے چپ کروانے والا نہیں تھا، جو ہم سفر تھا جس کے لئے سب چھوڑ کر آئی تھی، وہ اس کے غم سے بے خبر خراٹے لے کر سو رہا تھا۔

☆☆☆

زیاد کب سے دیکھ رہا تھا، رائمہ کے رشتے آنے کا سلسلہ اور بات نہ بننے کا سلسلہ پرانا ہو گیا تھا، وہ حیران تھا کہ اتنی بہترین اور مخلص لڑکی لوگ اتنے بیوقوف کیوں ہوتے ہیں، وہ سوچتا تھا، خوش نصیب ہو گا وہ شخص جو رائمہ کو اپنائے گا اور نا قدرے ہیں وہ لوگ جو ہیرا صفت لڑکی کو پہچان پائیں، پھر وہ چونک گیا، اس نے سوچا، سامعہ تو اسے مل نہیں سکی، رائمہ کی تو وہ قدر کر سکتا ہے، جب کے ایک سال سے اس کے ساتھ رہتے ہوئے وہ جان گیا تھا کہ زندگی کے سفر میں دھوپ چھاؤں سب کے ساتھ آتی ہے اس میں رائمہ جیسی لڑکی ہی بہترین بیوی ثابت ہو سکتی ہے۔

اس نے اپنے ابو سے بات کی، انہوں نے خالہ سے رشتہ مانگا، خالہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، رائمہ کے لئے کتنی بار چکے سے ان کے دل میں زیاد کا خیال آیا تھا، لیکن لڑکی کی ماں ہونے کے ناطے خود سے کہہ کر اپنی بیٹی کو کیسے ہلکا کر سکتی تھی۔

آج ان کی دلی خواہش پوری ہو گئی تھی، وہ شکرانے نوافل پڑھ رہی تھیں۔

دوسری طرف رائمہ تھی اس نے کبھی بھی زیاد یا کسی کے متعلق اس طرح سے نہیں سوچا تھا، لیکن اب وہ خوش بھی تھی کیوں کے زیاد بلاشبہ ایک شریف النفس ذمہ دار اور محنتی مرد تھا، اس نے ہمیشہ ان کا خیال رکھا تھا، رائمہ اسے کزن کی حیثیت سے پسند کرتی تھی، اب وہ ہم سفر بنے جا رہا تھا تو وہ بہت خوش تھی۔

سامعہ کو فون پہ اطلاع دی تھی، اسے بے حد خوشی ہوئی، یہاں آ کر اسے اندازہ ہوا کے زیاد ایک بہترین لڑکا تھا، وہ سلیمان کو جو سمجھتی تھی وہ اس کے برعکس نکلا تھا۔

سلیمان نے اسے بھی ایک سپر اسٹور پہ سیلز

گرلز کی جاب دلوادی تھی۔
اسے جاب کا بالکل بھی شوق نہیں تھا، مگر وہ جاب کررہی تھی، صبح سے شام تک کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں تھک جاتیں تھیں، وہ رات کو واپس آتی تو فلیٹ کی صفائی اور دیگر کاموں میں جت جاتیں، سلیمان اس کی سیلری سے فلیٹ کا رینٹ دے دیتا، جو تھوڑے بہت بچ جاتے اس سے سودا سلف لے لیتا، وہ صبح سے شام تک کما کر بھی خالی ہاتھ رہ جاتی تھی، اس کا بے حد دل چاہ رہا تھا کے وہ رائمہ کے لئے اسفر کے لئے تحائف بھیجے، مگر سلیمان نے صاف منع کردیا تھا، اس کا اپنی کمائی پہ بھی حق نہیں تھا، وہ تڑپ جاتی تھی، لیکن فون پہ یہ ہی کہتی تھی، وہ بے حد خوش ہے۔

رائمہ اور زیاد کی شادی ہو گئی تھی، رائمہ سے شادی کے بعد زیاد کو احساس ہوا، حسین صورت ثانوی شے ہے، رائمہ نے اسے ہر طرح کا سکھ دیا، وہ بہت خوش تھا اور رائمہ کا بہت خیال رکھتا تھا اور رائمہ کا بہت خیال رکھتا تھا، رائمہ کو خوش دیکھ کر امی بہت خوش تھیں، البتہ سامعہ کو سب دیکھنے کو ترس گئی تھی۔

سامعہ زندگی سے تھکنے لگی تھی، یہاں اللہ نے اس پر رحمت کردی، اس کی بیٹی ہوئی تھی، گو کہ سلیمان ابھی بچوں کے حق میں نہیں تھا، لیکن اس معاملے میں سامعہ اڑ گئی تھی، سلیمان چپ رہا وہ بچی کو ڈے کیئر سینٹر چھوڑ کر جاب پر جاتی تھی، لیکن اسے جینے کا سہارا مل گیا تھا، ایک نئی امنگ پیدا ہوگئی تھی، اب اسٹور پہ اس کی ٹائمنگ کم ہو گئی تھی، وہ زیادہ وقت اپنی بیٹی کے ساتھ گزارتی تھی۔

اس طرح وقت گزرتے گزرتے دس سال کا طویل عرصہ گزر گیا، سلیمان نے پیسے جمع کر لئے تھے، اب وہ پاکستان آ رہے [illegible] سامعہ خوشی سے پہلی والی سامعہ نظر آ رہی تھی۔

پاکستان آکر سلیمان نے اپنا چھوٹا سا ریسٹورنٹ بنایا اور ایک کرائے پر فلیٹ لے لیا، بہت بھاری قیمت چکائی تھی، اس کے شوق، خواہشیں سب مر گئیں تھیں، وہ بس یوں خوش تھی وہ اپنوں کے قریب ہے۔

امی جان اب بوڑھی ہو گئی تھیں، اسفر کی شادی ہو گئی تھی، رائمہ زیادہ کے ساتھ خوش تھی، ان کے تین بچے تھے، سامعہ اب مطمئن تھی۔

خزاں کا موسم طویل تھا لیکن گزر گیا، اب سارے گلاب لمحے بہکنے لگے تھے۔

"انتقال پر ملال"

ہماری پیاری مصنفہ کنول ریاض کے والد ماجد خواجہ ریاض احمد گزشتہ ماہ قضائے الٰہی سے انتقال کر گئے۔

انا للہ وانا علیہ راجعون

ادارہ حنا غم کی اس گھڑی میں کنول ریاض کے ہمراہ ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے والد کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے اور ان کے اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔

تحسین اختر

سب کی اک اوقات
عشق نہ پوچھے ذات
بالکل بھول گئے
کرنی تھی کیا بات
سستا کردے گی
زر کی یہ افراط
اب سے تیرے ہیں
میرے دن اور رات

سچے جذبوں سے
مہنگی ہو گئی دھات
اب کے خوب ہوئی
بن موسم برسات
کٹ ہی جاتی ہے
کیسی بھی رات
باسی ہوئی جائے
دل میں رکھی بات

ناول

کچی ڈور میاں
کب تک دیتی ساتھ
گرہیں کھولے گا
جانے کب وہ ہاتھ
کیسے اجڑ گئے؟
خوابوں کے باغات

ریحان گردیزی راشن پانی اور وہ وہ سامان جو وہ ساتھ لائے تھے جھونپڑی والوں میں تقسیم کر کے واپس اپنی گاڑی کی طرف جا رہے تھے مگر من کی بے کلی اور بے چینی کسی طرح بھی کم ہونے میں نہ آتی تھی، دل کا درد بڑھ جاتا تو وہ اس طرف آ نکلتے مگر جانے اس درد کی نوعیت کیا تھی کہ کسی طرح بھی کم ہونے میں نہ آتا تھا۔

☆☆☆

وقت کہیں قریب ہی کھڑا مسکرا رہا تھا، انہوں نے اس وقت کو محسوس کیا اور شرمندگی سے

سر جھکا لیا تھا۔

''صاحب! تو کتنا سخی ہے تمہارے دل میں غریبوں کے لئے کتنا پیار ہے میں تمہیں بتاؤں۔'' وقت نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سرگوشی کی تھی۔

''نہیں نہیں کیا بتاؤ گے، پلیز کچھ مت بولنا، میں غلطیوں کے ازالے کے لئے تو یوں دربدر گھومتا رہتا ہوں کہ شاید کہیں سے میرے دل کو تسلی اور خوشی مل جائے، تم پھر کیوں مجھے پریشان کرتے ہو، بولو جواب دو، میں تمہیں سمجھ چکا ہوں، اے وقت، میں تمہیں جان چکا ہوں، جاؤ اب میرا پیچھا چھوڑ دو۔'' وہ نادیدہ وقت کے آگے ہاتھ جوڑ کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے تھے۔

☆☆☆

سمیکہ ریحان صاحب کی اکلوتی بیٹی تھی، بے تحاشا دولت نے اس کو مغرور بنایا ہی تھا اس پر اس کی خوبصورتی نے سونے پہ سہاگے کا کام کیا تھا، سمیکہ کو اپنے سوا کوئی نظر نہ آتا تھا، پھر ریحان گردیزی کے بے جا لاڈ پیار نے اسے ایک شان اور بارعب انداز بخش دیا تھا، وہ مدمقابل کو مسحور کرنا جانتی تھی وہ جہاں جاتی اک جہاں کو اپنا گرویدہ بنا لیتی، جب بھی وہ وہاں سے ہو کر آتے یونہی لٹے پٹے اور خالی ہاتھ آئے، وہ دل کی بے کلی سے گھبرا کر وہاں جاتے تھے مگر یہ بے کلی تو واپس آ کر بھی یونہی رہتی تھی اور شاید تاعمر ایسے ایسے ہی رہنا تھا۔

سمیکہ کے گرجنے برسنے کی آوازیں باہر تک آ رہی تھیں، آج جانے کس کی شامت آئی ہوئی تھی، وہ اندر داخل ہوئے تب بھی اس کے گرجنے برسنے میں کمی نہ ہوئی تھی، وہ شریفاں پر برس رہی تھی جس نے اس کے پسندیدہ سوٹ کو استری کرتے ہوئے جلا دیا تھا۔

''سمیکہ! کیا ہو گیا ہے تمہیں کیوں چیخ رہی ہو بیٹا؟''

''بابا! آپ کو پتہ ہے، اس نے میرا سوٹ جلا دیا ہے جو کل میں نے تابندہ کی برتھ ڈے کے لئے خریدا تھا۔'' وہ انہیں بتاتے ہوئے بھی شریفاں کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''سمیکہ! کم آن بیٹا، تمہیں کون سا کپڑوں کی کمی ہے، تمہارے پاس ڈھیروں ڈھیر سوٹ ہیں تم کوئی سا بھی پہن لو۔'' انہوں نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

''بابا آپ نے کتنی آسانی سے کہہ دیا دوسرا پہن لو، کل سارا دن میں نے بوتیکو کے چکر لگائے تب جا کر کہیں مجھے وہ سوٹ پسند آیا تھا۔''

''اچھا تم ایسا ہی اور لے آؤ۔''

''نہیں اب میں برتھ ڈے میں ہی نہیں جاؤں گی، آپ نے ان لوگوں کو سر پر چڑھایا ہوا ہے یہ کوئی بھی کام ڈھنگ سے کر ہی نہیں سکتے۔'' اس کا غصہ کسی طرح بھی کم ہونے میں نہ آ رہا تھا، وہ غصے میں اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئی تھی، ریحان صاحب پہلے ہی بہت تھکے ہوئے اور پریشان تھے، اب سمیکہ کا موڈ بھی آف ہو گیا تھا اور ان کی پریشانی میں مزید اضافہ۔

☆☆☆

اگلی صبح آفس میں ریحان گردیزی کی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر زبیر عباسی کو تشویش نے آ گھیرا تھا۔

''ریحان تم کل پھر وہاں گئے تھے۔'' اور ریحان آنکھیں چرا گئے تھے۔

''یار کب تک آخر یوں بے چین رہو گے۔''

ریحان کا کوئی دکھ زندگی کا کوئی گوشہ زبیر

عباسی سے پوشیدہ نہ تھا، وہ بچپن کے دوست تھے اکٹھے پڑھا اکٹھے جوان ہوئے، ریحان گردیزی ہالینڈ سے ایم بی اے کرکے لوٹے تھے اور باپ کے جمے جمائے کاروبار کو سنبھال لیا تھا، زبیر عباسی نے اپنی زمینیں بیچ کر اس کی کمپنی میں شیئرز خرید لئے تھے کہ اس کی شہری طبیعت سے زمینیں میل نہیں کھاتی تھیں، یوں ان دونوں نے مل کر کاروبار شروع کیا اور آج شہر سے باہر پورے ملک میں ان کا ایک نام تھا، لوگ ان کو جانتے تھے، کاروباری حلقوں میں ان کی ایک پہچان تھی لوگ ان کے ساتھ کام کرنا باعث فخر سمجھتے تھے۔

زبیر جانتا تھا ریحان نے کل ساری رات پھر یادوں میں بتادی ہوگی۔

''تم بھول کیوں نہیں جاتے اسے۔'' زبیر نے ہمیشہ کا دھرایا ہوا سوال ایک بار پھر اس کے سامنے رکھ دیا تھا، یوں جیسے وہ کوئی کوہ پیما تھا اور ایک بار پھر مشکل ترین چوٹی سر کرنے اسے بھیجا جارہا تھا۔

''ایسا کرو......'' زبیر کی بات منہ میں ہی تھی کہ فون کی تیز بیل نے ان کو خاموش کروا دیا، ریحان نے فون اٹھایا تو دوسری طرف سمیکہ تھی۔

''بابا! میں تابندہ کے ساتھ اس کے گھر جا رہی ہوں، شام تک لوٹوں گی۔''

''او کے جلدی آجانا۔''

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔'' جیسے ہی انہوں نے فون رکھا زبیر پھر بول اٹھا تھا۔

''چھوڑو یار تم تو کہتے ہی رہتے ہو، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔'' ریحان نے اس کا مذاق اڑایا تھا۔

وہ دل میں سمیکہ کے شکر گزار ہو رہے تھے کہ اس نے بروقت فون کرکے انہیں بچا لیا تھا، نہ زبیر عباسی کم از کم دو گھنٹے ان کی جان نہ

چھوڑتا، وہ کب چاہتا تھا کہ اس کا جگری دوست یوں پریشان ہو یہ اور بات کہ وہ اپنی تمام تر مخلصی اور کوشش کے باوجود ریحان کے لئے کچھ نہ کر سکتا تھا۔

''تم ایسا کرو کہ گھر جاؤ اور جا کر آرام کرو، ساری رات جاگتے رہے ہو، اس حالت میں کام خاک ہوگا تم سے۔''

''ٹھیک ہے، میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ گھر جا کر تھوڑی دیر آرام کرلوں۔'' وہ اپنی سیٹ سے اٹھتے ہوئے بولے تھے۔

ریحان نیند پوری کرنے گھر آئے تھے لیکن گھر کی تنہائی ملی تو پھر اس کی یادوں نے مل کر ان پر حملہ کر دیا تھا، وہ ایک بار پھر ماضی میں پہنچ گئے تھے، جہاں وہ تھی جو دل کے کونوں کھدروں سے نکل کر سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

ہر پل دھیان میں بسنے والے لوگ افسانے ہو جاتے ہیں
آنکھیں بوڑھی ہو جاتی ہیں خواب پرانے ہو جاتے ہیں
ساری بات تعلق والی جذبوں کی سچائی تک ہے
میل دلوں میں آجائے تو گھر ویرانے ہو جاتے ہیں
موسم عشق کی آہٹ سے ہی ہر اک چیز بدل جاتی ہے
راتیں پاگل کر دیتی ہیں دن دیوانے ہو جاتے ہیں
دنیا کے اس شور نے امجد کیا کیا ہم سے چھین لیا ہے
خود سے بات کیے بھی اب تو کئی زمانے ہو جاتے ہیں

☆☆☆

سمیکہ کالج سے گھر واپس آ رہی تھی کہ عجیب بات ہوگئی، پہلے اسے ڈرائیور لاتا اور لے جاتا تھا مگر جب سے اس نے کالج جانا شروع کیا تھا اسے ڈرائیور کا دم چھلا اچھا نہ لگتا تھا وہ خود ڈرائیونگ کرتی اور خود ہی کالج آتی جاتی تھی، گھر کے قریب ہی دو عورتوں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا تھا، اپنے حلیے سے وہ خانہ بدوش نظر آ رہی تھیں، سمیکہ کو ایسے لوگوں سے بہت چڑ تھی، ایک تو گرمی دوسرا گھر پہنچنے کی جلدی اور اوپر سے یہ مانگنے والیاں جان نہیں چھوڑتی تھیں، وہ ان سے جان بچا کر نکل جانا چاہتی تھی کہ ان میں سے ایک تو تقریباً اس کی گاڑی کے سامنے آ گئی آخرا سے بریک لگانا ہی پڑے۔

''کیا بات ہے، کیوں تنگ کر رہی ہو۔'' وہ شیشہ نیچے کرتے ہوئے پوچھنے لگی تھی۔

''بی بی مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔'' ان میں سے ایک بولی۔

''کیا بات کرنی ہے۔'' وہ تیوریاں چڑھا کر بولی تھی اور ساتھ ہی پرس سے پچاس کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا تھا، وہ جانتی تھی پہلے کوئی من گھڑت قصہ سنائیں گی اور پھر پیسے مانگیں گی اس نے کوفت سے بچتے ہوئے نوٹ ان کی طرف بڑھایا تھا۔

''نہیں بی بی ہمیں پیسے نہیں چاہیے۔'' سمیکہ کو حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

''پیسے نہیں چاہیے تو کیا چاہیے پھر، مجھے کیوں روکا ہے۔'' اسے وہ کچھ مشکوک سی لگیں۔

''بی بی خدا کے واسطے ہماری بات سن لو۔'' سمیکہ کسی سے ڈرتی تو نہیں تھی پھر اس کا گھر بھی قریب ہی تھا، اس کی ایک چیخ پر اس کا گارڈ دوڑ کر آ سکتا تھا، اس نے جھنجھلاتے ہوئے گاڑی سائیڈ پر روکی اور نیچے اتر آئی۔

''ہاں جلدی بتاؤ کیا بات ہے؟ گرمی سے جان نکلی جا رہی ہے۔'' اس نے ٹشو سے پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔

''تمہارے باپ کا نام ریحان بابو ہے نا اور وہ بڑے سے سفید گیٹ والا گھر تمہارا ہے نا؟'' ان میں سے ایک تصدیق کرنے والے انداز میں بولی تھی۔

''ہاں میرے بابا کا نام ریحان ہے اور وہ

گھر بھی میرا ہے۔''

''تم ان کی بیٹی ہو، اکلوتی بیٹی ہے نا؟''

''جب میرے بابا کا نام ریحان ہے تو میں ان کی بیٹی ہوئی نا، کیسی احمقوں جیسی باتیں کر رہی ہو تم دونوں۔'' سمیکہ کو ایک دم سے غصہ آیا تھا۔

''کیا صرف یہی پوچھنے کے لئے مجھے بھری دوپہر میں روکا ہے، واٹ نان سینس۔'' وہ گاڑی کی طرف بڑھنے لگی جب ایک نے پھر بڑی لجاجت سے پکارا تھا۔

''بیٹا!''

''ہاں کیا بات ہے؟'' وہ مڑی۔

''اور ہاں پیچھے ہٹ کر بات کرو پتہ نہیں کب سے نہائی نہیں ہو، کپڑے نہیں بدلے۔''

''بیٹا تم اپنی ماں کو جانتی ہو؟''

''ہاں تو کیا نہیں جانتی ہوں اور میری ماں اب اس دنیا میں نہیں ہے۔'' وہ اکھڑے ہوئے انداز میں بولی تھی، اس کا اتنا کہنا تھا کہ ان دونوں نے رونا شروع کر دیا۔

''اس کا نام ریشم تھا، وہ تمہیں پیدا کرتے ہی مر گئی تھی وہ بدنصیب ہماری بہن تھی۔'' سمیکہ کو لگا کہ اس کے پاس ہی کہیں دھماکا ہوا ہے جس نے اس کی سماعتوں کو مفلوج کر دیا ہے۔

''کیا بکواس کر رہی ہو، میرا یا میری ماں کا تم لوگوں سے کیا تعلق، وہ سامنے میرے باپ کا محل نما گھر دیکھ رہی ہو نا اور اپنی حیثیت بھی دیکھو، عجیب لوگ ہو تم مانگنے پر آتے ہو تو اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آتے ہو۔'' وہ چلائی تھی۔

''ہمیں جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت، ہمیں تمہارے سے کیا لینا دینا، میں تو اس زیبو کو کہہ رہی تھی کہ ہمیں گڑیا کو ... بتانا چاہیے لیکن یہ تو پاگل ہے، کہ گڑیا ہماری ریشو کی نشانی ہے تمہیں روز دیکھتے ہیں آتے جاتے، آج اس پگلی سے رہا نہ گیا تو تمہیں آواز دے بیٹھی۔'' ان میں سے جو ذرا عمر میں بڑی اور کم گو سی لگ رہی تھی اس کے چلانے پر بولی تھی۔

سمیکہ کا ذہن اس وقت کہیں اور بھٹک رہا تھا بابا کا جھونپڑیوں میں جانا، چیزیں بانٹنا اور غریبوں سے خاص ہمدردی، نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، ان کی تو عادت ہے، اس نے اپنی بات کی خود ہی تردید کی تھی۔

''دیکھو اگر تم لوگوں نے مجھ سے جھوٹ بولا تو اچھا نہیں ہو گا، میں تمہیں تھانے میں بند کروا دوں گی۔'' اس نے انہیں ڈرانے کی کوشش کی تھی۔

''آ زیبو چلو یہاں سے، مل لیا نا گڑیا سے، ریشو کی بیٹی ہے، اری اس کی اندر خون تو اس شہری بابو کا ہے نا، جو اس نے ہماری بہن کے ساتھ کیا وہی اس کی بیٹی ہمارے ساتھ کرے گی۔'' وہی عورت پھر بولی تھی۔

''اچھا ادھر آؤ اور گاڑی میں بیٹھو اور مجھے ساری بات بتاؤ۔'' اب گرمی کا احساس پیچھے رہ گیا تھا اب ان کے کپڑوں سے آنے والی بو کی بھی پرواہ نہیں تھی، صرف تجسس تھا۔

☆☆☆

اس نے گھر میں آتے ہی بیگ ایک طرف پھینکا اور ریحان گردیزی کے کمرے میں گھس گئی، بھوک، پیاس اور تھکاوٹ کا احساس تو ان دونوں کی باتوں سے ختم ہو چکا تھا، اس نے بابا کے کمرے کی تلاشی لینا شروع کر دی، وہ کوئی ثبوت چاہتی تھی، اس نے دس بارہ ڈائریوں میں سے سرخ رنگ کی سب سے بوسیدہ ڈائری اٹھائی اور تیزی سے اس کے ورق پلٹنا شروع کر دیئے، وہ جانتی تھی کہ اس کے بابا باقاعدگی سے ڈائری لکھتے ہیں، دو تین صفحوں کے بعد اسے ریشم کا نام لکھا

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L.5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

نظر آ گیا، اس نے وہ ڈائری اٹھائی اور اپنے کمرے میں آ گئی۔

وہ جوں جوں ڈائری پڑھتی گئی حقیقت روز روشن کی طرح اس پر عیاں ہوتی گئی، یہ ان دنوں کی بات ہے جب ریحان گردیزی کی عمر خواب دیکھنے، سپنے سجانے اور ہر سنجیدہ بات کو ہنسی میں اڑا دینے کی تھی جسے دوسرے لفظوں میں جوانی کہا جاتا ہے، ان کی دو بہنیں تھیں جوان سے بڑی تھیں اور اپنے اپنے پیا گھر سدھار چکی تھیں، ان کا ایک چھوٹا بھائی کم سنی میں ہی وفات پا چکا تھا اس لئے اب وہ اکیلے ہی اپنے والدین کی آنکھوں کا تارا تھے، باپ کا وسیع کاروبار، بے تحاشا دولت ان کے لئے ہی تو تھی، سو بے فکری سے بے فکری تھی، اونچے لمبے سرخ و سفید اور شربتی آنکھوں والے ریحان گردیزی کو دیکھ کر کتنی ہی لڑکیاں آہیں بھرا کرتیں اور ان کی ہمسفری کے خواب دیکھا کرتی تھیں، مگر وہ کم ہی کسی پر توجہ دیتے تھے۔

ایک دن جنت جو ان کی پرانی ملازمہ تھی ایک لڑکی کو لے کر اس کا نام ریشم ہے اور بی بی جان سے درخواست کی کہ یہ بہت غریب لوگ ہیں جگہ جگہ پھرتے اور اپنا رزق تلاش کرنے والے، اس کی ماں مر چکی ہے یہ سب سے بڑی ہے، میں اسے صفائی وغیرہ کے لئے یہاں لائی ہوں۔

بی بی جان ایک نیک دل خاتون تھیں انہوں نے پرانی ملازمہ کی گارنٹی پر ریشم کو صفائی وغیرہ کے لئے رکھ لیا۔

ریشم صرف نام کی ریشم نہ تھی بلکہ وہ سراپا ریشم تھی، نازک سا بدن، لچکیلی کمر، کالی سیاہ آنکھیں رنگ بہت زیادہ سفید نہیں لیکن اتنا چمکتا ہوا کہ اس کے میلے چیلے کپڑوں میں بھی جس کی نظر ایک دفعہ اس پر پڑ جاتی دوبارہ ہٹنا بھول جاتی، اس کی بے تحاشا خوبصورتی آڑے آتی تھی، گلی گلی پھرتے ہوئے لوگ اس کو دیکھتے آوازے کستے اور بعض منچلے تو اس کی جھونپڑی تک پہنچ جاتے، وہ بہت نازک مزاج تھی اس سے لوگوں کی گندی نظریں برداشت نہ ہوتی تھیں، اس لئے اس نے محنت کرنے کے لئے گلی گلی پھرنے کی بجائے ایک ہی گھر کا انتخاب کیا تھا، وہ بڑی خوشی محنت اور لگن سے سارے کام کرتی تھی بی بی جان اس کے کام سے بہت خوش تھیں۔

اس دن وہ سرف ڈال کر پورچ دھو رہی تھی جب ریحان گردیزی کی گاڑی آ کر رکی تھی اور وہ سرعت کے ساتھ گاڑی سے نکل کر اندر کی طرف جانے لگا تھا جب سرف والے پانی سے ریحان کا پاؤں پھسلا تھا اور اس نے کمال مہارت کے ساتھ پورچ کے پلر کو تھاما تھا اور خود کو بمشکل گرنے سے بچایا تھا، ریشم جو اس صورت حال کی عینی شاہد اور ذمہ دار بھی تھی ریحان گردیزی سے ڈرنے کی بجائے قل قل کر کے ہنسنے لگی تھی، ریحان جو تب تک خود کو سنبھال چکا تھا اب اس جھرنے جیسی ہنسی کی طرف متوجہ ہوا تھا اور آج شاید پہلی بار اس نے ریشم کو دیکھا تھا اور دیکھتا ہی رہ گیا تھا، اس لڑکی کی آواز تھی یا کوئی پہاڑی گیت جو ساز کی طرح بج رہی تھی اور وہ خود کوئی جادوگرنی ہی تھی جو نہایت رف سے حلیے میں بھی اس کے دل کی تمام تر دیواریں گرا کر اندر گھستی چلی جا رہی تھی، ریشم کی خوبصورتی اور معصومیت تو عورتوں کو پتھر بنا دیا کرتی تھی ریحان تو پھر مرد تھے اور عمر کے اس حصے میں بھی جہاں دل کے تار کسی کو دیکھ کر خود بخود بجنے لگتے ہیں، باہر بارن بجا تھا اور وہ ہوش و حواس کی دنیا میں لوٹے تھے

اور پھر خود ہی اندر کی طرف بڑھ گئے تھے جبکہ ریشم دوبارہ اپنے کام میں مگن ہو گئی تھی۔

''کون تھی یہ؟'' بہت دیر تک یہ سوال دماغ میں کرولاتا رہا تھا۔

اور پھر تمام تر مصروفیات پس پشت ڈال کر وہ نہ صرف شام تک گھر میں ہی ٹکے رہے تھے بلکہ یہ بھی جان گئے تھے کہ وہ نئی کام والی تھی اور اس کا نام ریشم تھا۔

''ریشم!'' نام کیا تھا اک نرماہٹ سی ذہن میں گھل گئی تھی۔

''ریشم!'' محبت کا اک تھان تھا جو کھلتا چلا گیا تھا اور ان کو اپنی لپیٹ میں لے بیٹھا تھا۔

''ریشم!'' اک انہونی تھی جو ہو چکی تھی۔

''ریشم!'' اک جھرنا تھا اک ساز تھا جو سماعتوں میں رس ٹپکاتا تھا۔

عمر کا اک حصہ ہالینڈ جیسے ملک میں گزارنے والے اور جانے کہاں کہاں گھومنے والے کا دل آیا بھی تھا تو ایک چھوٹے سے شہر کی اک عام سی لڑکی پر، مگر جواب عام کہاں رہی تھی۔

اہل نظر کی آنکھ میں تاج و کلاہ کیا
سایہ ہو جن پہ درد کا ان کا پناہ کیا
ہڑا ہے اک نگاہ پہ سارا مقدمہ
کیسے وکیل کون سا منصب گواہ کیا
کیا دل کے بعد آبروئے دل بھی رول دیں
دکھلائیں اس کو جا کے یہ حال تباہ کیا
کیسے کہیں کہ کر گئی اک ثانیے کے بیچ
جادو بھری وہ آنکھ وہ جھکتی نگاہ کیا

☆☆☆

دنوں کا وہی ہیر پھیر تھا مگر بدل گیا تھا تو ریحان کا وقت، بہت کم گھر میں ٹکنے والا اب زیادہ وقت گھر میں ہی گزارنے لگا تھا، وہ ریشم کو گھر میں چلتے پھرتے کام کرتے آتے جاتے دیکھتا اور دیکھتا ہی رہ جاتا۔

''ریشم چائے یہیں لے آؤ۔'' بی بی جان اور ریحان ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے تھے جب بی بی جان نے اسے آواز دی تھی، وہ چائے کی ٹرے اٹھا کر لے آئی تھی، بی بی جان کو چائے دینے کے بعد جب اس نے ریحان کو کپ پکڑانا چاہا تو ان کا دھیان کہاں تھا خود ان کو بھی خبر نہ تھی سو کپ پر ان کی گرفت کمزور ہوئی، چائے چھلکی اور ریشم کے پاؤں کو جلا گئی، ریشم نے بس سی کی آواز نکالی جبکہ ریحان کے دل پھپھولے سے جل اٹھے تھے۔

''اوہ سوری۔'' وہ ٹشو پیپر لے کر فوراً اس کے پاؤں پر جھکا تھا جہاں چائے گری۔

اپنی قسمت پر نازاں تھی، ریشم مالک کو جھکتے وہ بھی رعب داب والی ماں کے سامنے کب دیکھ سکتی تھی اس نے ایک لمحہ لگایا تھا اور منظر سے غائب ہو گئی تھی، یہ الگ بات کہ معتبر ہاتھوں کا لمس پاؤں کو تا دیر چومتا رہا تھا۔

''بے چاری کا پاؤں جل گیا۔'' بی بی جان کا تبصرہ تھا اور یہ خبر نہ تھی کہ ملازمہ کا تو محض پاؤں ہی جلا ہے اور بیٹے کا دل آگ میں جا پڑا ہے۔

ریشم جوان تھی اور جذبات و احساسات سے لبریز دل رکھتی تھی اس کی عمر بھی تو ایسی تھی خواب دیکھنے کی، رنگوں سے باتیں کرنے کی، یہ الگ بات کہ جھونپڑیوں میں پلنے والے خواب دیکھ سکتے ہیں انہیں تعبیر مشکل سے ہی ملتی ہے، وہ ریحان بابو کی آنکھوں سے نکلنے والی ست رنگی محبت کی شعاعوں کو خود پر پڑتے کئی دنوں سے دیکھ رہی تھی اور اب انجان نہ رہی تھی، مگر وہ زمین اور آسمان کا فرق جانتی تھی، اسے پتہ تھا کہ ٹاٹ میں مخمل کا پیوند کبھی نہیں لگتا، بڑی بات تھی کہ ان لوگوں نے اسے اپنے قدموں میں جگہ دی تھی وہ اپنی حیثیت بخوبی پہچانتی تھی اس کے برعکس

ریحان ٹھہرا تھا اس چھوٹی سی سلطنت کا بادشاہ، ایسے اس بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ ریشم کیا سوچتی ہے اور دنیا کیا سوچتی ہے اسے تو ریشم کی معصومیت بھاتی، کالی آنکھیں مسحور کرتیں، اس کی لمبی ناگن جیسی چوٹی میں اپنا دل اٹکتا ہوا محسوس ہوتا، وہ تو اس سے محبت کرنے لگا تھا ایسی محبت جو کچھ نہیں دیکھتی بس اگلے بندے کو آسیب بن کر چمٹ جاتی ہے۔

جلتا بلتا کوئی صحرا تھا اور وہ پپڑی زدہ ہونٹوں کے ساتھ صحرا کے بیچوں بیچ بیٹھی تھی، پیاس سے اس کا برا حال تھا حلق میں جیسے کانٹے اگ آئے تھے کہ ریحان بابو ایک گھوڑے پہ سوار آئے تھے اور اس کے ہاتھوں کی چھاگلی میں پانی کی دھار نکالنے لگے تھے، وہ شکر گزار نظروں سے اپنے ہاتھوں کو روک سے ٹھنڈا میٹھا پانی پینے لگی تھی، پھر وہ گھوڑے سے نیچے اترے تھے اور اس کے قریب ہی زمین پر بیٹھ گئے تھے اور اس کی چادر کا پلو اٹھا کر اس کے ہونٹوں سے چھلکا پانی صاف کرنے لگے تھے کہ اک جھٹکے سے ریشم کی آنکھ کھل گئی تھی، پپڑی زدہ ہونٹ ویسے ہی خشک تھے اور پاس ریحان بابو کا سایہ تک بھی نہ تھا، وہ چارپائی سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی، خواب تھا اور اب خواب ہی ہو گیا تھا۔

رفتہ رفتہ ریحان کی آنکھوں سے نکلتی محبت کی شعاعیں اسے اپنے حصار میں لینے لگیں، وہ کام کرتے کرتے رک جاتی، اردگرد ریحان بابو کی خوشبو محسوس کرتی اور پھر کام شروع کر دیتی، ایسا اس کے ساتھ دن میں کئی بار ہوتا، وہ خود کو بہت ڈانٹتی لیکن اس دل وحشی کا کیا کرتی جو ڈانٹ سن کر بھی چوری چوری ریحان ریحان ہی پکارے جاتا۔

رات کو وہ اپنی جھونپڑی میں لیٹتی تو سارے دن کی تھکن کے باوجود آنکھیں بند ہونے کے نام نہ لیتیں، وہ حیران تھی کہ ان کی جھونپڑی میں پانچ سات افراد کے بعد اتنی جگہ نہیں ہوتی کہ پاؤں بھی رکھا جا سکے پھر ریحان بابو اپنی شان اور وجاہت کے ساتھ کیسے چھوٹی سی جھونپڑی کے کونے کونے میں براجمان ہو جاتا ہے، اسے وہ دن جب ریحان بابو نے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا اچھی طرح یاد تھا، بھلا وہ اسے کیسے بھول سکتی تھی، جنت کو بخار تھا اور وہ کام پر نہیں آئی تھی، سو ریحان کے کمرے کی صفائی بھی اسے ہی کرنا پڑی تھی، ریحان لاکھ ابالی تھا لیکن بی بی جان کا احترام اور رعب اتنا تھا کہ اس کی بھی جرأت نہ ہوئی تھی کہ ان کے سامنے کوئی بات بھی کر سکتا، آج تو جنت کے بیمار ہونے پر جیسے اس کی مراد بر آئی تھی، اس نے جیسے ہی بی بی جان کو اِدھر اُدھر ہوتے دیکھا جھٹ اپنے کام میں مصروف ریشم کے سر جا پہنچا تھا۔

''ریشم تمہیں دیکھتے ہی مجھے کیا ہو جاتا ہے یہ مجھے نہیں پتہ، بس تم میری ہو، پور پور میری، مجھے تم سے محبت ہے اور میں اس محبت کے بغیر اور تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' یہ الفاظ تھے یا گلاب کے پھول جو ریشم کو آسمان سے زمین تلک برستے محسوس ہو رہے تھے، اسے آج تک لوگوں نے گندی نظروں سے دیکھا تھا، غلط اشارے کیے تھے مگر ایسے الفاظ تو آج تک کسی نے نہ بولے تھے، اس کے کورے دل پر یہ الفاظ نقش بناتے گئے ایسا نقش جو کبھی نہیں مٹتا، جو بندے کے ساتھ ہی فنا ہو جاتا ہے، الفاظ روایتی اور پرانے تھے لیکن کچھ تھا جو ان میں بولتا تھا محسوس ہوتا تھا اور اس وقت ریشم کو وہاں کھڑا ہونا دوبھر ہو گیا تھا، اس نے ریحان کے کمرے سے دوڑ لگائی تھی اور کچن میں آ کر دم لیا تھا، اسے لگ رہا تھا کہ اب

یہاں اس کی روزی کے چند ہی دن ہیں کیونکہ اگر کسی کو پتہ چل گیا تو ریحان بابو کا تو کچھ نہیں بگڑے گا اس کی رسوائی ہی ہوگی، جہاں محبت کی پھوار برس رہی ہو وہاں دل کے پیاسی زمین کتنے دن اس پھوار سے لاتعلق رہ سکتی ہے، ایسا ہی ریشم کے ساتھ ہوا وہ ریحان سے زیادہ عرصہ لاتعلق نہ رہ سکی اور پور پور اس کی محبت میں ڈوب گئی تھی۔

☆☆☆

''وقت'' ریحان کو دوست بن کر سمجھا رہا تھا کہ اک معصوم اور غریب لڑکی کی زندگی مت خراب کرو، زمین آسمان کبھی نہیں مل سکتے، لیکن ریحان کو وقت کی پرواہ نہیں رہی تھی اس نے وقت کا دل کھول کر مذاق اڑایا یہ کہہ کر کہ ضروری نہیں تم ہمیشہ انسانوں کی سوچوں سے آگے نکل جاؤ، میں جو دیکھ اور سوچ رہا ہوں، تم نہیں جانتے، تم کبھی بھی نہیں جان سکتے، اس لیے وقت کو بہت غصہ آیا اور وہ ریحان گردیزی کی طنزیہ سوچ پر مسکرایا بھی۔

☆☆☆

محبت تو حنا کی مانند ہے کہ ہتھیلی سے اترنے کے بعد بھی رنگ اور خوشبو چھوڑ جاتی ہے رنگ دنیا کو نظر آتا ہے اور خوشبو ہتھیلی میں بسی بندے کو مہکاتی رہتی ہے، ان کی محبت کی خوشبو بھی ان کے دلوں سے نکل کر ارد گرد پھیلنے لگی تھی، بی بی جان جہاندیدہ عورت تھیں بیٹے کے رنگ ڈھنگ اور ریشم کی نزاکتیں نظر انداز نہ کر سکیں، وہ خدا ترس سہی لیکن خاندانی عورت تھیں اور گردیزی صاحب سے ڈرتی تھیں کہ وہ تو ایسی بات برداشت نہیں کر سکیں گے اور الزام سارا ان کی تربیت پر آئے گا، وہ اب دنیا کو دل کی نظر سے نہیں دماغ اور مرتبے کی نظر سے دیکھتی تھیں، انہوں نے باتوں باتوں میں بیٹے کو کئی بار سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ ان کی بات کہاں سنجیدگی سے سنتا تھا، انہوں نے بس ایک ہی فیصلہ کیا ریشم کو اپنے گھر آنے سے منع کر دینا چاہیے اور پھر انہوں نے ایسا ہی کیا، ریشم کو اب نوکری جانے کا غم نہیں تھا دکھ تو اس بات کا تھا کہ ریحان بابو دور ہو جائیں گے اور ان سے دوری ان کے لئے سوہان روح تھی۔

''روز ملنے آیا کروں گا تم سے۔'' ریشم کی آنکھیں برس رہی تھیں اور ریحان گردیزی کی جان پر بنی ہوئی تھی۔

''آپ بی بی جان سے کہیں نا مجھے یوں اس گھر سے دور نہ کریں۔''

''اگر میں نے بی بی جان سے تمہارے والے معاملے پر مزید بات کی تو معاملہ کہیں زیادہ ہی الجھ نہ جائے۔''

''لیکن ریحان بابو، دوری تو دوری رہے گی نا، یہاں تو اک گھر میں ایک چھت تلے تھے۔''

''جو تم سوچ رہی ہو میں بھی وہی سوچ رہا ہوں لیکن یار مجبوری ہے نا، تمہارا کیا خیال ہے تم یہاں سے چلی جاؤ گی تو میں تمہیں بھول جاؤں گا، یہ تو مر کر بھی نہیں ہو سکتا ویسے بھی مجھے تمہارا یہاں نوکروں کی طرح کام کرنا پسند نہیں، ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہو رہا ہے۔'' اس نے جیسے تیسے کر کے ریشم کو سمجھا لیا تھا، اس کی آنکھوں کی نمی تو نہ گئی البتہ آنسوؤں پر بند ضرور بندھ گیا تھا۔

☆☆☆

ریحان اب ریشم کو ملنے اکثر و بیشتر اس کے گھر جانے لگا تھا، وہ پہلے والی ریشم تو نہ رہی تھی، وہ تو ریحان کی محبت میں پور پور رنگی ہوئی کوئی اپسرا معلوم ہوتی تھی جو ایک بار جادور کا رنگ چڑھا دے تو پھر وہ رنگ چھڑایا نہ جا سکے، ریحان جب بھی جاتا ان سب کے لئے ڈھیروں ڈھیر

تحائف پھل اور اس کے باپ فضلو کو ڈھیر ساری رقم دے کر واپس آتا یوں ان کے گھر میں سے کسی کو اس کے آنے اور ریشم سے ملنے پر اعتراض نہ تھا۔

''بابو! تم سے ایک بات کہنا تھی۔'' فضلو جھلنگا سی چارپائی میں گھسا اپنے کان کھجا رہا تھا جب ریحان اندر داخل ہونے لگا تو اس نے اسے روک لیا تھا۔

''ہاں کہو؟''

''بابو! ہم غریب جرور (ضرور) ہیں پر عجت دار (عزت دار) لوگ ہیں، تمہارے آنے پر یہاں کے کچھ لوگ عجب باتاں (باتیں) کرتے ہیں، کوئی کہے ریشو نے محنت مجدوری (مزدوری) چھوڑ کر اب یہ کام پکڑ لیا اور کوئی کہے ہماری دھیوں (بیٹیوں) کو بھی یہ خراب کرے ہے، بابو تم اس سے بیاہ (شادی) کر لو تو اچھا ہے۔''

''بیاہ۔'' ریحان کو تو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔

''ہاں یہی جیج (جائز) طریقہ ہے۔'' وہ مسلسل کان کھجاتا رہا تھا، ریحان وقتی طور پر اس کی بات پر ہنسا بھی تھا اور پریشان بھی ہوا تھا، مگر جب گھر جا کر اس نے سوچا تو اسے ریشم سے ملنے اور تا عمر اس کو ساتھ رکھنے کا یہ آسان طریقہ نظر آیا تھا، ریشم بھی تو ڈھکے چھپے الفاظ میں کئی بار اسے کہہ چکی تھی کہ اب اس سے دوری برداشت نہیں ہوتی اور وہ ہر وقت اس کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔

''مجھے کون سا روپے پیسے کی کمی ہے، میں اسے کہیں بھی رکھ سکتا ہوں۔'' گرم اور جوان خون تھا اس سے آگے سوچنا وقت کا تقاضا ہی نہیں تھا، سو اس نے دو چار دنوں میں ہی ریشم کو کورٹ میں لے جا کر نکاح کر لیا اور اب جبکہ وہ اس کی بیوی بن چکی تھی وہ اسے گندی مندی جھونپڑی میں کیونکر برداشت کرتا، اس نے اپنے ایک دوست سے بات کی اور ایک چھوٹا سا فلیٹ لے لیا تھا۔

بی بی جان اور گھر والوں کو خبر ہی نہ ہو سکی کہ ان کا بیٹا کیا گل کھلا چکا ہے، وہ ریشم کو گھر سے نکال کر سمجھ رہی تھیں کہ انہوں نے بر وقت اچھا فیصلہ کیا ہے لیکن انہیں یہ نہیں پتہ تھا کہ وہ ریشم کو گھر سے نکال رہی ہیں بیٹے کے دل و دماغ سے نہیں۔

ان دنوں ریشم پر نظر ہی نہ ٹھہرتی تھی، ریحان کی محبتوں نے اسے رنگ دیا تھا، وہ اپنی جھونپڑی کو بھول کر فلیٹ کو زندگی سمجھ بیٹھی تھی، اس نے اپنے حلیے کے ساتھ زندگی کی دوسری ترجیحات بھی بڑی تیزی سے بدلی تھیں، دو چار ماہ میں ہی وہ اتنا بدل گئی تھی کہ کوئی اسے اک نظر دیکھتا تو کبھی نہ پہچان پاتا کہ یہ پہلے والی ریشم ہے، وہ ریحان گردیزی کی محبت کے سب رنگوں میں رنگ کر اک نئی ریشم بن گئی تھی، جب جب ریحان فلیٹ میں آتا تب تب اس کی محبت کی مہک چاروں اور پھیل جاتی، ریشم اٹھلاتی، شرارتیں کرتی محبوبہ بن جاتی کبھی بیوی بن کر نخرے دکھاتی، ریحان اس کے ہر ہر انداز سے حظ اٹھاتا اور سرشار و مسحور ہو کر رات گئے گھر لوٹتا۔

☆☆☆

بی بی جان کو اپنی بھتیجی شمائل بہت پسند تھی، وہ اسے ریحان کی دلہن بنانا چاہتی تھیں، ریحان کو بھی ایک زمانے میں براؤن آنکھوں والی اور طرحدار شمائل اچھی لگتی تھی، ہاں یہ ضرور ہوا تھا کہ ریشم کی محبت میں وہ پس منظر میں چلی گئی تھی، لیکن بی بی جان بیٹے کی منہ زور جوانی کو لگام ڈالنے کے لئے ایک بار پھر شمائل کو سامنے لے آئی تھیں شمائل آج ہی گردیزی ہاؤس میں بی بی جان کے

بے حد اصرار پر آئی تھی اور اب شام ہونے کو تھی اور وہ ریحان کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

"ارے واہ آج تو بڑے بڑے لوگ نظر آ رہے ہیں۔" وہ لان میں ٹہل رہی تھی جب ریحان ایک سحر انگیز سی دھن سیٹی پر بجاتا ہوا اس کے پاس آیا تھا۔

"آپ کو کیا، کوئی آئے یا جائے، آپ کی تو اپنی مصروفیات ہے نا۔" اس نے بڑے ناز سے شکوہ کیا تھا۔

"ارے اب ایسی بھی بات نہیں ہے، ہاں مگر مصروفیت ضرور ہے لیکن گھر والوں کے لئے تو ہم ہر وقت حاضر ہیں۔" وہ شوخی سے بولا تھا۔

"چلیں آئیں پھر اندر چلیں، بی بی جان کب سے آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔" وہ بھی انہیں پھپھو وغیرہ نہیں کہتی تھیں بلکہ سب کی طرح بی بی جان ہی کہتی تھی۔

"چلئے جناب!" وہ دل پر ہاتھ رکھ کر جھکا تھا اور شمائل ایک دلکش سی ہنسی ہنستے ہوئے آگے بڑھ گئی تھی۔

"آپ کی تو شام برباد ہو گئی۔" بی بی جان نے اسے زبردستی شمائل کے ساتھ ڈنر کے لئے باہر بھیج دیا تھا، وہ اب نک سک سے تیار اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی چہک رہی تھی۔

"کیوں برباد کیوں؟" وہ مہارت سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے شمائل کی قربت کو پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔

"آپ کو زبردستی میرے ساتھ بھیج جو دیا۔" آج تو ہنسی شمائل کے لبوں سے جدا ہی نہیں ہو رہی تھی۔

"اس زبردستی میں بھی الگ دلکشی ہے، ایک حسین ساتھ ہے اور میں اسے انجوائے کر رہا ہوں۔"

"اچھا۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی تھی اور پہلی دفعہ ریشم کی کالی سیاہ آنکھوں کا حسن ان براؤن آنکھوں میں ڈوبنے لگا تھا اور تہہ در تہہ نیچے جانے لگا تھا، پھر جب تک وہ دونوں ایک پر تکلف سا ڈنر کر کے واپس لوٹے تھے تب تک ریشم کی معصومیت اور حسن شمائل کی نزاکتوں اور اداؤں کے سامنے مکمل ڈوب گیا تھا، ماند پڑ گیا تھا۔

اس رات شمائل کو خوشی سے نیند نہیں آئی تھی اور ریحان گردیزی کو عجیب سی بے چینی نے آ گھیرا تھا، وہ ساری رات اس نے نرم گرم بستر میں کروٹیں بدلتے گزاری تھی، صبح تک وہ اس بے چینی کو کوئی نام نہیں دے سکا تھا۔

انسانی جبلت ہے کہ جو چیز دسترس میں نہ ہو اس کے لئے انسان دن رات دعائیں مانگتا ہے اور جب وہ چیز پاس آ جاتی ہے اس سے پھر جلد ہی بیزار ہو جاتا ہے، ایسا ہی کچھ ریشم کے ساتھ ہونے والا تھا، دن ایک ایک کر کے گزرنے لگے تھے اور وہ آہستہ آہستہ ریشم سے دور اور شمائل سے قریب ہونے لگا تھا، ریشم میں اب بہت ساری خامیاں نظر آنے لگی تھیں جو کبھی محبت کے منہ زور جذبے تلے نظر نہ آئی تھیں اور شمائل میں وہ بہت کچھ دیکھنے لگا تھا جو مرد کے ذائقے کو بدلنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

"کل کیوں نہ آئے تھے، کہاں تھے آپ؟" پہلے آنے جانے میں گھنٹے کم ہوئے تھے اور اب دنوں کی باری آ گئی تھی، ریشم اس کے سامنے سراپا سوال بن کر کھڑی تھی۔

"کہاں ہونا تھا، بس ذرا مصروف تھا۔" وہ جوتے اتارنے لگا تھا، ریشم نے جلدی سے پاؤں میں بیٹھ کر جوتے اتارنے شروع کر دیئے تھے، کبھی وہ ان مظاہروں پر نثار ہوتا تھا اور آج بیزار

نظر آ رہا تھا، شمائل نے تو اسے کبھی پانی کا گلاس تک اٹھا کر نہ دیا تھا، مگر اس کی خوشبودار قربت نک سک سے تیار سراپا کچھ اور دیکھنے دینا تو محبت کے یہ چھوٹے موٹے مظاہر نظر آتے۔

''کھانا لے آؤں۔'' وہ جوتے اتار کر بولی تھی۔

''کیا بنایا ہے؟''

''اچار گوشت اور روٹی، ساتھ میں پلاؤ بھی ہے۔'' وہ روانی سے کہنے لگی تھی۔

''ہونہہ اچار گوشت اور روٹی۔'' وہ منہ بنا کر بولا تھا، رات جو شمائل کے ساتھ چائنیز کھایا تھا ابھی تک اس کا ذائقہ زبان پر تھا۔

''لے آؤں پھر؟'' وہ منتظر کھڑی تھی۔

''نہیں رہنے دو۔'' وہ اس چوائس سے ایک دم ہی بیزار ہوا تھا، شاید وہ ریشم سے ہی بیزار ہو گیا تھا۔

''کیا کھا کر آئے ہیں۔'' اس کی تسلی نہ ہو رہی تھی، وہ خود بھی تو ابھی تک بھوکی بیٹھی تھی۔

''نہیں اور بھوک بھی نہیں ہے۔'' وہ تکیہ منہ پر رکھ کر لیٹ گیا تھا، پہلے کی طرح یہ نہیں پوچھا تھا کہ تم نے بھی کھانا کھایا ہے یا نہیں، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ریشم اس کے بغیر کھانا نہیں کھاتی تھی۔

وہ سو گیا تھا یا شاید سوتا بن گیا تھا، ریشم اس کے سرہانے بیٹھی اس کے گھنے بالوں میں انگلیاں چلاتی رہی تھی، آنکھیں بھوک کی وجہ سے نم ہو رہی تھیں یا شاید اس کے رویے پر، کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔

☆☆☆

جو محبت ریحان نے جلد بازی میں کی وہ اب اسے وبال نظر آنے لگی تھی، مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا تو سب سے پہلے مخمل کو ہی چبھنے لگا تھا، اب ریشم کی نزاکتیں ریحان کے لئے پتھر ہو گئی تھیں اور یوں بھی بی بی جان اور بابا جان کا اصرار شادی کے لئے بڑھتا جا رہا تھا اور اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ان سب کو ریشم سے شادی کا بتا کر اک طوفان اٹھا دیتا، وہ اسے عاق کر دیتے اور وہ آسائشوں کا عادی جھونپڑی میں دن کیسے گزارتا، ویسے بھی ریحان جیسے لوگوں کو محبت بھرے پیٹ کے ساتھ اچھی لگتی ہے ورنہ یہ محبت نہیں عذاب بن جاتی ہے۔

ریشم کا انتظار اب طویل سے طویل تر ہوتا جا رہا تھا، ریحان کبھی بھولے سے فلیٹ کی طرف آ بھی نکلتا تو جھوٹی محبت جتاتا، غیروں کی طرح اس کا ہاتھ پکڑتا اور پوچھتا۔

''تمہیں چوڑیاں پسند تھیں اتار کیوں دیں۔'' وہ عجیب نظروں سے اسے دیکھتی اور کہتی۔

''دل نہیں چاہتا انہیں پہننے کو، تم نہیں ہوتے ریحان بابو تو ان چوڑیوں کی کھنک مجھے تمہاری یاد دلاتی رہتی ہے، یہ تمہارے انتظار میں بجتی رہتی ہیں اور تم نہیں آتے، میری مہندی کا رنگ اڑ جاتا ہے اور تم نہیں آتے۔'' وہ کبھی شرمندہ ہوتا، کبھی بہانے بناتا اور کبھی بس اسے ٹالتا ہی رہ جاتا۔

بہت دن سے وہ نہیں آیا تھا، اسے اکیلے میں اب ڈر لگنے لگا تھا، اس نے ریحان بابو کو بہت فون بھی کر ڈالے تھے مگر وہ اس کا نمبر دیکھ کر فون اٹھاتا ہی کب تھا، اس نے تھک ہار کر فلیٹ کو تالا لگایا اور اپنے باپ کے پاس اپنی جھونپڑی میں چلی آئی تھی۔

ریحان آنے والے وقت سے خائف تھا کہ یہ ہمیشہ اس کے پیچھے رہا ہے اور آج جانے اسے کیا سبق پڑھایا ہے لیکن ریحان انتظار ہی

کرتا رہ گیا آج وقت کو نہیں آنا تھا، وہ اسے تمام سبق پڑھا چکا تھا، اب تو اسے اپنا دیا سبق ریحان گردیزی کے منہ سے سننے کا انتظار تھا۔

☆☆☆

"لے روٹی کھا لے۔" وہ اجڑی حالت لئے ایک کونے میں پڑی تھی جب زیبو نے کھانا اس کے سامنے رکھا تھا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" وہ اب اس جھونپڑی میں تھی مگر جھونپڑی والی لگتی نہ تھی، ریحان کی محبت نے اسے سرتاپا بدل دیا تھا، وہ تو کسی اور ہی دیس کی رانی لگتی تھی، مگر رانی کو رانی بنا کر رکھنے والا کہیں جا چکا تھا۔

"بھوک نہیں بھی ہے تو کھا لے، تجھے ضرورت نہیں مگر اس دوسری جان کو تو ضرورت ہے جو تمہارے وجود میں پل رہی ہے۔" زیبو نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا تھا۔

"مجھے اس کی بھی ضرورت نہیں ہے۔" وہ ریحان بابو سے کیا جدا ہوئی تھی جیسے خود سے بھی بیزار ہو گئی تھی۔

"مگر ہمیں تو تمہاری ضرورت ہے نا۔" وہ آگے بڑھ کر نوالہ بنا کر اس کے منہ میں زبردستی ڈالنے لگی تھی۔

جس دن ریحان گردیزی نے شمائل کو شریک زندگی کیا اس دن جھونپڑی کے کمزور سائبان تلے ریشم سمیکہ کو جنم دے کر زندگی کی بازی ہار گئی تھی، زندگی کی بازی تو اس نے اسی دن ہار دی تھی جس دن ریحان بابو اسے چھوڑ گیا تھا۔

شمائل کو اس نے اپنی خوشی کے ساتھ اپنی زندگی میں شامل کیا تھا، مگر جانے کیوں دل اس طرح خوش نہیں تھا جس طرح سے اس کو ہونا چاہیے تھا، شادی کی پہلی رات بھی وہ بہت بے کل اور بے چین رہا تھا، شمائل آج کے دور کی ماڈرن لڑکی تھی وہ محبت جیسے فرسودہ خیالات پر ذرا کم ہی یقین رکھتی تھی، ریحان گردیزی اس کی ضد تھا اور اس نے ضد جیت لی تھی وہ تو اسی نشے میں مدہوش تھی، مگر ریحان کے دل میں جانے کیسی بے چینی آسمائی تھی جو کسی طرح دور نہ ہوتی تھی۔

"آپ کہاں کھو جاتے ہیں۔" وہ ہنی مون منانے شمائل کی بے حد فرمائش پر سنگاپور آئے تھے، سنگاپور کی مسحور کن فضاؤں نے بھی ریحان کے موڈ پر کچھ خاص اثر نہ ڈالا تھا، یوں تو شمائل کی بے باک قربت ہی اس کے ہوش آڑانے کو کافی تھی مگر ریحان کی ہنوز ایک ہی کیفیت تھی تنگ آ کر شمائل پوچھنے لگی تھی۔

"کہیں بھی نہیں، یہاں تمہارے پاس ہی تو ہوں۔" اس نے چونک کر شمائل کا چہرہ دیکھا تھا اسے اس کے نقش غیر مانوس سے لگے تھے، وہ اس کو بانہوں کے گھیرے میں لیتے ہوئے کھلے سے لہجے میں بولا تھا۔

"میرے پاس ہی تو نہیں ہیں۔" وہ ان کی بانہوں کے کمزور سے حصار سے نکل کر ایک درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر بولی تھی۔

"یار ایسے مت کہا کرو، اب تو تمہارا ہی ہوں۔" وہ اس کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے تھے۔

"وہ تو ساری دنیا کو پتہ ہے۔" وہ فخر سے کھلکھلائی تھی اور ریحان گردیزی کو جانے کیوں وہ لڑکی یاد آنے لگی تھی جس کو ساری دنیا سے چھپا کر اپنایا تھا اور اب بالکل بھول گئے تھے۔

وہ لوگ ہنی مون سے لوٹے تو شمائل کی کھلکھلاہٹیں عروج پر تھیں اور وہ گم صم سے تھے اور اس چیز کو سب نے نوٹ کیا تھا، اگلے دن وہ بی بی جان کے پاس بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے جب جنت اور بی بی جان باتیں کرنے لگیں

تھیں۔

''ابھی بے چاری کی عمر ہی کیا تھی، مگر سچ ہے موت جوان اور بوڑھا تھوڑی دیکھتی ہے، جس کی عمر گھٹ جاتی ہے وہ یونہی چلا جاتا ہے۔'' بی بی جان جانے کس کا افسوس کر رہی تھیں۔

''بی بی جان غم تو اس ننھی جان کا ہے جسے پیدا کرتے ہی ماں تو چلی گئی مگر اب اس کا کون آسرا ہوگا۔'' جنت بولی تھی۔

''ماں نہ سہی چلو غریب کو باپ کا پیار تو مل جاتا۔'' بی بی جان نے کہا تھا۔

''باپ تو سب سے ظالم نکلا جو اسے ماں کی کھوکھ میں چھوڑ کر ہی چلتا بنا۔''

''بی بی جان آپ کس کی بات کر رہی ہیں۔'' ان باتوں پر جانے کیوں ریحان کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا تھا وہ بی بی جان سے پوچھے بغیر نہ رہ سکے تھے۔

''ریشم کی جو ہمارے گھر کام کرتی تھی، ایک بچی کو جنم دے کر بے چاری جان سے چلی گئی۔'' بی بی جان کے الفاظ تھے یا بم کا دھماکہ جس نے ریحان گردیزی کے پرخچے اڑا دیئے تھے، اسے لگا تھا زمین میں شگاف ہو گیا ہو اور وہ اس میں اندر تک دھنس گیا ہے، ریشم کی موت اور بیٹی کی پیدائش اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ خوشی منائے یا غم، وہ دونوں طرف بے بسی کی انتہاؤں پر تھے، انہوں نے گاڑی کی چابی اٹھائی تھی اور گھر سے نکل آئے تھے، ریشم کی موت کا غم وہ سب کے سامنے کیسے منا سکتے تھے، فلیٹ پر آئے تو وہاں پر تالا ان کا منہ چڑا رہا تھا ان کے پاس اس تالے کی ایک چابی موجود تھی انہوں نے وہ تالا کھولا تو اندر سے ریشم کی خوشبو کا اک جھونکا ان کے نتھنوں سے ٹکرایا تھا اور وہ اندر چلے آئے تھے، ہر چیز میں ریشم کا عکس تھا ہر جگہ پر اس کی یادیں بکھری تھیں، وہ قریب تھی تو بیزاری بن گئی تھی اور اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور گئی تو دوبارہ سے ریحان کے دل میں اپنی سوئی ہوئی محبت کو جگا گئی تھی، وہ اس کی ایک ایک چیز کو سینے سے لگا لگا کر دھاڑیں مار کر روئے تھے۔

سانحہ کتنا بڑا ہے سانحے کو کیا پتہ
کون زد میں آ گیا ہے حادثے کو کیا پتہ
چلنے والا عمر بھر چلتا رہے اس پر مگر
کس کی منزل کس طرف ہے راستے کو کیا پتہ
دو دلوں کے درمیاں زنجیر کی صورت رہا
کس نے توڑا کیسے ٹوٹا رابطے کو کیا پتہ
یہ تماشا دیکھتا ہے ہاتھ تھامے گا یا نہیں
کون تھک کر گر پڑا ہے فاصلے کو کیا پتہ
چاند کی صورت میں کم ہوتا ہے بڑھتا ہے مگر
کیوں اچانک ٹوٹتا ہے سلسلے کو کیا پتہ
سرگراں پھرتا ہے چندا کس کی ہے اس کو تلاش
رات بھر کیوں جاگتا ہے رتجگے کو کیا پتہ
زندگانی کی کہانی رات بھر کی ہے بتول
جل کے بجھنا ہے مقدر یہ دیے کو کیا پتہ

☆☆☆

ریشم اس دنیا میں ہوتی تو حالات شاید مختلف ہوتے وہ مر کر محبت کو امر کر گئی تھی اور ریحان کے دل میں اس کی محبت کا سوکھا اور مرجھایا ہوا پودا اس کے مرنے پر دوبارہ کھل اٹھا تھا، ترو تازہ ہو گیا تھا، اب وہ شمائل کی اک اک ادا میں ریشم کی معصومیت کو کھوجنے لگا تھا، ریشم کو چوڑیاں پسند تھیں اور وہ اس کی چوڑیوں کی کھنک آدھی رات کو سننے لگا تھا، آنکھ کھلتے ہی سب خیال وخواب ہو جاتا اور پھر وہ گھنٹوں جاگتا رہتا، شمائل اس کی بدحواسیوں سے چڑنے اور لڑنے جھگڑنے لگی تھی، اسے تو شادی کے اول روز سے ہی پورا اور بھرپور ریحان گردیزی ملا ہی نہیں تھا، وہ بٹا ہوا

شخص تھا، وہ محبت کا مسافر تھا اور وہ مسافر بھی وہ جو زادِ سفر میں سب کچھ لٹا بیٹھا تھا۔

"ریحان آخر کیا مسئلہ ہے آپ کے ساتھ؟ میں کب سے پوچھ رہی ہوں اس سوٹ کے ساتھ یہ والا سیٹ پہن لوں لیکن آپ جانے کہاں گم ہیں، میری بات کا جواب ہی نہیں دے رہے ہیں۔" وہ تیسری مرتبہ اس سے پوچھنے آئی تھی اور اس کے خاموش رہنے پر جھنجلاتے ہوئے بولی تھی۔

"ہاں ہاں پہن لو۔" وہ غائب دماغی سے بولے تھے۔

"کیا پہن لوں؟" وہ تیکھی نظر اٹھا کر بولی تھی۔

"یہی سوٹ۔" وہ گڑبڑا گئے تھے اس کی بات غور سے سنی نہیں تھی۔

"بھاڑ میں گیا سوٹ۔" شمائل نے سیٹ کا ڈبہ اٹھا کر ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے پر دے مارا تھا، شیشہ ایک جھٹکے سے چکنا چور ہو گیا تھا، وہ اپنی فرسٹریشن نکال کر باہر جا چکی تھی اور وہ اندر ہی ابلتے لاوے کو دباتے رہ گئے تھے، وہ اپنے دل کا غبار کسی پر نکالتے، کس کے کندھے پر سر رکھ کر روتے، کس کو حالِ دل سناتے۔

شمائل اتنے ٹھنڈے ٹھار آدمی کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی، دن رات کے یہ جھگڑے اتنے بڑھے کہ وہ گردیزی ہاؤس چھوڑ کر اپنی ماں کے گھر جا بیٹھی اور ریحان سے علیحدگی کا مطالبہ کر دیا یوں بھی اب اسے ریحان گردیزی میں کوئی چارم نظر نہ آتا تھا، اس کی فرینڈ کا ایک لندن پلٹ بھائی جو کبھی اس پر مرتا تھا اور وہ ریحان گردیزی کے پیچھے پاگل تھی، اب یہ پاگل پن ختم ہوا تو اسی لندن پلٹ سے رابطے بحال ہونا شروع ہو گئے تھے اور آخر کار اس نے ریحان سے علیحدگی اختیار کر کے اس سے شادی کر لی، وہ ریشم کی طرح محبت میں مر مٹنے والی لڑکی نہ تھی، وہ تو چار دن کی زندگی کو بھرپور انجوائے کرنے والی تھی وہ انجوائے منٹ ریحان کی قربت میں نہ ملی تو اور نہیں تو اور سہی کے مصداق نئے جہان کھوجنے چل نکلی۔

"ریحان بیٹا آج ایک بات تو بتا مجھے۔"

شمائل کو طلاق دینے کا سب سے زیادہ دکھ بی بی جان کو تھا وہ آج کئی دنوں بعد اپنے کمرے سے نکلی تھیں۔

"جی بی بی جان پوچھئے۔" وہ مودب ہو کر بیٹھ گئے تھے۔

"میرے بیٹے کی بربادی کا سبب کیا ہے؟" وہ ماں تھیں بیٹے کی بدلی نظر بھی پہچانتی تھیں، آج دل کڑا کے اس سبب کے بارے میں پوچھ بیٹھی تھی۔

"سب آپ کے سامنے تو ہے۔" وہ نظر چرا گئے تھے۔

"وہی تو پوچھ رہی ہوں جو نظر کے سامنے نہیں ہے۔"

"بی بی جان اب کیا فائدہ پوچھنے کا، اب تو سب ختم ہو گیا ہے۔" وہ جان گئے تھے آج بی بی جان دل کی بات اگلوا کر ہی دم لیں گی۔

"پھر بھی، میرے دل کی تسلی کی خاطر ہی بتا دو۔" انہوں نے کہا تھا اور ریحان نے دل کھول کر ماں کے سامنے رکھ دیا تھا، جب ریشم اس دنیا میں نہ رہی تھی تو چھپانے کا فائدہ بھی کیا تھا، دل کا غبار نکلا تھا اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی، بی بی جان کو تو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس انوکھی داستان پر کیا کیفیت ظاہر کریں، وہ چپ چاپ اٹھی تھیں اور اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئی تھیں، دل یہ جانے کیا گزری تھی کہ رات تک حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے اس دنیا سے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

منہ موڑ گئی تھیں، بابا صاحب کو فیکٹریوں اور زمینوں کے بکھیڑوں سے کبھی اتنی فرصت نہ ملی تھی کہ گھر کے کاموں میں زیادہ دلچسپی لے سکیں، انہوں نے اپنی راجدھانی کی ملکہ بی بی جان کو بنا رکھا تھا، انہیں بی بی جان سے محبت اور ان کی صلاحیتوں پر مکمل بھروسہ تھا اور بی بی جان نے بھی ان کے اعتماد اور مان کو کبھی ٹھیس نہ پہنچائی تھی، ان کی وفات نے صحیح معنوں میں صلاح الدین گردیزی کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی، سالوں کی جوڑی ٹوٹی تو وہ بھی اس غم کو سہار نہ سکے اور ٹھیک دو ماہ بعد بی بی جان کے ہمسفر بن گئے۔

پہلے ریشم، پھر بی بی جان اور اب بابا صاحب کی موت ریحان کی تو سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا کہ وقت ان کے ساتھ کیا چال چل رہا ہے، ایک لمبے عرصے تک وہ بس اپنے پیاروں کا سوگ ہی مناتے رہے اس عرصے میں اگر انہیں کسی نے سنبھالا تھا تو زبیر عباسی کے سوا وہ اور کوئی نہ تھا، وہ بزنس پارٹنر بھی تھا اور دوست بھی اور وقت کے دیئے گئے زخموں پر مرہم بھی بن گیا تھا۔

جب حالت ذرا سنبھلی تو انہیں اپنی بیٹی کی یاد آئی تھی، وہ دوبارہ انہی جھونپڑیوں کی طرف گئے جہاں کبھی ان کی ریشم بستی تھی۔

ریشم کی بہنوں نے انہیں بیٹی سے ملنے نہ دیا، ان کی نظر میں ان کی بہن کی موت کی ذمہ داری اس پر تو آتی تھی، ریشم کا باپ اسی جھلنگا چارپائی پر لیٹا ہوا تھا جس پر وہ ہمیشہ پڑا رہتا تھا، یہ اور بات کہ وہ بھی پہلے سے زیادہ کمزور اور زیادہ بیمار نظر آ رہا تھا، لیکن اس غم میں بھی اس کو ایک بات یاد تھی کہ یہ اس کی بیٹیاں تو پاگل ہیں مان نہ سہی اس بچی کو باپ کا پیار تو ملنا چاہیے اس کے باپ کے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں کم از کم ریشم کی بچی تو ساری زندگی تو نہیں گزارے گی، وہ کچھ سوچ کر اپنی چارپائی سے اٹھا اور ریحان کو اندر لے آیا تھا۔

''بابو! ہماری دھی تو شاید اتنی ہی جندگی (زندگی) لائی تھی، لیکن بابو تو نے اچھا نہیں کیا اس کے ساتھ۔'' ساتھ ہی اس نے اپنی میلی چیکٹ قمیض کے ساتھ اپنی آنکھوں کا گدلا پانی صاف کیا تھا، ریحان کو بے تحاشا شرمندگی اور ندامت نے آگھیرا تھا۔

''بابا میں شرمندہ ہوں۔'' اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

''آخری وقت تک اسے تیرے آنے کی آس رہی۔'' وہ پھر رونے لگا تھا، ریحان پہ گھڑوں پانی پڑا تھا، وہ واقعی برا تھا اور اس نے ریشم کے ساتھ بہت برا کیا تھا۔

''خیر ادھر آ بابو اور دیکھ لے اپنی گڑیا کو۔'' اس نے ایک چارپائی پر پڑا ہوا گندا سا کپڑا ہٹایا تھا، بچی رونے لگی تھی، ریحان نے لپک کر اپنی بیٹی کو اٹھایا تھا اور سینے سے لگایا تھا، خون اپنا ہو تو جوش مارتا ہی ہے، گڑیا ہو بہو ریشم کی کاپی تھی، ویسی ہی آنکھیں ویسا ہی چمکتا ہوا رنگ، ویسا ہی ناک نقشہ۔

''بابا میں آپ سب کا مجرم ہوں، معافی کے قابل تو نہیں لیکن پھر بھی ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔'' اس نے فضلو کے ہاتھ تھام کر کہا تھا۔

''بابو! ہم معافی دینے والے کون ہیں، اب ریشو نہیں تو ہم تمہیں کیا کہہ سکتے ہیں۔''

فضلو اور ریحان دونوں کی آنکھوں سے ایک ساتھ آنسو ٹپکے تھے اب کے بار دونوں کا غم ایک ہی تھا۔

''بابا میں گڑیا کو لے جانا چاہتا ہوں۔'' ریحان نے جھجکتے ہوئے پوچھا تھا۔

''ہاں لے جاؤ، یہ تمہاری امانت ہے۔''

"بابا میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں، غریب آپ نہیں ہیں میں ہوں، میں آپ کو کچھ نہیں دے سکا اور آپ نے مجھے مالا مال کر دیا۔" اس نے فضلو کو کچھ رقم دینا چاہی مگر اس نے لینے سے انکار کر دیا، ریحان شرمندگی اور تاسف میں گھرا وہاں سے اپنی بیٹی کو لے آیا تھا۔

☆☆☆

سمیکہ جسے کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہوئی تھی، آنسو کیا ہوتے ہیں وہ نہیں جانتی تھی، مگر آج وہ ڈائری سامنے رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی، اس کی ماں کا دکھ بہت بڑا تھا، اسے محبت کرنے کی اتنی بڑی سزا ملی تھی، ریحان گردیزی اس کے پاپا ہمیشہ اس کے آئیڈیل رہے وہ فخر سے اپنے باپ کے بارے میں سب کو بتاتی تھی، آج ان کی شخصیت کا بت پاش پاش ہو گیا تھا، انہوں نے سمیکہ سے کتنے جھوٹ بولے تھے کہ اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں جبکہ ماں کے سوا اس کے بہت سے رشتے اس دنیا میں باقی تھے اور وہ اتنے کم ظرف کہ میری ماں کے مرنے کے بعد بھی مجھے ان کے غریب رشتے داروں سے ملنے نہ دیا، وہ سوچ رہی تھی۔

شام کو ریحان نے گھر میں قدم رکھا تو غیر معمولی خاموشی اور سناٹے کا احساس ہوا، اس وقت سمیکہ یا تو ٹی وی کے سامنے بیٹھی ہوتی، فون پر کسی سے گپ شپ لگا رہی ہوتی یا پھر کچھ اور نہیں تو شریفاں کی شامت آئی ہوتی لیکن آج ایسا کچھ نہیں تھا، شریفاں انہیں دیکھ کر دوڑ کر آئی اور ان کے ہاتھ سے بریف کیس لے لیا تھا۔

"سمیکہ کہاں ہے؟"

"صاحب جی! اپنے کمرے میں ہیں سمیکہ بی بی!"

"کیوں خیریت تو ہے؟"

"بلاؤں جی اسے؟"

"نہیں میں خود دیکھتا ہوں۔" وہ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے اس کے کمرے کی طرف بڑھے تھے۔

"سمیکہ...... سمیکہ بیٹا!" وہ آوازیں دیتے

اندر آئے تھے، دروازہ لاک نہیں تھا، وہ دستک دے کر اندر آئے تو اندھیرے میں یک دم کچھ نظر نہ آیا۔

''سمیکہ سو رہی ہو بیٹا!'' انہوں نے سوئچ آن کیا تو سارا کمرہ روشنی سے بھر گیا، سمیکہ سامنے بیڈ پر سرخ ڈائری گود میں رکھے بے حس و حرکت بیٹھی تھی، سرخ ڈائری نے ایک لمحے کے لئے تو انہیں بھی ساکت کر دیا تھا۔

''سمیکہ!'' وہ ہمت کر کے آگے بڑھے تھے۔

''بیٹی کیا ہوا؟ ایسے کیوں بیٹھی ہو؟''

''مت کہیں مجھے بیٹی، نہیں ہوں میں آپ کی کچھ بھی، کاش میں بھی اپنی ماں کے ساتھ ہی مر گئی ہوتی۔'' وہ پھٹ پڑی تھی۔

''آپ قاتل ہیں، غریبوں کے، ان کی خوشیوں کے، ان کی محبتوں کے۔'' وہ ہذیانی انداز میں چلا رہی تھی، وقت سامنے کھڑا تھا ایسا تو ہونا تھا، انہیں بھی تو کسی کے سامنے جواب دہ ہونا ہی تھا، آج سمیکہ کو دیکھ کر انہیں لگ رہا تھا ریشم اپنی محبت کا خوں بہا ان سے مانگ رہی ہے، اپنی خواہشوں اور خوشیوں کا حساب طلب کر رہی ہے، وہ کچھ بول ہی نہ سکے تھے۔

☆☆☆

گزرا وقت ان سے ایسا روٹھا کہ پھر ان سے منایا ہی نہ گیا، وہ اس سے شرمندہ تھے، معافی مانگنا چاہتے تھے، اس کو اپنے پاس بلانا چاہتے تھے لیکن گیا وقت بھی کیا خوب تھا کبھی لوٹ کر نہیں آتا، وہ ریشم کو نہ منا سکے تھے جس سے انہوں نے ٹوٹ کر محبت کی تھی اور اب سمیکہ کو کیسے منا سکتے تھے۔

☆☆☆

''سمیکہ بیٹا میں بس کچھ عرصے کے لئے ریشم کی محبت سے دور ہوا تھا، مجھے لوٹ کر تو اسی کے پاس آنا تھا بس اس نے میرا انتظار ہی نہ کیا۔''

سمیکہ کو ایک چپ سی لگ گئی تھی، وہ اپنی صفائیاں پیش کرتے کرتے تھک گئے تھے۔

''ہاں سارا قصور میری ماں کا تھا آپ کا تو نہیں۔'' اس کے منہ سے پتھر نکلے تھے اور ریحان کا تن من نیل و نیل ہو گیا تھا۔

''مجھے نہیں پتا تھا ریشم اتنی کم زندگی لکھوا کر آئی ہے۔'' وہ بولے تھے۔

''پتہ تو کسی کو بھی نہیں ہوتا کہ کب کیا ہو جائے۔'' وہ خلاؤں میں گھورنے لگی تھی۔

''آپ بس میرا ایک کام کریں۔''

''ہاں بولو۔'' وہ بے تابی سے گویا ہوئے تھے۔

''مجھے پھپھو کے پاس باہر بھجوا دیں، میں اب آپ کے پاس رہنا نہیں چاہتی۔''

''تم مجھے اس عمر میں تنہا کر کے جا رہی ہو۔''

''ہاں آپ کے لئے اتنا ہی بہت ہے کہ میں اس دنیا میں رہوں۔'' اور ریحان گردیزی اس کی بات پر دہل کر رہ گئے تھے۔

آخر تھک ہار کر اور اس کی ضد کے آگے مجبور ہو کر انہوں نے اسے اپنی بہن کے پاس بیرون ملک بھجوا دیا تھا، اب خالی گھر تھا اور وہ تھے، سمیکہ کی خوشبو تھی اور ریشم کی یادیں تھیں اور گردیزی ہاؤس کے در و بام سے لپٹی ہوئی وہ محبت تھی جو ایک بار کہیں جنم لے لے تو پھر مر کر بھی ختم نہیں ہوتی جان نہیں چھوڑتی، محبت کرنے والے رہیں یا نہ رہیں یہ فنا نہیں ہوتی، یہ ان کی روحوں کا بھی پیچھا کرتی رہتی ہے۔

محبت کی قسمت میں ازل سے بھٹکنا ہی لکھا ہے، وہ بھٹکتی ہی رہے گی ابد تک، یہی اس کا مقدر ہے یہی اس کی منزل۔

☆☆☆

مارننگ واک
سباس گل

صبح کا سنہرا دلکش حسین منظر تھا، سورج نے نارنجی رنگ کی چادر سے آہستہ آہستہ پلکوں کے در وا کرنے شروع کیے تو اس کی نرم نرم کرنیں اہل زمین کو روشنی دکھلانے لگیں، فضا میں پرندوں کی چہچہاہٹ، پھولوں، پودوں اور درختوں کی مسحور کن مہک کے ساتھ ساتھ، انسانوں کے چلنے پھرنے، دوڑنے بھاگنے، اچھلنے کودنے، ہنسنے بولنے کی آوازیں بھی رات بھر کا مہیب سناٹا توڑنے کا اعلان کر رہی تھیں۔

صبا حسب عادت مارننگ واک کے لئے گھر سے نکلی تھی، پارک میں موجود دوسرے لوگوں سے ہیلو ہائے کرنے کی اسے کبھی بھی عادت نہیں رہی تھی، وہ صبح کی تر و تازہ ہوا اپنے اندر اتارنے کے لئے آیا کرتی تھی، عمر کے پچیس ویں برس میں قدم رکھ چکی تھی، سنہری رنگت، سنہری بالوں اور قابل قبول صورت کی مالک ہونے کے ساتھ ساتھ بہت پر اعتماد اور ذہین بھی تھی، تین بہنوں کی شادیاں ہو گئیں تھیں جو سب سے بڑی تھی ابھی تک کنواری تھی، اسے اپنی پسند کا مرد نہیں ملا تھا، خوش شکل، ایماندار اور مخلص اور باوفا، بھلا ایک مرد میں ہی ساری خوبیاں ایک ساتھ کیسے یکجا ہو سکتی ہیں، اسے سب نے سمجھایا آخر وہ شادی سے ہی انکاری ہو گئی تھی، ممی ڈیڈی کو اس کی فکر دن رات کھائے جا رہی تھی، اس نے نوٹ کیا تھا مارننگ واک کے لئے تین طرح کے لوگ باہر نکلتے ہیں، ایک وہ جو بہت فربہ، موٹے اور بھاری بھرکم ہوں جنہیں دوسروں نے ''موٹاپا بیماریوں کی جڑ ہے اور تم موٹے ہو کر بہت بھدے دکھائی دینے لگے ہو'' وغیرہ جیسے کلمات سے نوازا ہوتا ہے اور دوسرے وہ جو اپنے اعلیٰ افسران اور مطلب کے آدمی سے راہ و رسم بڑھانا چاہتے ہیں وہ مارننگ واک اور جوگنگ کے بہانے محض اتفاق قرار دے کر ان تک رسائی بھی حاصل کر لیتے ہیں اور پھر چند دنوں میں ان کے ساتھ ان کی خوب گاڑی چھنتی نظر آنے لگتی ہے۔

لوگوں کی تیسری قسم وہ ہوتی ہے جنہیں دوسروں سے زیادہ اپنی صحت و تندرستی اور فٹنس کا خاص خیال ہوتا ہے اور وہ واقعی صبح کی سیر تازہ ہوا کے لئے، فالتو چربی زائل کرنے کے لئے اور تازہ دم ہونے کے لئے کرتے ہیں اور انہیں اس بات کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ ارد گرد کے لوگ ان کے بارے میں کیسی کیسی رائے کا اظہار کر رہے ہیں، صبا بھی لوگوں کی اس تیسری قسم میں شامل تھی اور خود اپنے تجزیے کے مطابق بھی وہ اسی کیٹگری میں آئی تھی۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے چکر پورے کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کے سامنے ایک بہت ہی موٹی خاتون خراماں خراماں چل رہی تھیں اور صبا کو ان سے آگے کا منظر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''توبہ ہے، پوری موسو پہلوان ہیں یہ خاتون چٹان کی طرح راستہ روکے چھوئے کی چال چل رہی ہیں۔'' صبا نے بیزاری سے سوچا۔

اور جب وہ خاتون اپنی رفتار میں اضافہ نہ کرنے کے موڈ میں نظر آئیں تو وہ وہیں رک گئی اور تازہ تازہ بھینی بھینی مہک سے پر ہوا اپنے پھیپھڑوں میں بھرنے لگی، اسے بہت تازگی اور فرحت کا احساس ہو رہا تھا، اس کے سامنے ایک شخص جو بہت دیر سے اسے فالو کر رہا تھا کھڑا اسے دیکھے جا رہا تھا۔

اور وہ ظاہر کر رہی تھی جیسے اس نے اسے دیکھا ہی نہ ہو، ایسا وہ سب کے ساتھ کرتی چلی آئی تھی، پارک میں جوگنگ کے لئے آنے والے کئی نوجوان لڑکوں نے اسے اپنی طرف متوجہ

کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ انجان بنی رہی تھی، آخر وہ ہی ہار کر پلٹ گئے تھے، اس کی خاموشی کسی کو آگے بڑھنے ہی نہیں دیتی تھی۔

''ہیلو۔'' وہ شخص اس کے قریب آ کر اس سے مخاطب ہوا وہ اب بھی خاموش رہی، تو اس نے اس کے کان کے قریب منہ لا کر بہت زوردار آواز میں کہا۔

''ہیلو۔''

''کیا بدتمیزی ہے؟'' وہ کان پر ہاتھ رکھ کر پیچھے ہٹتے ہوئے غصے سے بولی۔

''اوہ سوری آپ سنتی بھی ہیں اور بولتی بھی ہیں۔'' وہ بڑی ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''میں سمجھا تھا شاید آپ یا تو بہری ہیں یا پھر اونچا سنتی ہیں اس لئے یہ با آواز بلند حرکت کرنا پڑی۔''

''اور آپ کو یہ حرکت کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟'' وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

''کیونکہ میں آپ کو جاننا چاہتا ہوں۔''

''مجھے جاننے سے پہلے آپ اپنی خبر لیجئے۔'' وہ یہ کہہ کر رخ پھیر گئی۔

''اپنی خبر لینے کے بعد ہی آپ کی خبر لینے آیا ہوں۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولتا ہوا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تو اس نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

''کیوں آئے ہیں، میں نے تو آپ کو نہیں بلایا؟''

''مجھے معلوم تھا کہ آپ تو مجھے کبھی نہیں بلائیں گی، مجھے خود ہی آپ کے پاس جانا پڑے گا، ویسے بھی وہ مثل مشہور ہے نا کہ پیاسا خود چل کر کنویں کے پاس جاتا ہے، کنواں کبھی نہیں آتا پیاسے کی پیاس بجھانے کے لئے، سو مجبوراً مجھے آنا پڑا اور آپ کا دوسرے لوگوں سے لاتعلق رہنا بھی مجھے بہت عجیب بلکہ منفرد محسوس ہوا تھا۔''

''اس ساری جملے بازی کا مقصد کیا ہے؟'' صبا نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''مقصد آپ سے دوستی کرنا ہے۔''

''مگر مجھے آپ سے دوستی نہیں کرنا۔'' اس نے قطعی انداز میں جواب دیا۔

''کیوں؟'' اس نے اپنی روشن براؤن آنکھوں سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

''کیونکہ مرد اور عورت کی دوستی ہمارے مذہب اور معاشرے میں ممنوع ہے سمجھے آپ۔'' صبا نے نہایت سپاٹ لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گئی، وہ ''سنیئے سنیئے'' کرتا رہ گیا۔

☆☆☆

اور اگلی صبح وہ غیر ارادی طور پر اس کی آمد کی منتظر رہی، ابھی اس نے ایک چکر ہی لگایا تھا کہ وہ آن ٹپکا، ٹریک سوٹ میں بھی خاصا جچ رہا تھا اس نے سرسری نظر میں بھی اچھا خاصا جانچ لیا تھا اس کے سراپے کو۔

''ہیلو مس گڈ مارننگ۔'' وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولا۔

''آپ آج پھر آ گئے یہاں۔'' صبا نے رک کر اسے گھورا۔

''آپ بھی تو یہاں آج پھر آ گئی ہیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''میں یہاں مہینوں بلکہ ڈیڑھ سال سے آ رہی ہوں مسٹر۔''

''اسد۔''

''میرا نام اسد جعفری ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔

''تو آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟'' وہ تنک کر بولی۔

''ہم روز یہاں آتے ہیں، ملتے ہیں تو ہمیں

ایک دوسرے کے ناموں کا علم تو ہونا چاہیے نا، آپ کا کیا نام ہے؟"

"میں کسی اجنبی شخص کو اپنا نام نہیں بتایا کرتی۔"

"لیجیے، اجنبی کون ہے بھئی میں تو کئی ہفتوں سے آپ پر نظر رکھے ہوئے تھا، میرا مطلب ہے کہ آپ کو یہاں واک کرتے دیکھتا رہا ہوں اور کل کی ملاقات اور آج کے تعارف کے بعد میں آپ کے لئے اجنبی کیونکر رہا بتایئے تو ذرا۔" وہ دیوار کی طرح اس کے سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا اور وہ پہلی بار کسی مرد سے نروس ہو رہی تھی، مگر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"آپ یہاں آتے کس لئے ہیں؟" اس نے کڑے تیوروں کے ساتھ اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"آپ یہاں کس لئے آتی ہیں؟" وہ بھی سوال سے سوال نکالنے کا ماہر تھا۔

"میں تو یہاں واک کرنے آتی ہوں۔" اس نے تو پر زور دے کر کہا۔

"اور میں یہاں واک کرنے کے ساتھ ساتھ تازہ ہوا کھانے کے لئے آتا ہوں اور صبح کے سیر پر آنے کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کو قدرت کے بہت حسین مناظر دیکھنے کو ملتے رہتے ہیں۔" اسد نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے ذو معنی بات کہی، وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"تو جایئے دیکھیے قدرت کے حسین مناظر، مجھے کیوں گھور رہے ہیں؟"

"آپ بھی تو قدرت کے حسین مناظر کا ہی ایک حصہ ہیں۔" وہ شوخ نظروں شوخ لہجے میں بولا، وہ نروس سی ہو گئی اور سنجیدہ لہجے میں بولی۔

"آپ کو اگر بات کرنے کا بہت شوق ہے نا تو کسی اور کو پکڑیں۔"

"کسی اور کو کیوں آپ کو کیوں نہیں پکڑ لوں؟" وہ شریر نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا، اس کے دل کی دنیا میں بھونچال سا آ گیا اور ایسا پہلی بار ہوا تھا، وہ حیران تھی کہ وہ اس شخص کے سامنے محض دوسری ملاقات میں اتنی بے بس کیسے ہو گئی۔

"لگتا ہے آپ کو راہ چلتے راہ و رسم بڑھانے کی عادت ہے۔" صبا نے سنبھل کر بڑے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"تم کچھ بھی کہہ لو میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا، تمہیں مجھ سے بات کرنی ہی پڑے گی۔" وہ آپ جناب کی تمام دیواریں گراتا ایکدم سے تم پر آیا تو وہ ششدر رہ گئی، ایسا تو اس کے ساتھ کبھی نہیں ہوا تھا۔

"میں یہاں صرف واک کرنے آتی ہوں سمجھے۔" وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

"تو واک کے ساتھ ساتھ ٹاک بھی ہوتی رہے تو کیا حرج ہے؟" وہ بھی اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے بولا تو وہ اسے بس گھور کر رہ گئی۔

اور اب یہ روز کا معمول بن گیا تھا اور اسے ضرور ملتا، اس سے باتیں کرتا رہتا وہ بمشکل ہی اس کی کسی بات کا جواب دیتی، وہ آہستہ آہستہ اس کے دل و دماغ پر مسلط ہوتا چلا گیا اور جلد ہی اسے ادراک ہو گیا کہ وہ اسد سے محبت کرنے لگی ہے، وہ خوشی کے ساتھ ساتھ الجھن میں بھی مبتلا تھی، کہ اسد کو وہ لفٹ نہیں کراتی اس سے سیدھے منہ بات تک نہیں کرتی، اسے اس کا نام تک معلوم نہیں ہوا اب تک، اور وہ ہے کہ اسے اپنے دل کے آنگن میں خوبصورت تخت پر بڑی شان سے بٹھا چکی ہے، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے، اگلی صبح وہ واک کے لئے آئی

تو وہ پہلے سے ہی اس کا منتظر تھا۔

''گڈ مارننگ مس۔'' اسد نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

''گڈ مارننگ مسٹر۔'' اس نے اسی کے انداز میں جواب دیا تو وہ ہنس پڑا۔

''مجھے تو تمہارا نام معلوم نہیں ہے اس لئے مس کہہ کر مخاطب کرتا ہوں، تم نے مجھے مسٹر کیوں کہا جبکہ تم میرا نام بھی جانتی ہو؟'' اس نے اس کے قریب آ کر پوچھا۔

''نام لے کر انہیں پکارا جاتا ہے جس سے دوستی ہو بے تکلفی ہو اور تم سے......''

''ایک سکینڈ۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

''تم نے مجھے تم کہا ہے ابھی اور بے تکلفی کے لئے تم ہی پہلی سیڑھی ہوتی ہے اس کے بعد تو سب چلتا ہے، رہی بات دوستی کی تو تم مجھ سے دوستی کر لو۔''

''میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ مرد اور عورت کی دوستی کو ہمارے مذہب اور معاشرے میں ناپسندگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔'' صبا نے اپنی خجالت مٹانے کو سپاٹ لہجے میں کہا تو وہ شوخی سے بولا۔

''چلو دوستی بعد میں کر لینا، پہلے تم مجھ سے شادی کر لو۔''

''کیا؟'' وہ حیران ہو کر چیخ اٹھی۔

''دماغ تو درست ہے تمہارا؟''

''ہاں میرا دماغ تو سو فیصدی درست ہے البتہ تمہارے دماغ میں خلل ہے جسے میں ہی دور کر سکتا ہوں۔'' وہ بڑے معنی خیز لہجے میں بولا۔

''فضول باتیں مت کرو۔'' وہ تپ کر بولی۔

''تو تم مجھ سے شادی کر لو۔'' اس نے فوراً کہا۔

''ہمارے مذہب اور معاشرے میں مرد اور عورت کی شادی کو تو ناپسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا نا۔''

''تم مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہتے ہو تمہارے اپنے خاندان میں بھی تو لڑکیاں ہوں گی، خوبصورت اور پڑھی لکھی۔'' اس نے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہاں لڑکیاں تو بہت سی ہیں مگر تم جیسی ایک بھی نہیں ہے وہ سب تو ہار ماننے والی، ہاں میں ہاں ملانے والی، ایک نگاہ پر موم کی طرح پگھل جانے والی ہیں اور مجھے منفرد لڑکی کی تلاش تھی، تمہاری طرح کی لڑکی کی جو اپنی رائے، اپنی مرضی، اپنی سوچ رکھتی ہو، اس کے اظہار کی طاقت اور جرأت رکھتی ہو، جو مجھ سے میری سطح پر آ کر بات کرنے کا فن جانتی ہو مجھے لاجواب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو اور یہ سب صلاحیتیں تم میں ہیں، میں تم سے اس لئے بھی شادی کرنا چاہتا ہوں کیونکہ تم مجھے اچھی لگتی ہو اور میں تم سے محبت کرتا ہوں، کیا یہ سب باتیں کافی نہیں ہیں تمہیں پرپوز کرنے کے لئے؟'' اسد نے سنجیدگی سے بتانے کے بعد آخر میں اس سے پوچھا۔

''شاید نہیں۔'' وہ حیرت، خوشی اور بے یقینی کی سی کیفیت میں بولی۔

''کیونکہ مرد کو موم کی گڑیا، مٹی کی مادھو، اور اللہ میاں کی گائے نما لڑکیاں ہی پسند ہوتی ہیں، ایسی لڑکیاں جو مرد کے اشاروں پر عمل کریں، اس کا کہا صرف آخر سمجھ لے، جو اس کا مرد کہے اس پر عمل پیرا ہونا وہ اپنے ایمان کا حصہ بنا لیتی ہیں، اس سے دب کر سہم کر رہنے والی لڑکیاں ہی مرد کو اچھی لگتی ہیں، مرد تو عورت کو اپنے پاؤں کی جوتی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تو بھلا کوئی مرد یہ کیوں

چاہے گا کہ اس کی عورت اس کی بیوی اس کی سوچ کی سطح پر اس کے برابر آ کر سوچے اس سے بحث کرے، نہیں مسٹر اسد جعفری مرد ایسا کبھی نہیں چاہتا۔''

''خاصا تجزیہ کر چکی ہو مردوں کے متعلق۔'' وہ ہنس کر بولا۔

''تم بھی تو خاصا تجزیہ کر چکے ہو لڑکیوں کے متعلق اور آخر میں میرے پاس آئے ہو۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا تو وہ ہنسنے لگا۔

''اب آ ہی گیا ہوں تو کیا تم مجھے خالی ہاتھ لوٹا دو گی؟''

''اس کا فیصلہ تو میرے والدین کریں گے۔''

''او کے تم اپنا نام پتا تو لکھوا دو مجھے۔'' وہ تھک کر بولا اور اپنی کار میں سے کاغذ قلم نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا، اس نے اپنا نام اور پتا کاغذ پر لکھ کر اسے تھما دیا۔

''او کے صبا، باد صبا کل صبح ملاقات ہو گی بائے۔'' وہ اس کا نام پڑھ کر اسے دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے بولا تو وہ بھی مسکراتی ہوئی گھر کی جانب چل پڑی۔

اور اسے حیرت اس وقت ہوئی جب اسد اسی شام اپنے والدین کے ہمراہ اس کے گھر کے ڈرائنگ روم میں موجود تھا، اس کے والدین نے صبا کے لئے اس کا رشتہ لانے کی غرض پیش کی جو صبا کے والدین نے سوچنے کی مہلت کے ساتھ قبول کر لی۔

☆☆☆

''صبا بیٹی تمہارا کیا خیال ہے اسد کے بارے میں اس نے تمہیں پارک میں واک کرتے ہوئے دیکھا تھا وہیں سے پیچھا کرتا یہاں تک آیا ہے، ہمیں تو پسند ہے لڑکا تم اپنی بتاؤ۔'' رات کو ممی نے اس کی رائے جاننے کے لئے کہا۔

''ممی آپ اور ڈیڈی جو فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہو گا۔'' اس نے حجاب آمیز لہجے میں کہا تو وہ خوش ہو گئیں۔

''شکر ہے تمہیں بھی کوئی پسند تو آیا، بس اب تمہارے ڈیڈی اسد کے متعلق ضروری چھان بین کرنے کے بعد اس کے گھر والوں کو جواب دے دیں گے۔'' ممی نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی خوشی سے مسکرا دی۔

''تم تو بہت جلد باز نکلے صبح ایڈریس لیا اور شام کو گھر بھی پہنچ گئے، میں کہیں بھاگی تھوڑی جا رہی تھی۔'' صبح واک پر آتے ہی اس نے اسد سے کہا تو وہ مذاق سے بولا۔

''کیا خبر کہیں بھاگ ہی جاتیں؟''

''بکومت۔'' اس نے اسے گھورا، لبوں پر مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔

''اچھا یہ بتاؤ کیا فیصلہ ہوا؟''

''اتنے بے صبرے کیوں ہو رہے ہو، انتظار کرو ممی ڈیڈی ہفتے دس دن میں اچھی طرح سوچ سمجھ کر تمہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیں گے۔'' صبا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور تمہارا فیصلہ کیا ہو گا؟''

''وہی جو میرے والدین کا ہو گا۔''

''خواہ وہ اقرار کریں یا انکار کر دیں تب بھی تم ان کا فیصلہ مانو گی۔'' وہ نجانے کیا کہلوانا چاہ رہا تھا سنجیدہ ہو کر بولا۔

''ظاہر ہے۔'' وہ ہنس پڑی اور وہ کچھ بولتے بولتے رہ گیا۔

☆☆☆

اور چند دن بعد صبا کے گھر والوں نے اسد کا پرپوزل قبول کر لیا، شادی کی تاریخ طے کر دی گئی، دونوں گھرانوں میں شادیاں کی تیاریاں

عروج پر تھیں اور وہ دونوں روزانہ صبح کی سیر کے لئے پارک میں بدستور جاتے اور ملتے رہے شادی میں صرف پندرہ دن باقی رہ گئے تھے، شادی کے دعوت نامے تقسیم کیے جا چکے تھے، کہ اس صبح اسد نے نہایت سنجیدگی سے صبا سے کہا۔

''صبا تم کل سے یہاں مارننگ واک کے لئے نہیں آؤ گی۔''

''ایوننگ واک کے لئے تو یہاں آ سکتی ہوں نا۔'' وہ اس کی بات مذاق سمجھتے ہوئے مسکراتے ہوئے بولی۔

''ہرگز نہیں۔'' وہ بے حد سنجیدہ لہجے میں بولا تو اب کی بار وہ چونکی اور حیرت سے پوچھا۔

''کیا مطلب ہرگز نہیں؟''

''ہرگز نہیں کا مطلب ہے کہ تم یہاں کل سے نہیں آؤ گی اب ہم شادی کے دن ہی ملیں گے اور یہ میرا حکم ہے۔''

''واہ بھئی حاکم بنے نہیں اور حکم پہلے ہی صادر کرنا شروع کر دیئے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی تو وہ سنجیدگی سے بولا۔

''میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم میرا حکم مانتی ہو یا نہیں۔''

''تو شادی کے بعد دیکھنا جب تم میرے حاکم اور مختار بن جاؤ گے ابھی کیوں؟''

''ابھی اس لئے کہ میں جاننا چاہتا ہوں کہ تمہارے دل میں میرے لئے کوئی جذبہ ہے محبت کی کوئی کلی کھلی ہوئی ہے یا صرف میں ہی راہ محبت پر چل رہا ہوں، اس کے لئے تمہیں میری یہ بات ماننا ہوگی، اگر تمہیں مجھ سے محبت نہ ہوئی تو یقیناً تم کل صبح یہیں ملو گی دوسری صورت میں تم یہاں نہیں آؤ گی او کے بائے بائے باد صبا۔'' وہ اپنی بات مکمل کر کے چلا گیا۔

''تو نہیں برداشت کر سکے نا اسد تم یہ بات کہ میں نے تم سے اپنی محبت کا اظہار کیوں نہیں کیا؟ تم ہارنا نہیں چاہتے نا حالانکہ تم ہار چکے ہو یہ جیت زبردستی تم اپنی جھولی میں لانا چاہتے ہو، آخر ہو نا ایک مرد ایک عام مرد۔'' صبا نے اسے اپنے دل میں مخاطب کر کے کہا۔

اور وہ ایک کمزور لڑکی نہیں تھی جو اس کے سامنے ہار مان لیتی مگر وہ اتنی بہادر اور نڈر بھی نہیں تھی کہ اپنی انا کی جیت کی خاطر اپنی محبت ''اسد'' اور اپنے ممی ڈیڈی کی عزت سے کھیل جاتی، اس کے انکار سے اسد شادی سے انکار کر کے اسے اور اس کے گھر والوں کو معاشرے میں تماشا بنا سکتا تھا اور اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا، ممی ڈیڈی بھائی بہنوں کے چہروں پر اس کی شادی کی خبر نے کتنی خوشیاں بکھیر دی تھیں، سب کو کتنا ارمان تھا اس کی شادی کا اب وہ اسد کی بات نہ مان کر ان کے ارمان کا خون نہیں کر سکتی تھی، ممی ڈیڈی کا سر جھکا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی سو اس نے ان سب کی عزت کی خاطر اپنی عزت اپنی انا کو قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا، اسد کی بات بلکہ حکم ماننے پر رضا مند ہو گئی، حالانکہ اس فیصلے سے اس کی انا پر کاری ضرب لگی تھی، مگر وہ سہہ گئی کہ یہ اس کے گھر والوں کی خوشی اور اپنے دل کے جیت کو پانے کا واحد راستہ اور حل تھا۔

یوں وہ اگلے دن سے مارننگ واک پر نہیں گئی، اسد باقاعدگی سے جاتا رہا اور اسے موجود نہ پا کر دلی تسکین محسوس کرتا رہا۔

شادی کے دن وہ بجی سنوری اس کے بیڈ روم میں اس کے سامنے اس کی ملکیت بنی بیٹھی تھی۔

''گڈ مارننگ، اوہ سوری گڈ ایوننگ صبا اسد جعفری۔'' اسد نے اس کا گھونگھٹ الٹ کر مسکراتے ہوئے کہا تو اس نے نظریں اٹھا کر اس

کے چہرے کو دیکھا جہاں فاتحانہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

"گڈ مارننگ کہتے کہتے عادت سی ہو گئی ہے، تمہیں گڈ مارننگ کہنے کی اب تو ہر روز ہر صبح آنکھ کھلتے ہی گڈ مارننگ کہا کریں گے، صبا آج میں بہت خوش ہوں۔" وہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"میری ہار سے۔" صبا نے آہستہ سے لب کھولے۔

"ہاں۔" وہ ہنس پڑا اور پھر بولا۔

"صبا ڈیئر ہار تو عورت کا مقدر ہے اور جیت صرف مرد کو ہی زیب دیتی ہے، عورت کبھی مرد کو اپنے تابع نہیں کر سکتی اس پر حکم نہیں چلا سکتی یہ اعزاز صرف مرد کو بچتا ہے کہ وہ عورت کو اپنا تابع بنا کر رکھے اس پر حکم چلائے اور اپنی ہر بات منوائے۔"

"ہر بات؟" صبا نے احساس شکست سے چور چور ہوتے ہوئے اسے دیکھا۔

"ہاں ہر بات۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"جیسے تم نے میری بات مان کر ثابت کیا ہے کہ تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، مجھے واقعی آپ سے محبت ہو گئی تھی۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"تو اب اپنی محبت کو پا کر تمہیں خوشی نہیں ہوئی کیا؟"

"آپ کو خوشی ہوئی ہے اپنی محبت کا اعتراف اس طرح سے کروا کر۔" صبا نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا تو وہ ہنس کر بولا۔

"ظاہر ہے، میری خوشی تو ڈبل ہے، صبا اگر تم پہلے ہی مجھ سے اپنی محبت کا اقرار و اعتراف کر لیتی تو میں کبھی بھی یہ انداز اختیار نہ کرتا، مگر تم نے کچھ بھی ظاہر نہیں کیا اور مرد ہونے کے ناطے تمہارا یہ رویہ میرے لئے چیلنج بن کر گیا تھا سو تم ہار گئیں میں جیت گیا، مرد کو اپنی شکست کبھی قبول نہیں ہوتی اور مرد کو چیلنج کرنے والی عورت سے زیادہ احمق کوئی نہیں ہوتی، خیر ہم بھی کیا قصہ لے بیٹھے محبت میں کیسی ہار جیت؟ محبت میں تو دونوں فریق برابر ہوتے ہیں۔"

"سوچ لیجئے کیا واقعی دونوں فریق برابر ہوتے ہیں؟" صبا نے سنجیدگی سے کہا تو وہ ہنس پڑا اور اسے خود سے قریب کرتے ہوئے بولا۔

"او کم آن صبا ڈارلنگ! غصہ اور ناراضگی جانے دو، تمہارے لئے یہ بات اہم ہونی چاہیے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور ہاں کل سے ہم دونوں اکٹھے جایا کریں گے۔"

"کہاں؟" وہ دبی دبی آواز میں بولی۔

"مارننگ واک پر۔" اسد نے مسکراتے ہوئے کہا تو اس نے مسکراتے ہوئے نظر کے ساتھ سر بھی جھکا لیا، اس کی محبت کے سامنے سر تسلیم خم کر لیا، کیونکہ اب وہ مکمل طور پر یہ بات سمجھ گئی تھی کہ مرد کی ہر معاملے، مسئلے اور مرحلے میں عورت کو شکست دیتا چلا آیا ہے سوائے مہر و وفا کے، مرد کی محبت اور پسند تو ہر مارننگ واک میں بدلتی رہتی ہے، وہ عورت کی محبت میں ہار کر بھی اپنی ہار تسلیم نہیں کرتا، قدرت نے اسے عورت سے برتر بنایا ہے، مگر وہ اس سے کہیں زیادہ برتر بننے کی کوشش میں ہمہ وقت عمل پیرا رہتا ہے، اپنی مات اپنی ہار اپنی شکست کسی طور قبول نہیں کرتا، جبکہ عورت اپنی ہر مات اپنی ہر ہار اپنی ہر شکست اپنے مرد کی محبت میں اپنے محبوب شوہر کی چاہت میں اپنے مجازی خدا کے عشق میں دل و جان سے قبول کر لیتی ہے، کہ یہی اس کی فتح ہے، یہی اس کی جیت اور یہی اس کا اعزاز بھی ہے۔

☆☆☆

''میں کچھ نہیں جانتی تم نے آنا ہے یا نہیں۔'' اس کی سپاٹ اور غصے میں ڈوبی ہوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی ایک لمحے کے لئے اس کا دل دھڑکنا بند ہو گیا تھا، اس کی ناراضگی وہ کسی طور برداشت نہیں کر سکتا تھا اگر کبھی وہ غصہ کر کے فون بند کر دیتی تھی تو وہ اس وقت فون کرتا رہتا تھا جب تک وہ فون اٹھا نہ لیتی تھی اور اکثر ایسا ہوتا کہ وہ فون سوئچ آف کر دیتی تھی اور وہ پاگلوں کی طرح اس کو کتنے ہی ایس ایم ایس کرتا رہتا تھا اس وقت تک جب تک اس کا ری ریپلائے نہ آ جاتا اس کی دیوانگی اور جنون دن بدن بڑھتے ہی جا رہے تھے۔

''پلیز یار سمجھا کرو چھٹی مانگی ہے لیکن نہیں ملی۔'' شاکر نے حتی الامکان اِدھر اُدھر دیکھا تھا ہر کوئی اپنے اپنے کام میں مگن تھا، اگر چہ اس کی آواز بہت ہلکی تھی لیکن پھر بھی وہ محتاط انداز میں بات کر رہا تھا۔

گیارہ بجنے کو آئے تھے اس لئے وہ برانچ سے جا بھی نہیں سکتا تھا اور وہ تھی کہ بغیر بات سنے عذر جانے ناراض ہو رہی تھی مسلسل۔

''تو ٹھیک ہے پھر نہ آؤ، میں انتظار کروں گی ایک بجے تک اگر پھر بھی تم نہ آئے تو پھر کبھی نہ آنا سمجھے۔'' وہ اپنی بات مکمل ہونے کے ساتھ ہی فون کاٹ چکی تھی جبکہ وہ دیوانوں کی طرح میری بات تو سنو، میری بات تو سنو کرتا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

کنول کی محبت نے اس کو بزدل بنا دیا تھا اس کی محبت دن بدن شاکر کی رگوں جاں میں سرائیت کرتی جا رہی تھی اور وہ آوارہ بادل کی طرح یہاں وہاں ڈولنے لگا تھا، بن بادل برسات کی طرح کسی پر بھی برسنے لگتا تھا، آواز میں حلیمی وحلاوت گھل گئی تھی تو وہیں طور اطوار میں سدھار سا آ گیا تھا، پہلے پہل وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر چڑھ جاتا تھا آپے سے باہر ہو جایا کرتا تھا مار دھاڑ سے کام لیتا تھا، لیکن اب کچھ عرصے سے مصلحت کی چادر اوڑھے ہوئے تھا کیا محبت انسان کو اتنا بدل دیتی ہے اس حد تک کہ زمین پر چلنے والے انسان کو ایسا محسوس ہونے لگے کہ وہ بادلوں کے سنگ ڈولنے لگا ہے معطر فضاؤں میں سانس لینے لگا ہے، کوہ ہمالیہ کی بلندیوں پر اس کا حوصلہ پرچم لہرانے لگتا ہے۔

''شاکر کھانا کھا لے۔'' اماں کی سپاٹ دار آواز میں بھی اس کو جانے کیوں مٹھاس سی گھلی ہوئی لگ رہی تھی، لیکن وہ اوندھے منہ سویا رہا تھا اس طرح سے کہ اس کی نظریں فرش پر جمی ہوئی تھیں، خیالات تیتر بتر ہوئے تھے دل کسی کے قدموں میں پڑا دھڑک رہا تھا اور ذہن کی کھڑکیوں میں اس کی یاد کے دیو نے روشنی پھیلائی ہوئی تھی۔

''آج آفس نہیں جانا شاکر طبیعت تو ٹھیک ہے تیری۔'' اماں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا اس نے قصداً اپنی آنکھیں بند کر دی تھیں۔

''اماں ابھی تو کافی دیر ہے آفس میں۔'' اس نے کسلمندی سے کہا تھا اماں کی بھٹکتی نگاہیں وال کلاک پر اٹھیں تھیں جہاں نو بج چکے تھے۔

''نو بج گئے ہیں پتر طبیعت تو ٹھیک ہے تیری تو دو دن سے کچھ ڈھیلا لگ رہا ہے مجھے بتا کیا بات ہے۔'' اماں کی فکر مندی میں گھلی ہوئی آواز بھی اس کے دل کی بے کلی کو دور نہیں کر سکی تھی، وہ کیا بتاتا کہ اس کو تو بہت عرصہ ہو چلا تھا، نیندیں گنوائے ہوئے، سوچوں کو گروی رکھے ہوئے اور تو اور اب تو آنکھوں نے بھی رنگ برنگے چہرے دیکھنے سے انکار کر دیا چہرے میں ایک ہی صورت کو کھوجنے کی چاہ اس کی آنکھوں

میں سما گئی تھی وہ پاگلوں اور دیوانوں کی طرح کتنی ہی لڑکیوں میں اس کی شبیہ تلاشتا تھا اس بات سے بے نیاز کہ اس کو آفس میں سخت تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا تھا لڑکیاں اس سے بات کرنے سے گریز کرنے لگی تھیں اور تو اور صدف (آفس کی سب سے تیز طرار لڑکی نے) یہاں تک کہہ دیا تھا، ''شاکر بھائی آپ کی تو نظریں بہت ہی بے لگام اور خراب ہو گئی ہیں ہر لڑکی کو آپ ایسے گھورتے ہو جیسے کھا جاؤ گے۔'' بجائے شرمندگی و خجالت کے اس نے سر جھکا لیا تھا، ہونٹوں پر ایک شرمیلی اور دھیمی مسکراہٹ نے ہونٹوں کا احاطہ کر لیا تھا، صدف پاؤں پٹخ کر جا چکی تھی وہ ہنوز سامنے کھلی ہوئی فائل کے آخری کونے میں اپنی قسمت کھوج رہا تھا۔

☆☆☆

''اب اٹھ بھی جا چاپٹر کیوں نحوست پھیلا رکھی ہے تو نے، نورا نے صفائی بھی کرنی ہے سارا گھر صاف ہو گیا ہے لیکن تیرے کمرے میں دنیا جہان کا گند جوں کا توں پڑا ہے۔'' انہوں نے ناک سکیڑ کر سامنے دیکھا تھا جہاں کا غذوں کا پلندہ چائے کے تین خالی مگ راکھ سے بھرا فل ایش ٹرے اور میز پر دھرے کھانے کے برتن پڑے تھے اور ان پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اس پر میز کے نیچے شاکر کے جوتے اور موزوں کی بد بو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی، جبکہ وہ ہنوز یونہی لاپرواہی اور بے پرواہی سے لیٹا ہوا تھا، جب اس نے دیکھا اماں کسی طور وہاں سے نہیں ٹل رہی آخر وہ اٹھ بیٹھا تھا، اماں میں بس پندرہ منٹ میں تیار ہو کر آتا ہوں، اس نے گھڑی پر نگاہ دوڑائی تھی اور کمرے سے نکل گیا تھا جبکہ اماں تشویش بھرے انداز میں اس کو دیکھتی رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

اس نے پہلی بار اس کو ایڈمن برانچ میں دیکھا تھا وہ روز کے معمول کے مطابق سگریٹ پینے کے لئے ایڈمن برانچ کے پچھلی جانب بنے ہال میں کھڑا ہو کر سگریٹ پھونک رہا تھا اس کو جب بھی سگریٹ کی طلب ہوتی تھی وہ اسی جگہ آ کر پیتا تھا کیونکہ اکاؤنٹ برانچ آفیسر نے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ برانچ کے اندر کوئی بیٹھ کر سگریٹ نہیں پیئے گا، شاکر جیسا اتھرا اور لڑاکا نوجوان ان کی باتوں کو سگریٹ کے دھوئیں کی طرح اڑاتا آیا تھا لیکن جب سے اس کی برانچ میں دو لڑکیاں آئی تھیں تب سے وہ اکثر برانچ سے نکل کر سگریٹ پیتا تھا، سگریٹ پینے کے ساتھ ساتھ وہ گلاس وال سے برانچ میں بھی جھانک لیتا تھا اور تبھی اس کی نگاہیں ایک لمحے کو ٹھٹکی تھیں الجھی تھیں اور پھر ساکت ہو گئی تھیں، وہ ٹکٹکی باندھے یک ٹک مقابل کو دیکھ رہا تھا، دم سادھے سانسیں باندھے اس کی نگاہیں اس کے چہرے میں الجھ سی گئی تھیں، جبکہ وہ شان بے نیازی سے گردن اکڑائے لڑاکا عورتوں کی طرح لڑنے میں مگن تھی یہ وہی تو تھی جو پچھلی بار بھی شاکر کو نظر آئی تھی لیکن اب...... اب تو اس کا دل بھی یک بارگی دھڑکنے لگا تھا سامنے بیٹھی فاطمہ خفت کا شکار تھی اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، شاکر نے ادھ جلا سگریٹ زمین پر پھینک کر جوتے کی ٹو سے مسلا تھا بال سنوارے تھے اور سرعت سے گلاس ڈور کھول کر ایڈمن برانچ میں داخل ہو گیا تھا۔

''خیریت میں فاطمہ کیا ہوا ہے؟'' شاکر نے ہوائیاں اڑاتا فاطمہ کا چہرہ جانچنا چاہا تھا اور ساتھ ہی ایک محتاط نگاہ ایس ایم ایس کرتی لڑکی پر ڈالی تھی جس کی انگلیاں تیزی سے ایس ایم ایس ڈائل کر رہی تھیں سفید مرغابی جیسی رنگت کے

ہاتھ اور مخروطی انگلیوں کو وہ سحر زدہ سا ہو کر دیکھ رہا تھا، اس نے چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا شاکر نے قصداً نگاہ موڑ لی تھی اور ساتھ ہی نظروں کا زاویہ بھی بدل لیا تھا حالانکہ نگاہیں موڑنا اس کے لئے دنیا کا مشکل ترین کام ثابت ہو رہا تھا۔

''یہ کیا بتائیں گی میں خود ہی بتاتی ہوں، انہوں نے میرا پارسل اس ایڈریس پر بھجوانے کے بجائے یہاں بھیج دیا ہے، مس فاطمہ یہ کیسے ہوا آپ نے غور سے نہیں دیکھا تھا ان کا ایڈریس۔'' شاکر نے رجسٹر کھول کر سرسری انداز میں کہا تھا جبکہ اس کی نگاہیں بھٹک بھٹک کر اس کے نمبر پر اٹھ رہی تھیں، اس نے نمبر پر تین چار بار نظر دوڑا کر رجسٹر بند کر دیا تھا ذہن نے ہندسوں کو اپنے اندر نقش لیا تھا۔

''دیکھئے مس وہ معافی مانگ رہی ہے غلطی انسانوں سے ہی ہوتی ہے۔'' اس نے متانت سے کہا تھا اور جیب سے سیل نکال کر نمبر سیو کر لیا تھا، اس کا انداز اتنا میچور تھا کہ شاید ہی کسی نے نوٹ کیا ہوگا۔

''غلطی اگر میں ان کی ایک شکایت کر دوں تو ان کو لگ پتہ جائے گا لیکن میں ایسا نہیں کروں گی۔'' اس نے کہہ کر دوبارہ سے سیل کو دیکھا تھا۔

تبھی اس کے بجتے سیل نے اس کی ساری توجہ کا ارتکاز درہم برہم کر دیا تھا۔

''کہاں ہو، تمہارا دماغ خراب ہے اتنی گرمی میں، میں باہر آؤں گی، میں گیٹ کے اندر تک رکشہ لے آؤ، اوہ میرے بھائی یہ گورنمنٹ کا ادارہ ہے کسی کے باپ کی جاگیر نہیں۔'' وہ دانتوں تلے چھالیوں کے ساتھ ساتھ فاطمہ کا صبر اور اس کی برداشت کی حدیں بھی کتر رہی تھی۔

جبکہ شاکر انتہائی دلچسپی سے اس کو دیکھ رہا تھا، اس طرح سے جیسے اس نے پہلی بار کسی لڑکی کو دیکھا ہو یا پھر ایسی بھرپور چہکتی ہوئی شوخ و دبنگ اور بولڈ لڑکی پہلی بار دیکھی ہو، اس کا جی چاہ رہا تھا یونہی بے خودی کے عالم میں وہ اس کو دیکھتا رہے۔

''اب اس کی رسید آپ ابھی دیں گی یا اگلے سال ملے گی مجھے۔'' وہ استہزائیہ انداز میں بولی تھی اور شاکر قہقہہ بار ہوا تھا، لڑکی نے انتہائی اچنبھے سے اس کی جانب دیکھا تھا، جو حلیے سے مضحکہ خیز اطوار میں بدحواس، لیکن سبھاؤ اور گفتگو کی نشست و برخاست کا انداز کس طور نظر انداز کرنے کے قابل نہیں تھا فاطمہ نے برا سا منہ بنا کر رسید دے دی تھی، لڑکی نے بھنا کر رسید کسی غیر اہم چیز کی طرح ہاتھ میں مسل کر تڑمڑ کر کے پرس کی داخلی جیب میں ڈال دی تھی۔

''ایسے جیسے وہ اپنی ساری کوفت ساری جھنجلاہٹ ساری خجلت اس رسید پر نکالنے کا حق رکھتی ہو۔'' فاطمہ نے اس کو اگنور کرنے کے لئے دانستہ رجسٹر کھول لیا تھا، تماشا ختم ہو گیا تھا مداری نے اپنا تماشا دکھا دیا تھا، Showman کا کام ختم ہو چکا تھا، اس لئے لمبی لمبی گردنیں اب جھک گئی تھیں، آنکھیں اپنے کاموں میں مگن ہو گئی تھیں، ایک شاکر ہی تھا جو کسی بچے کی طرح دیوانگی اور والہانہ پن سے آنکھوں میں اشتیاق لئے اس کو دیکھ رہا تھا اس کی نظروں کا ارتکاز ہی تھا کہ اس نے چونک کر استعجابیہ انداز میں اس کو دیکھا تھا یہ محض ایک لمحے کی بات تھی اگلے ہی پل وہ ایک بار پھر سے اپنے موبائل میں مگن ہو گئی تھی۔

''آ رہی ہوں تمہارے نخرے بڑھتے ہی جا رہے ہیں دن بدن۔'' وہ فون کان سے لگاتی تک تک چلی گئی تھی جبکہ شاکر کا دل کسی ضدی بچے کی طرح اس کی پیروی کرنے پر مصر تھا۔

سجن دے ہتھ بانہاں آساں دی
کی کر آکھاں چھڈ دے اڑیا

اس کے لبوں پر بے ساختگی سے اشعار مچلے تھے۔

"بھائی وہ چلی گئی ہے کیا اب نظروں تک سے ہی اس کے پیچھے جاؤ گے۔" حسین نے اس کے قریب آ کر چھیڑا تھا، وہ کافی دیر سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

"یار کبھی دل اتنا ارزاں نہیں ہوا اتنی بے تابی و مشاقی سے نہیں دھڑکا کچھ دیر پہلے تو ایسے لگنے لگا تھا جیسے پسلیوں کا پنجرہ توڑ کر خود کو آزاد کرانے کے درپہ ہو گیا ہو۔" شاکر نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔

"ہوتا ہے ایسا کبھی کبھار کچھ چہرے کچھ انداز دل میں کھب سے جاتے ہیں لیکن محترمہ زور آور ہیں بہت پنسل ہیل تمہاری کھوپڑی میں فکس کر دینے کا حوصلہ رکھتی ہیں اپنی فاطمہ کو ہی دیکھ لو کیا حال کر دیا ہے اس کا۔"

"ذرا دھیان سے میرے بھائی منہ کی نہ کھا بیٹھنا۔" وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چلا گیا تھا لیکن حسین کے الفاظ بھی اس کی بے کلی اور اچانک چھانے والی بے سکونی کو کم کرنے کو کافی نہ تھے۔

☆☆☆

"ہیلو کون ہے بھئی؟" اس کی سرد جھنجلائی ہوئی آواز ائیر پیس میں ابھری تھی اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہونے لگے تھے۔

"السلام علیکم!" اتنے ڈرتے ڈرتے سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام! جی فرمایئے کس سے بات کرنی ہے۔" ہر قسم کے جذبات سے عاری لہجہ سپاٹ انداز اور کچھ کچھ غصے میں جلبلائی زبان نے اس کے دل کو انجانے خدشات کا شکار کر دیا تھا۔

"وہ......وہ...... میں شاکر بول رہا ہوں۔" اس نے بامشکل حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکالی تھی۔

"کون شاکر۔" دوسری جانب وہ قطعی طور پر اس کے وجود سے انجان تھی۔

"وہ کل آپ آئی تھیں ناں آفس۔" اس نے مرتا کیا نہ کرتا مصداق اپنا حوالہ بھی دے دیا تھا اور بات بھی ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"اوہ۔" اس نے سیٹی کی طرح اوہ کہا تھا اور ایک لمحے کو خاموش ہو گئی تھی شاکر کے دل کو گونا گو اطمینان ہوا تھا۔

"تو پھر میں کیا کروں۔" لیکن اس کے اگلے الفاظوں نے ڈھارس اور تقویت کی سیڑھی کھینچ لی تھی۔

"آپ مجھے بہت اچھی لگی ہیں۔" اس نے کسی ڈرے سہمے بچے کی طرح اپنے گناہ کا اعتراف کیا تھا اور کھٹ سے فون بند کر دیا تھا، اس کے منہ سے انکار سننا وہ برداشت نہ کر پایا اور انکار کے بعد رابطہ کرنے کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا، لیکن آدھے گھنٹے کے بعد ہی کال می کے ایس ایم ایس نے اس کے پاؤں تلے سے زمین نکال دی تھی، ایک منٹ دیر کیے بنا اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ کال کی تھی، دوسری جانب سے فوراً کال ریسو کر لی گئی تھی۔

"بات ادھوری کیوں چھوڑ دی تھی آپ نے۔" اس نے انتہائی نرمی اور حلیمی سے استفسار کیا تھا، شاکر کو اپنی سماعت پر شبہ سا ہونے لگا تھا، وہ تو سخت سست سننے کا اندازہ لگا کر بیٹھا تھا، کجا کہ مہربانی اور عنایت کی جھلک دیکھنے کو مل جائے گی۔

"ڈر گیا تھا آپ سے۔" شاکر کے

الفاظوں کی ادائیگی کے فوراً بعد کنول کے قہقہے کی گونج نے اس کو اندر تک سرشار کر دیا تھا۔

"جب آپ نے میرا نمبر اپنے سیل میں سیو کیا تھا میں نے دیکھ لیا تھا لیکن ایک بات یاد رکھنا میں افیئر چلانے والی لڑکی نہیں ہوں۔" اس نے ایک ہی منٹ میں آپ جناب کی ساری دیواریں گرادی تھیں۔

"خدانخواستہ میں آپ کو ایسا نہیں سمجھتا نہ ہی میں ایسا ہوں، میں اگر آپ کی جانب بڑھ رہا ہوں تو میں آپ سے تعلق قائم کرنا چاہتا ہوں، ورنہ لڑکیاں تو بہت ہیں۔"

"خیر ایسی بات بھی نہیں ہے وہ ٹیڑھی میڑھی لڑکیاں میں نے دیکھی ہیں ہم سا ہو تو سامنے آئے۔" وہ تفاخر سے بولی تھی اور شاکر بے ساختہ ہنس دیا تھا۔

☆☆☆

"شاکر یہ دوسرا ہفتہ ہے تم ایک گھنٹے کی چھٹی کا کہہ کر جاتے ہو اور دو گھنٹے بعد ہی فون آ جاتا ہے آج فلاں کام ہے آج فلاں مسئلہ ہو گیا ہے آج میں تمہیں کسی قیمت پر چھٹی نہیں دوں گا۔" برانچ کے ہیڈ نے غصے میں فائل کھول لی تھی۔

"یہ اشارہ تھا کہ تم اب جا سکتے ہو۔" لیکن شاکر ابھی بھی سوال بڑھائے کھڑا تھا۔

دوسری جانب کنول تڑپی دے چکی تھی ساڑھے بارہ بج چکے تھے شاکر ملتجی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"پلیز سر آج دے دیں پھر نہیں مانگوں گا چھٹی۔"

"چیف صاحب سے جا کر چھٹی لے لو، اگر وہ دیتے ہیں تو۔" انہوں نے سرد مہری سے کہا تھا اور پھر سے اپنے کام میں مگن ہو گئے تھے، وہ جانتا تھا اب ان کی منتیں کرنا بے سود ہے، انکار کے بعد سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ چھٹی دے دیں گے حالانکہ رشوت کے طور پر شاکر نے پچھلی بار پوری برانچ کو کھانا کھلایا تھا اور تو اور افتخار صاحب کو تین آموں کی پیٹیاں بھی دی تھیں جو کہ انہوں نے ڈکار لی تھیں اور اب پھر نئے سرے سے کھاتہ شروع ہو گیا تھا۔

"لیکن یہ کوئی وقت ہے بلیک میلنگ کا۔" وہ ہڑبڑا کر رہ گیا تھا اور کسی اداس پنچھی کی طرح اپنی جگہ پر آ بیٹھا تھا اس نے کسی کا لحاظ مروت ڈسٹ بن میں ڈال کر جیب سے سگریٹ نکال لی تھی اور پے در پے سگریٹ پھونکنے لگا تھا۔

"خیر تو ہے بدلے بدلے میرے سرکار نظر آتے ہیں۔" سعد نے اداس سے منہ سر فائل پہ دیئے، شاکر کو چھیڑا تھا، وہ لال بھبھوکا چہرہ لئے فائل پر نظریں گاڑے بیٹھا تھا سعد کی جانب دیکھنا تو درکنار اس کی بات پر اس نے کان بھی نہیں دھرے تھے۔

"آج شاکر بھائی کو چھٹی نہیں ملی اس لئے خبردار جو کسی نے آج ان کو چھیڑا ہو یا تنگ کیا ہو۔" حسین نے معنی خیز انداز سے سعد کو دیکھا تھا، لیکن شاکر کو تو جیسے پرواہ ہی نہیں تھی وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا، اس نے سیل جیب سے نکالا تھا اور نمبر ڈائل کیا تھا لیکن دوسری جانب سیل آف تھا، محبوبہ کی ہلکی سی ناراضگی بھی ہارٹ فیل کرانے کا سبب بن سکتی ہے وہ بڑبڑایا تھا۔

دن میں کتنی ہی بار اس نے فون کیا تھا لیکن اس کا سیل ہنوز بند اس کا منہ چڑاتا رہا تھا۔

☆☆☆

"میں سوچ رہی ہوں فردوس کا رشتہ تیرے لئے مانگ لوں۔" کھانے کے دوران اماں نے کہا تھا اس کا سارا دھیان فون کی جانب تھا ان کی

بات کو سمجھنے کے بعد اس کو زور کا اچھو لگا تھا، نوالہ حلق میں پھنس گیا تھا، نہ وہ اس کو اگل سکتا تھا اور نہ ہی نگل سکتا تھا۔

"خیری صلا کیا ہو گیا ہے یہ گلاس پکڑ پانی پی۔" اماں نے گلاس اس کے ہاتھ میں پکڑایا تھا اور اس کی پیٹھ کو ہاتھ سے سہلا رہی تھیں۔

"کیا ہوا مرچیں زیادہ پڑ گئی ہیں ہانڈی میں۔"

"مرچیں زیادہ نہیں ہیں بس نمک ہی زیادہ ہے زندگی میں۔" وہ بڑبڑایا تھا۔

"خیریت تو ہے منہ میں کیا بڑبڑا رہا ہے۔" اماں نے اچنبھے سے اس کی جانب دیکھا تھا۔

"دیکھو اماں میں کسی فردوس وردوس سے شادی نہیں کروں گا اور لڑکی میں نے پسند کر لی ہے اور رہی فردوس کی بات تو، تو اس کی شادی امجد یا ارسلان سے کر دے مجھے بخش دے۔" وہ گلاس زمین پر پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

وہ کمرے سے جونہی باہر نکلا تھا سامنے ہی خالہ زینت کی بیٹی فردوس ہاتھ میں پلیٹیں تھامے ساکت کھڑی تھی اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ ساری بات سن چکی ہے لیکن پرواہ کسے تھی شاکر نے ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈالی تھی اور نخوت سے سر جھٹک کر باہر چلا گیا تھا۔

فردوس تو نجانے کون سی عمر میں شاکر کے حوالے سے خوابوں کو بنتی آئی تھی اس نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ شاکر کے علاوہ کوئی اور مرد اس کی زندگی میں شامل بھی ہو سکتا ہے، وہ کس طرح اس کے خواب توڑ سکتا ہے؟ سوالات کا ایک بے ہنگم ہجوم اس کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

☆☆☆

دو دن کے صبر آزما اور پر کٹھن طویل دن کے بعد اس نے فون آن کیا تھا جبکہ ان دو دنوں میں شاکر پل پل انگاروں پہ لوٹا تھا، بار بار کنول کا چہرہ آنکھوں کے آگے گھومتا تھا ساری ساری رات وہ سگریٹ پھونک پھونک کر گزارتا رہا تھا۔

"خیال آ گیا تمہیں میرا اب بھی آن نہ کرتی نمبر، کیا ضرورت تھی اب نمبر آن کرنے کی۔" وہ بلبلائے لہجے میں بولا تھا لیکن اس کے لفظوں میں فکر مندی اور تشویش ہویدا تھی، کنول بے ساختہ ہنس دی تھی، اس کی ہنسی کی جھنکار نے شاکر کا سارا غصہ ساری کلفت پل بھر میں ہوا میں تحلیل کر دی تھی، وہ خود کو اس کی جلترنگ ہنسی میں بھیگ کر ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

"تو کیا کرتی تم نے غصہ ہی اتنا دلا دیا تھا میں ایک بجے تک وہاں تمہارا انتظار کرتی رہی تھی لیکن تم نہیں آئے آخر میں خالہ کے گھر چلی گئی تھی احمد پور آج آئی ہوں آتے ہی نمبر آن کیا ہے۔"

"بہت مہربانی عنایت ہے آپ کی جو آپ نے مجھ پر رحم کیا ہے جانتی ہو دو دن سے ایک لقمہ بھی حلق سے نیچے نہیں اتارا۔" شاکر کی آواز کنول تک بھی آئی تھی۔

"اب بولو جان غصہ ٹھنڈا ہوا۔" شاکر نے حتی المکان اپنی آواز کو دھیما رکھا تھا لیکن سامنے رجسٹر پہ قلم سے لکھتی فاطمہ نے سر اٹھا کر اس کو دیکھا تھا اسی وقت شاکر کی نظر اس سے ملی تھی چور کی داڑھی میں تنکے کے مصداق اس نے سرعت سے منہ موڑ لیا تھا۔

"نہیں ہوا ختم ابھی میرا غصہ۔" دوسری جانب ترش سا جواب آیا تھا۔

"پلیز معاف کر دو تمہیں کیا پتہ کس کس اذیت کے پل صراط سے گزرا ہوں، نہ دن کو چین اور نہ رات کو سکون ملا، ہر رات تم سے باتیں

کر کے سوتا تھا کب بارہ بجتے تھے پتہ ہی نہیں چلتا تھا اور کب آنکھوں میں تمہارے تصور سے نیند سے بے حال ہو جاتا تھا پتہ نہیں لگتا تھا اور کہاں دو دن نیند آنکھوں کی کھڑکیوں پر اتری ہی نہیں، پورا پورا دن سگریٹ پھونک پھونک کر گزارا ہے اور تم ایسی کٹھور بن گئی تھی کہ ایک بار بھی مڑ کر نہیں پوچھا۔'' آخر شاکر کی زبان پر شکوہ ابھر آیا تھا، اس نے اپنے دل میں محبت اور محبوب کے لئے کچھ اصول بنا لئے تھے کہ محبوب کے لئے زبان پر شکوہ لانا گالی دینے کے مترادف ہو گا لیکن آج بے ساختہ یہ گالی اس کے لبوں پر آ کر ٹھہر گئی تھی۔

''ان باتوں کو چھوڑو یہ بتاؤ رشتے کی بات کب کرو گے اپنے گھر میں۔''

''کہو تو آج بھی کر دوں۔'' اس نے شرارت سے پوچھا تھا جبکہ دوسری جانب وہ کھلکھلا کر ہنس دی تھی، پھر بولی۔

''کر دو۔'' شاکر قہقہہ بار ہوا تھا۔

کچھ دیر بات کرنے کے بعد فون بند کر دیا، آج اس کو ایسا لگ رہا تھا جیسے منوں کے حساب سے بوجھ اس کے سر سے سرک گیا ہو۔

☆☆☆

''یہ کسی صورت بھی نہیں ہو سکتا میں نے تیری شادی فی الحال کرنی ہی نہیں ہے پانچ سال تک اور اگر کرونگی بھی تو صرف فردوس سے کس اور سے نہیں۔'' اماں نے صاف ہری جھنڈی دکھائی تھی۔

''او یہ بتا ناں مجھے کس عمر میں کرے گی میری شادی بتیس سال کا میں اب ہوں چالیس سال کی عمر میں میرا ویاہ کرا کے تو کون سا احسان کرے گی مجھ پہ کمالے کی شادی تو نے بائیس میں کر دی تھی ندیم کو تو نے پچیس میں ویاہ دیا اب کیا امجد اور ارسلان کے بعد مجھے بیاہے گی۔'' وہ روہانسا ہو کر بولا تھا۔

''کمالا کوئی کم دھندا نہیں کرتا تھا الٹا مجھ سے خرچہ لیتا تھا اب اس نکمے کو سسرال والے پال رہے ہیں، ندیم بھٹے یہ کام کرتا تھا کیا کماتا تھا تجھے بھی پتہ ہے تیرا کلا باپ کمانے والا ہے اس کے بعد تو ابھی تو میں نے گڑیا کو بھی ویاہنا ہے اور سو خرچ ہیں تو نے تو سیکنڈ ٹیم وی دکان کھولی ہوئی ہے باہر کی عورت لے آئی تو تیرا سارا پیسہ اپنی جھولی میں ڈال لے گی اور میرے سر پر ناچے گی نہ بھی نہ، تیری شادی صرف فردوس سے ہی ہو گی بس، اماں دیکھو کنول بہت اچھی ہے میں بس اسی سے شادی کرونگا اگر تو خود شادی کر دے گی تو اچھا ہے ورنہ میں بھاگ کر کر لوں گا۔'' وہ دھاڑا تھا۔

''دیکھ شاکرے مجھے جلال نہ دلا تو بھاگ سکتا ہے تو بھاگ جا، لیکن یاد رکھیو، ماں کی بددعا قبر تک تیرا پیچھا کرے گی میری آہ لے گا تو کس سکون نہیں پائے گا۔'' اس کے ساتھ ہی اماں نے بلند آواز میں بین کرنا شروع کر دیا تھا اور اس لڑکی کو کوسنا شروع کر دیا تھا، جس کی وجہ سے ان کا ہونہار اور فرمانبردار بیٹا بگڑ گیا تھا بدلحاظ ہو گیا تھا شاکر کا سارا کروفر سارا طنطنہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔

''پلیز اماں مجھے معاف کر دے میں نے تیرا دل کھایا ہے۔'' وہ اماں کے گود پر سر رکھ چکا تھا، اماں کے دل کو گونا گو اطمینان ہوا تھا ورنہ اس کی آنکھوں میں بھکتے جذبات نے ان کو ہولا دیا تھا کہ کہیں شاکر ہاتھ سے تو نہیں نکل گیا۔

☆☆☆

''کیا ہوا اماں مان گئی تمہاری؟'' کنول کی پرجوش آواز نے بھی اس کے اعصاب پر چھائی پژمردگی اور یاسیت کو زائل نہیں کیا تھا وہ ہنوز ٹوٹی

بکھری شاخ کی طرح بستر پر پڑا سگریٹ پھونکتا رہا تھا۔

''اماں نہیں مانتی اور نہ ہی وہ مانے گی۔'' شاکر کی آواز میں صدیوں کی سی تھکن تھی آبلہ پائی کے عذاب لینے کے لئے اس نے اپنے دل و دماغ کو آمادگی کے مراحل میں ڈالنا شروع کر دیا تھا، دوسری جانب اس کا جواب سن کر کنول بھونچکی رہ گئی تھی۔

''تو تمہارا دل بھر گیا ہے مجھ سے اسی لئے کترا رہے ہو، سارا ملبہ اپنی ماں پر نہ ڈالو حقیقت یہ ہے کہ تم نے محض تفریح کے لئے ٹائم پاس کرنے کے لئے مجھ سے رابطہ کیا تھا اب دل بھر گیا ہے تو ماں کو مورد الزام ٹھہرا کر فردوس سے شادی کر لو لیکن یاد رکھنا میں نے تم سے محبت کی ہے اور میری محبت اتنی ارزاں نہیں ہے کہ دور ٹھہر کر میں تماشا دیکھوں گی خود بھی برباد ہو جاؤں گی اور تمہیں بھی کر دوں گی تم شادی کرو میں اس دن تمہیں بھی گولی مار دوں گی اور خود بھی مر جاؤں گی۔'' وہ اپنی بات مکمل کرنے کے فوراً بعد فون بند کر چکی تھی وہ اس کو پکارتا رہ گیا تھا، اس کے بعد کتنی ہی دیر تک وہ اس کا نمبر ڈائل کرتا رہ گیا تھا ''لیکن آپ کے مطلوبہ نمبر سے فی الحال جواب موصول نہیں ہو رہا۔'' جیسے الفاظوں نے اس کا منہ چڑایا تھا۔

☆☆☆

''میں تیرا رشتہ ڈال آئی ہوں چھ ماہ تک شادی کرو گی بھلے مانس لوگ ہیں فوراً قبول کر لی ہیں، تجھے بھی تو بہت آگ لگی ہوئی تھی ناں کہ اماں میری شادی نہیں کرتی خوش ہو جا کہ کر رہی ہوں تیرا بیاہ۔'' اماں آندھی طوفان کی طرح اس کے کمرے میں آئی تھیں، وہ جو کنول کی تصویر موبائل میں کھولے غم منا رہا تھا ایکدم سے گڑبڑا گیا تھا اس نے سرعت سے موبائل بند کر دیا تھا اور اٹھ بیٹھا تھا، اماں اپنے ازلی جاہ و جلال میں کچھ دیکھ ہی نہیں پائی تھیں۔

''اماں مجھے معاف کر دیں مجھے کہیں بھی شادی نہیں کرنی۔'' اس نے سیل بیڈ پر پھینکا تھا اور اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

''شادی تو تیرے اچھے بھی کریں گے لیکن وہاں جہاں میں چاہوں گی۔'' اماں نے غصے سے کہا تھا اور بیڈ پر بیٹھ گئی تھیں۔

''تو کیا چاہتی ہے میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں بتا مجھے۔'' وہ بے چارگی و بے بسی کی انتہاؤں پر خود کو محسوس کر رہا تھا ایک طرف کنول منہ موڑ چکی تھی اور دوسری جانب اماں اپنی ہٹ دھرمی پہ قائم و دائم تھیں۔

''مجھے شادی نہیں کرنی، فردوس سے میں شادی کروں گا تو صرف کنول سے اگر تو مجھے زندہ دیکھنا چاہتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ جس دن تو میری شادی کی تاریخ رکھے گی اسی دن میرا جنازہ اٹھے گا۔'' وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے چلا گیا تھا، جبکہ اماں اپنا دل تھام کر رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

''میرا رشتہ طے ہو گیا ہے۔'' وہ روٹھی ہوئی نہیں تھی نہ ہی اس کا انداز بیگانہ تھا، بلکہ اس نے کمال مہارت سے خود کو کمپوز کر رکھا تھا، اس کے چہرے پر شادابی اور چمک سے اس کو انوکھا سا روپ عطا کیا تھا، شاکر کا کھڑا رہنا محال ہو گیا تھا اتنے سارے محاذوں پہ تن تنہا لڑنا اس کے لئے محال سا ہو گیا تھا، اس نے کتنی چاہت سے کنول کا پتہ اور نمبر اماں کو دیا تھا، لیکن اب تو کچھ بھی نہیں بچا تھا، خواب ہستی کو اپنوں نے ہی تہس نہس کر دیا تھا اس کے خوابوں کے محل کو مسمار کر کے وہاں کھنڈر تعمیر کیے جا رہے تھے، وہ جو اس سے جنم جنم ساتھ رہنے کے دعوے کرتی تھی ایک ماہ بھی اس

کا انتظار نہیں کر پائی تھی، کس کے نام کے عکس کو اپنے دل پہ سجائے شاداں و فرحاں گھوم رہی تھی
اور وہ محبت کی میت کو اپنے کندھوں پر اٹھائے آبلہ پائی کے طویل اور صبر آزما مرحلوں سے گزر رہا تھا دل میں اتنی زیادہ توڑ پھوڑ ہو رہی تھی کہ وہاں کھڑے رہنا محال ہو گیا تھا، اس نے رجسٹر کھول لیا تھا اس رجسٹر میں پتہ نہیں کیا کچھ کھو گیا تھا اب کس کس شے کو تلاش کرنا بھی تھا ماضی کو جو کہ اس پر ہنس رہا تھا حال جو کہ اپنے قدموں پہ کھڑا ڈگمگانے لگا تھا یا پھر مستقبل جو کہ اندھیری رات میں کسی متاع حیات کی طرح گم ہو گیا تھا۔

''تو پھر میں جاؤں تم تو بزی لگ رہے ہو۔'' وہ دوبارہ اس کے سامنے آ کر بولی تھی، شاکر کے دل میں اتھل پتھل تیز تر ہو گئی تھی، اس نے ایک نظر بھی اس پر نہیں ڈالی تھی اب اگر دیکھ لیتا تو پھر نگاہوں کا پلٹنا مشکل ہو جاتا، وہ خود کو کمپوز کرتے ہوئے بامشکل بولا تھا۔

''بزی ہوں اس لئے تو بات کرنے کی فرصت نہیں ہے، شادی کا کارڈ بھجوا دینا اگر ٹائم ملا تو آ جاؤں گا۔''

''تم نہیں آؤ گے تو میری شادی کیسے ہو گی پاگل۔'' وہ کھلکھلا کر ہنسی تھی، شاکر نے انتہائی حیرت سے اور دکھ سے اس کو دیکھا تھا اور غصے میں رجسٹر بند کر دیا تھا۔

''تم کسی اور سے شادی کر رہی ہو خوش ہو پھر یہاں کیوں آئی ہو مجھ سے ملنے کا کیا مقصد ہے اگر میرا مذاق اڑانا ہے اور مجھے چڑانا ہے تو خوش ہو جاؤ میں تڑپ رہا ہوں انگاروں پہ لوٹ رہا ہوں دماغ اس وقت کسی بھاری انجن کے نیچے دب کر ریزہ ریزہ ہوا جا رہا ہے، سوچیں بپھرے طوفان کی موجوں کی طرح تہس نہس کرنے کے در پہ ہو گئی ہیں۔'' وہ شکستہ پائی کے عذابوں سے دو چار تھا اس کے لہجے کا ٹوٹا بکھرا پن کنول کو ساکت کر گیا تھا۔

سامنے پڑے بیڈ سے ایک کاغذ گھسیٹا تھا اس پر کچھ لکھا تھا کاغذ کو لپیٹ کر اس کے حوالے کیا تھا اور بولی تھی۔

''بھائی لینے آ گیا ہے یہ پڑھ کر مجھے فون کر دینا شام کو انتظار کروں گی بائے۔'' وہ جا رہی تھی جبکہ وہ اس کو ٹکٹکی باندھے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا، حتی کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی وہ کسی ہارے ہوئے شکست خوردہ جواری کی طرح کرسی پر ڈھ گیا تھا، اس نے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو ہولے سے جنبش دی تھی لفافے کو ہولے سے کھولا تھا لیکن اس کو مکمل کھولتے ہوئے اس کی انگلیاں لرزی تھیں دل یک بارگی دھڑکا تھا، بہر حال یہ بوجھ اس کو اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھانا تھا اس نے کاغذ کھول دیا تھا محض چھ سات سطروں کا تنبیہ نامہ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

''میرے پیارے بے پرواہ بجن، تمہارا رشتہ مجھ سے طے ہوا ہے تمہاری اماں ہمارا رشتہ بہ راضی و رضا کر کے گئی ہیں یقین نہیں آتا تو اپنی اماں سے پوچھ لو، مجھے خبر تھی تم انجان ہو لیکن مجھے دیکھ کر اتنا ٹوٹ پھوٹ جاؤ گے میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔'' اس نے ایک بار دوبار سہ بار اس خط کو پڑھا تھا ساری یاسیت کلفت پل بھر میں اڑن چھو ہو گئی تھی۔

یعنی وہ چغد بیوقوف بنایا گیا تھا اور بے وقوف بنانے والی کوئی اور نہیں بلکہ اماں تھیں وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا اس کے قدم تیزی سے باہر کی جانب اٹھ رہے تھے اس نے اماں کو منانا تھا اتنے دنوں سے ان کا دل جو دکھا رہا تھا اور کنول کی بچی سے بدلہ بھی لینا تھا جس نے کمال مہارت سے اماں کا ساتھ دیا تھا اور اس کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہونے دی تھی۔

☆☆☆

کفارہ
فرزانہ حبیب

وہ چاروں آج بھی اس ہوٹل میں اکٹھے ہوئے تھے یہی ان کا مخصوص ٹھکانہ تھا جہاں وہ مختلف منصوبے مل کر تیار کرتے تھے آج بھی ان کی باتوں سے ان کے کسی خطرناک ارادے کا پتہ چل رہا تھا، دوپہر کا وقت ہونے کی وجہ سے اس وقت گاہکوں کا رش نہ ہونے کے برابر تھا لہٰذا ہوٹل کا مالک کبیر بھی غیر ارادی طور پر ان کی باتیں سننے لگا یہ چاروں لڑکے ہمیشہ اسے اپنے حلیے اور انداز گفتگو سے مشکوک اور بگڑے ہوئے لگتے تھے، مگر آج چند باتیں جو اس کے کانوں میں پڑی اس سے وہ مکمل طور پر ان کی باتوں کی طرف متوجہ ہوا باتوں کا مفہوم واضح ہونے پر اس کے چہرے پر بے چینی اور ہاتھوں میں کپکپاہٹ بڑھتی جا رہی تھی اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ ان چاروں لڑکوں کو ہر حال میں ان کے غلط ارادے سے باز رکھے گا شاید اسی طرح ان کو راہ راست پر لانے کی کوشش سے اللہ اس سے راضی ہو جائے اور ماضی میں کیے گئے گناہ کا کفارہ ادا ہو سکے، وہ اب ارادہ باندھ رہا تھا کہ کس طرح ان لڑکوں سے بات کی جائے کہ ان کو برا بھی نہیں لگے اور انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو جائے، وہ اپنے کاؤنٹر سے اٹھ کر ان چاروں کے پاس آ گیا اور انہیں سلام کیا جس پر وہ چاروں لڑکے چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئے ان میں سے ایک لڑکا جس کا نام خاور تھا وہ اس کے علاقے کے ایک معزز شخص کا بیٹا تھا اس کا باپ شریف النفس انسان تھا مگر خاور کے اس کارنامے کی وجہ سے اس کا پورا خاندان ذلت و رسوائی کے عمیق کھائی میں گر جاتا اس سوچ نے سلیم کو مزید مضطرب کر دیا۔

''وعلیکم السلام!'' خاور نے اپنی حیرانی پر قابو پاتے جواب دیا۔

''وہ بیٹا، تم لوگ کافی دنوں سے میرے ہوٹل میں آ رہے ہو، آج فراغت تھی تو سوچا تم لوگوں سے گپ شپ لگائی جائے۔'' عظیم جو کہ خاور کے بچپن کا دوست تھا اسے کبیر کی مداخلت بری لگی مگر خاور نے اسے اشارے سے منع کر دیا۔

''جی جی ضرور کبیر بھائی آئیں بیٹھیں۔'' خلاف توقع خاور نے نرمی سے بیٹھنے کی پیش کش کی جس پر اس کے باقی دوست خاموش ہو گئے۔

''میں تم لوگوں کا زیادہ وقت نہیں لوں گا تم لوگ میرے چھوٹے بھائیوں کی طرح ہو، آج میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں اپنا ماضی تم لوگوں سے شیئر کروں۔'' یہ کہہ کر کبیر خاموشی سے انہیں دیکھنے لگا جیسے آگے بولنے کی اجازت چاہ رہا ہو۔

''جی جی کبیر بھائی آپ کہیں، ہم سن رہے ہیں۔'' خاور کے کہنے پر اس کے دوستوں نے پہلو بدلہ بڑے ہونے کی وجہ سے ان کے احترام میں خاموش رہے، کبیر خلاء میں گھورنے لگا جیسے سوچ رہا ہو کہ اپنی کہانی کہاں سے شروع کی جائے بالآخر اس نے خاموشی کا قفل توڑا۔

''آج سے تقریباً بارہ سال پہلے میں بھی تمہاری طرح لا ابالی، کھلنڈرا، لاپرواہ اور اپنی ذات میں مگن رہنے والا بے فکرا نوجوان تھا، خوشیاں جس کے چاروں اطراف رقص کرتی تھیں اور دولت میری باندی تھی، دکھ، سکھ، غربت کا مجھ سے دور، دور تک واسطہ نہیں تھا، میرے بہت سے دوست تھے جنہیں میں اپنا خیر خواہ سمجھتا تھا مگر وقت گزرنے پر پتہ چلا کہ میری شخصیت کی تباہی و بربادی میں ان ہی دوستوں کی بری صحبت کا اثر تھا میں دو بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا ماں باپ کا اکلوتا منظور نظر اور بہنوں کی آنکھ کا تارا، مجھ سے بڑی بہن آمنہ باجی کی شادی ہو چکی تھی اور چھوٹی رابعہ کا رشتہ بھی اچھے گھرانے میں طے تھا میں ان

دنوں فرسٹ ائیر کا طالبعلم تھا، میری ہر فرمائش بن کہے پوری ہو جاتی، دولت کی فراوانی اور خوبصورتی و مردانہ وجاہت کے زعم نے مجھے غرور وتکبر میں مبتلا کر دیا تھا کہ میں اپنے دوستوں کی جھوٹی خوشامد کو بھی نہیں سمجھ سکتا تھا، تھریلنگ کے نام پر چھوٹی موٹی Street snatcling، اسموکنگ، جوا جیسی بری لت نے مجھے بالکل بگاڑ کر رکھ دیا تھا، میری چھوٹی بہن رابعہ کو میری بری خصلتوں کا پتہ چلا تو اس نے مجھے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر اس وقت جوانی کے نشے میں اس کے خلوص کو دھتکار دیتا اور اسے دھمکی دیتا کہ بابا تک میری شکایت نہ پہنچے، وہ بیچاری میری محبت اور کچھ خوف کی وجہ سے خاموش رہتی، یہی نہیں اب میں نے محلے کی آتی جاتی لڑکیوں کو بھی تنگ کرنا شروع کر دیا تھا، کچھ تو میری چکنی چپڑی باتوں میں بھی آجاتی، ان کے ساتھ Dating کرنا میرا محبوب مشغلہ بن گیا لڑکیاں جب میری خوبصورتی و وجاہت کی تعریف کرتیں تو میری گردن غرور سے اور تن جاتی جیسے تیسے کر کے میں نے انٹر کلیئر کیا اور اب تھرڈ ائیر میں عدم توجہی کی وجہ سے فیل ہو گیا تھا، اس وقت بابا کو بہت دھچکا لگا مگر میں نے جھوٹی سچی کہانی سنا کر ان کو اپنی باتوں سے منا لیا اور وعدہ کیا کہ آئندہ وہ دل لگا کر پڑھائی کرے گا اور وہ بیچارے سادہ لوح انسان میری باتوں پر اعتبار کر بیٹھے، انہی دنوں ہمارے محلے میں ایک نئی فیملی رہائش پذیر ہوئی ان کی ایک ہی بیٹی تھی جس کا نام عنایہ تھا وہ رابعہ کی ہم عمر اور اب اس کی کلاس فیلو بھی تھی، جب وہ پہلی بار رابعہ کے ساتھ کالج جانے کے لئے گھر پر آئی میں نے ایک سرسری نظر اس پر ڈالی تو پلٹنا بھول گیا نازک سراپا، بے داغ کتابی چہرہ، گلابی لب اور کالی بڑی بڑی آنکھیں غرض وہ مکمل سراپا حسن تھی سفید لباس میں سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے وہ حیا کا پیکر لگ رہی تھی، مگر میری آنکھوں میں شاطرانہ چمک تھی اس نے بھی شاید میری نظروں کا ارتکاز محسوس کر لیا تھا بلا ارادہ اس نے میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں تیرتی الجھن اور پھر خفگی کے تاثرات پر میں خواہ مخواہ مسکرانے لگا، اس کے بعد ہر روز اس کو دیکھنا، بہانے بہانے سے اس کے گھر کے گرد چکر لگانا میرا مشغلہ بن گیا اب اس نے میری وجہ سے گھر آنا چھوڑ دیا تھا، جبکہ میری بہن اب اس کے گھر سے اسے لے کر کالج جاتی تھی جس سے مجھے تھوڑی مایوسی ہوئی بہن کی موجودگی کی وجہ سے مجھے اس سے بات کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا، میں جھنجھلانے لگا اب اس سے بات کرنا میری ضد بن گئی تھی آج تک مجھے کسی لڑکی نے اس بری طرح رد نہیں کیا تھا جبکہ یہ لڑکی اتنی بے نیاز تھی جسے اس کی وجاہت اور متاثر کن شخصیت کی کوئی پرواہ نہیں تھی آخر کار ایک دن تقدیر نے اسے بات کرنے کا موقع فراہم کر ہی دیا، رابعہ کی طبیعت آج ناساز تھی، جس کی وجہ سے وہ کالج نہیں جا سکی، کبیر پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی وہ سیدھا اس لڑکی کے گھر پہنچا جیسے ہی اس نے کالج کی طرف روانہ ہونے کے لئے گلی کا موڑ کاٹا میں اس کے راستے میں حائل ہو گیا۔''

''اوہ زہ نصیب آج آپ اکیلے کیسے نظر آ رہی ہیں؟ کہیے تو کالج تک بحفاظت چھوڑ آؤں؟'' میں نے لوفرانہ انداز میں کالر کھڑے کرتے ہوئے کہا، مجھے یوں اچانک سامنے دیکھ کر عنایہ تھوڑا گھبرا گئی تھی مگر جلد ہی اپنی گھبراہٹ پر قابو پا کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''تمہیں شرم آنی چاہیے، میں تمہاری بہن کی دوست اور محلے دار ہوں تم میں ذرا بھی غیرت

ہے تو آئندہ میرے راستے میں مت آنا اور رہی کالج چھوڑنے کی بات تو اگر اتنا ہی شوق ہے تو پہلے اپنی بہن کی ذمہ داری تو اٹھاؤ پھر دوسرے کی بیٹی اور بہن کی ذمہ داری اٹھانا جس پر تم جیسے محلے کے آوارہ، اوباش لڑکے غلط نظر رکھتے ہیں کبیر بھائی۔" چبا چبا کر کہتے ہوئے وہ میرے سائیڈ سے گزر کر چلی گئی میں اس کے تحقیرانہ انداز پر کھول کر رہ گیا اسی وقت سامنے سے میرا جگری یار گڈو آتا نظر آیا۔

"اوہ، جگر خیر تو ہے؟ کیا بات ہے؟ بڑے غصے میں لگ رہا ہے؟"

بس گڈو کے پوچھنے کی دیر تھی میں نے اسے ساری رام کہانی سنا ڈالی۔

"اوہ جگر بس اتنی سی بات پر پریشان، ارے یہ رنگین تتلیاں شروع شروع ایسے ہی رنگ دکھاتی ہیں دو چار بار بات کر کچھ گفٹ شفٹ دے پھر نہیں بات بنے گی، ایسے ہی مفت میں کون گھاس ڈالے گی۔" اس کی بات پر میں نے چونک کر دیکھا۔

"ہاں میں نے تو یہ سوچا ہی نہیں تھا ویسے بھی وہ غریب کلرک کی بیٹی ہے دولت کی چکا چوند سے خود لائن پر آجائے گی۔" مگر یہ اس کی خام خیالی تھی اس نے نہ صرف میرا دیا ہوا گفٹ میرے منہ پر مار دیا بلکہ میری بہن رابعہ سے بھی میری شکایت لگا دی، رابعہ جو پہلے ہی میری عادتوں سے عاجز آچکی تھی اس نے ایک بار پھر مجھے سمجھانے کی کوشش کی، اس دن بابا کی طبیعت کچھ بہتر نہیں تھی وہ جلد ہی دوا کھا کر سو چکے تھے مگر رابعہ ابھی تک میرے انتظار میں جاگ رہی تھی، اسے اب اپنے بھائی کی بری عادتوں اور صحبت سے خوف آنے لگا تھا کہ کہیں اللہ کا قہر جلال میں نہ آجائے اور اس کے بھائی کو اپنے گناہوں کا خمیازہ بھگتنا پڑے، عنایہ کی آہیں نہیں اس کے گلے کا طوق نہ بن جائے، یہ سب سوچ کر رابعہ کی آنکھیں نم ہو گئیں وہ اپنے بھائی کے راہ راست پر آنے کی دعا کرنے لگیں رات کے بارہ بجے سیٹی کی شوخ دھن بجاتے میں گھر کے اندر داخل ہوا تو رابعہ کو اپنے انتظار میں جاگتا پایا، اس نے خاموشی سے کھانا گرم کر کے میرے سامنے رکھا کھانے کے بعد میں اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تو رابعہ نے مجھے روک لیا۔

"بھائی مجھے تم سے ایک کچھ بات کرنی ہے۔"

"ہاں کہو۔" میں نے گویا اس پر احسان عظیم کیا تھا کیونکہ یہ وقت میرا فیس بک اور موبائل پر مختلف لڑکیوں کے ساتھ چیٹنگ میں گزرتا تھا۔

"وہ میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ بھائی پلیز تم اپنے برے دوستوں کی صحبت چھوڑ دو، یہ دوست نہیں آستین کا سانپ ہیں جنہیں تم سے نہیں تمہاری دولت سے پیار ہے بھائی اب تو لوگ بھی دبی دبی زبان میں تمہاری باتیں کرنے لگے ہیں بابا کے کانوں میں ہی کچھ ایسی باتیں پڑی ہیں جس کی وجہ سے وہ خاموش رہنے لگے ہیں انہیں تم سے بہت توقعات وابستہ ہیں امی کی وفات کے بعد انہوں نے ہمیں جس طرح پالا پوسا، کیا اس کا صلہ تم بدنامی کی صورت میں دو گے؟" رابعہ نے اپنی بات کے اختتام پر ایک آس سے اس کی طرف دیکھا، میں جو اس کی باتیں سن کر ایکدم اشتعال میں آگیا۔

"کون ہے جو تم لوگوں تک میرے خلاف الٹی سیدھی باتیں پہنچا رہا ہے، ایسا کچھ نہیں ہے سب میری دولت و وجاہت سے جلتے ہیں تم لوگوں کو میرے خلاف ورغلا رہے ہیں، دوستوں کے ساتھ چھوٹے موٹے مشاغل، ہنسنا بولنا، اتنی

بڑی بات نہیں جس کو یہ محلے والے اتنا بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔''

''اچھا، اور وہ عنایہ، تم اس کا جو پیچھا کرنے لگے ہو، اس کا راستہ روکنا، اس سے گھٹیا قسم کے فلمی ڈائیلاگ مارنا اسے قیمتی تحائف دینا یہ سب کیا ہے؟ شریف لڑکوں کا یہ وتیرہ ہوتا ہے، آج اس نے جب تمہارے کارنامے بتائے تو میری آنکھیں شرم سے جھک گئیں، بھائی وہ اپنے والدین کا واحد سہارا ہے تعلیم حاصل کر کے اپنے ماں باپ کے لئے کچھ کرنا چاہتی ہے، وہ عام لڑکیوں کی طرح سطحی سوچ کی مالک نہیں جو دولت سے بہل جائے، پلیز اس کے لئے مشکلات پیدا نہ کرو، آئندہ اس کے ساتھ کچھ غلط کرنے سے پہلے ایک بار یہ ضرور سوچ لینا کہ تمہاری بھی دو بہنیں ہیں کہیں اس کی بددعا سے ہم برباد نہ ہو جائیں۔'' یہ کہہ کر رابعہ وہاں رکی نہیں مگر میں تو اتنا بھٹک چکا تھا کہ صحیح اور غلط کا فرق بھول گیا تھا، یہاں تک اس کی آخری بات کا بھی مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا میرے سینے میں تو بس ایک بات کو سن کر انگارے لوٹ رہے تھے کہ اس نے میری شکایت میری بہن سے کی اس کی یہ مجال، لگتا ہے اب گھی ٹیڑھی انگلی سے نکالنا پڑے گا سمجھتی کیا ہے خود کو، مس عنایہ، بس اب تمہاری ذلت کے دن شروع ہو چکے ہیں تم نے مجھے یعنی کبیر کو للکارا ہے اس کا بدلہ تو تمہیں سود سمیت واپس کرنے پڑے گا کہ تمہاری سات پشتیں بھی یاد رکھیں گی، یہ کہہ کر میں غصہ و نفرت کے ملے جلے جذبات میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا، پھر اگلے دن میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر اس معصوم بے ضرر لڑکی کو رسوا کرنے کا منصوبہ بنایا اس وقت یہ بھول گیا تھا کہ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے مظلوم کی آہ عرش تک پہنچتی ہے، جوانی و شباب کے نشے میں چور میں خدا کو بھول گیا تھا مگر وہ جو اوپر منصف بیٹھا ہے وہ اپنے مظلوم بندوں سے بے خبر نہیں۔

☆☆☆

''رابعہ کو بخار تھا وہ کالج نہیں جا سکی لیکن اگلے ہفتے سے پیپر شروع ہونے والے تھے جس کی وجہ سے اس نے اکیلے کالج جانے کا فیصلہ کیا پچھلے ایک ہفتے سے کبیر کی طرف سے بالکل خاموشی تھی اسے لگا کہ شاید رابعہ کے سمجھانے کا اس پر مثبت اثر ہوا ہے جب ہی اس نے اس کا پیچھا چھوڑ دیا ہے، لہٰذا رابعہ کے ڈھارس بندھانے پر وہ اکیلے ہی کالج جانے کے لئے تیار ہو گئی مگر بدقسمتی سے واپسی پر شہر میں اچانک حالات کی خرابی کی وجہ سے کوئی ٹرانسپورٹ نہیں مل رہی تھی عنایہ کو پریشانی نے آگھیرا اسی وقت اس کے سامنے ایک آٹو رکشا آ کر رکا۔''

''باجی کہاں جانا ہے؟'' رکشے والے نے بڑی شرافت سے پوچھا عنایہ کو یہ سواری غنیمت لگی عام حالات میں اکیلے رکشے میں بیٹھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی مگر اس وقت بحالت مجبوری اس نے ہمت کر لی۔

''باجی کیا سوچ رہی ہیں آج تمام ٹرانسپورٹ بند ہے میری مانیں تو بیٹھ جائیں، کرایہ میں مناسب لوں گا۔'' عنایہ جو کشمکش کا شکار تھی بالآخر اس میں سوار ہو گئی مگر کچھ دیر بعد اسے احساس ہوا کہ رکشہ گھر کے بجائے کسی انجانے سنسان راستے کی طرف جا رہا ہے عنایہ کی چھٹی حس کچھ غلط ہونے کا الارم دے رہی تھی اس کا دل پتے کی طرح کانپنے لگا مگر اس نے ہمت مجتمع کر کے رکشے والے کو مخاطب کیا۔

''یہ تم کہاں جا رہے ہو، یہ میرے گھر کا راستہ نہیں ہے۔''

''ارے باجی پریشان نہ ہوں، شہر کے حالات بہتر نہیں اس لئے دوسرے متبادل راستے سے گاڑی نکالنی پڑی، آپ گھبراؤ نہیں، میں آپ کو باعزت و بحفاظت گھر چھوڑ کر آؤں گا۔''
عنایہ کے پاس اس کی بات پر یقین کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا، وہ قرآنی آیت کا ورد کرنے لگی کچھ دور جا کر رکشہ ایک دم رک گیا جس کے ساتھ عنایہ کی سانسیں بھی رکنے لگیں۔
''اب...... اب کیا ہوا ہے؟'' اس نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔
''کچھ نہیں باجی شاید سی این جی ختم ہو گئی ہے آپ پلیز گھبراؤ نہیں میں کچھ انتظام کرتا ہوں جب تک تم یہ پانی پیو۔''
''کیا؟ یہ کیا کہہ رہے ہو اب کیا ہو گا گھر کیسے جاؤں گی؟'' ابھی سوچوں میں گھیری وہ پانی کی منرل بوتل غٹا غٹ پی گئی اور پھر ہوش و خرد سے بیگانہ ہوتی چلی گئی، جب اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو ایک ویران کھنڈر نما کمرے میں اکیلے پایا ابھی تک اس کا دماغ ماؤف تھا کمرے میں کوئی روزن نہیں تھا جس سے وقت کا اندازہ ہو سکے اس نے گھبراہٹ میں اپنا بیگ تلاش کرنا چاہا مگر بیگ ندارد، اسے اپنی بے بسی پر رونا آیا اسے یقین ہو گیا کہ بدقسمتی اس کے ساتھ لپٹ چکی ہے اسے اغواء کر لیا گیا ہے، مگر کیوں اور کس مقصد کے لئے وہ تو کوئی رئیس زادی بھی نہیں کہ اس کے بدلے بھاری تاوان کا مطالبہ کیا جا سکے ابھی وہ اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں کا جواب ہی ڈھونڈ رہی تھی کہ ایکدم سے کمرے کے لاک کھولنے کی آواز پہ چونک کر دیکھا آنے والے نے سوئچ بورڈ پر ہاتھ مارا پورا کمرہ روشنی میں نہا گیا اور اس روشنی میں جو چہرہ عنایہ کو نظر آیا اس سے اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا، اس کی آواز اور سانسیں بند ہونے لگیں۔
''تم؟'' بڑی مشکل اور بے یقینی سے صرف اتنا ہی پوچھ سکی۔
''ہاں عنایہ ڈیئر! تم کیا سمجھتی تھی کہ میری بہن کو میرے خلاف بھڑکا کر تم نے کوئی تیر مار لیا ہے، تم نے مجھے اتنا ہی بزدل سمجھ لیا تھا تمہیں کیا لگا کہ میں تمہارے حسن سے متاثر ہو گیا ہوں جو تمہارے آگے پیچھے جا رہا ہوں، نہیں عنایہ ڈیئر، تم جیسی ہزاروں تتلیاں خود اڑ کر میری زندگی میں رنگ بھرنے آتی ہیں، وہاں تم جیسی دبو اور سیدھی سادہ لڑکی میں میری دلچسپی اتنی تھی کہ تم کچھ دن میرے ساتھ وقت گزارتی میں تمہارا منہ نوٹوں سے بھر دیتا کہ تمہارے باپ کو تمہاری شادی اور تعلیم کے اخراجات کے لئے فکر مند نہ ہونے پڑتا، بس اتنی سی بات تھی مگر تم نے اوور اسمارٹ بن کر خود ذلت و رسوائی کو آواز دی ہے اور دیکھو تقدیر نے بھی میرا ساتھ دیا آج ٹرانسپورٹ بند ہونے کی وجہ سے تم تک رسائی اور آسان ہو گئی، مائی ڈیئر اب تمہاری بدنامی کا سورج طلوع ہو چکا ہے، تمہارا باپ رسوائی کے خوف سے یہ دنیا چھوڑ گیا ہے اور ماں بھی رو پیٹ کر تم پر صبر کر چکی ہیں پورے محلے میں تمہاری رسوائی کا چرچا ہو چکا ہے، رابعہ کو مجھ پر شک تھا مگر میں تو دو دن سے گھر سے باہر نکلا ہی نہیں لہٰذا اس کا شک دور ہو گیا، سب تم پر تھوں تھوں کر رہے ہیں اب شرافت اسی میں ہے میڈم، جیسا میں کہوں ویسا ہی کرو تمہیں میرے قدموں میں جھک کر معافی مانگنی ہو گی تب اس قید خانے سے رہائی ملے گی تجھے تم۔'' اس نے عنایہ کے چہرے کو تھوڑا اوپر کرتے ہوئے کہا جسے عنایہ نے نفرت سے جھٹک دیا۔
''اوہ رسی جل گئی پر بل نہ گیا، دیکھتے ہیں کب تک اس غرور اور اکڑ میں رہوں گی باپ تو

زندہ ہی نہیں رہا لوگ ان کے قل بھی پڑھ چکے
ہیں ماں بیچاری کی زندگی چاہتی ہو تو جیسا کہوں
ویسا کرنا ہوگا، میں تم سے وعدہ کرتا ہوں محلے
والوں کو یقین دلا دوں گا کہ تمہارا کالج سے واپسی
پر کار ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا کوئی تمہیں ہاسپٹل لے
گیا جہاں تم بے ہوش پڑی تھی اتفاق سے مجھے
وہاں ایک دوست کی عیادت کے لئے جانا پڑا تو
تم سے ملاقات ہوگئی اور اس طرح تمہاری بدنامی
کا داغ بھی مٹ جائے گا اور میری بھی واہ واہ ہو
جائے گی جو لوگ مجھ سے بدگمان ہیں وہ میری
نیک نیتی کی تعریف کرنے لگیں گے۔" میں نے
ایک آنکھ دباتے لوفرانہ انداز میں اپنا منصوبہ
بتایا۔

عنایہ میری مکاری پر منہ پھیر کر رہ گئی۔

"اور ہاں اس کے لئے ایک شرط بھی
ہے۔"

"کیسی شرط؟" عنایہ نے بے ساختہ
پوچھا۔

"تمہارا رابعہ کا میری طرف سے دل
صاف کرنا ہوگا اور......"

"اور کیا؟" عنایہ نے بے چینی سے پوچھا۔

"اور تمہیں میرے ساتھ نکاح کرنا ہوگا کچھ
دن بعد اپنا وقت رنگین بنا کر میں تمہیں طلاق
دے دوں گا پھر تم اپنی زندگی گزارنے میں آزاد
ہوگی۔"

"کیا؟" آخری بات پر عنایہ کو ایسا لگا کہ
اس کے چہرے پر کسی نے تیزاب پھینک دیا ہو وہ
سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کبیر اتنا گرا ہوا انسان بھی
ہوسکتا ہے۔

"میں مرجانا پسند کروں گی گھٹیا انسان، مگر
تمہارے نام کے ساتھ اپنا نام جوڑنا، کبھی نہیں،
ویسے بھی جو لڑکی دو راتوں سے گھر سے باہر رہی
ہو اس کی عزت کا جنازہ تو پہلے ہی نکل چکا، میرا
باپ بغیر میری بے گناہی جانے دل پر میری
بدنامی کا بوجھ لئے اس دنیا سے منہ موڑ چکا ہے
اب میں واپس جا کر کرونگی بھی کیا اور تمہیں کیا لگتا
ہے کہ ایک طلاق یافتہ لڑکی کو تم جیسے بے حس و
سفاک لوگوں کا یہ معاشرہ قبول کرے گا اسے
دوبارہ سر اٹھا کر عزت سے جینے دے گا، تمہاری
بھول ہے کہ میں تمہارے سامنے جھکوں گی۔"

عنایہ غصے و نفرت سے منہ پھیر گئی۔

"ہونہہ دیکھتا ہوں کب تک تمہاری اکڑ
برقرار رہتی ہے آج کے دن کا ٹائم دے رہا ہوں
اگر خود سے راضی ہو جاؤ تو بہتر ہے ورنہ مجھے تم
سے زبردستی کرنی ہوگی اتنا تو تمہیں بھی اندازہ ہو
گیا ہوگا جو تمہیں یہاں تک لا سکتا ہے وہ آگے کیا
کچھ کرسکتا ہے؟ یہ نکاح بھی میں صرف اس لئے
کر رہا ہوں کہ تم رابعہ کی دوست ہو ورنہ اس طرح
کے تکلفات کے بغیر بھی میں اپنے اختیارات کا
استعمال کرسکتا ہوں۔" یہ کہہ کر کبیر وہاں سے لمبے
لمبے ڈگ بھرتا نکلتا چلا گیا۔

"یا اللہ میری مدد کر مجھے اس ذلت سے بچا
لے یا رب تو جانتا ہے میں بے گناہ ہوں، میرا
باپ یہ غم نہیں سہہ سکا میری ماں زندہ درگور ہوگئی یا
اللہ ذلت کی زندگی سے مجھے عزت کی موت گوارہ
ہے یا اللہ خودکشی جیسے حرام موت کی میں مرتکب
نہیں ہوسکتی بس تو میرا پردہ رکھ لے اے مولا، تو
انصاف والا ہے اس گمراہ انسان سے میری ذلت
و رسوائی کا بدلہ تو ضرور لینا میں نے اپنا معاملہ
تیرے سپرد کیا۔" یہ کہہ کر وہ ہچکیوں سے رونے لگی
اس کی سسکیوں سے آسمان بھی رو پڑا، ساری
رات چھما چھم آسمان سے مینہ برستا رہا اور اندر
ایک حوا کی بیٹی ایک ظالم درندے کے قفس میں
سسکتی رہی۔

دوسرے دن کبیر اپنے دوست گڈو کے ساتھ عنایہ کے کمرے میں آیا تو اسے بے سدھ پڑا ہوا پایا، کبیر کو کسی انہونی کا احساس ہوا اس نے آگے بڑھ کر اسے سیدھے کیا تو اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا اس کی نبض تھم چکی تھی اللہ رب العزت نے اس کا پردہ رکھ لیا رات کے کسی پہر حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے وہ یہ دنیا چھوڑ گئی تھی اس کی کھلی آنکھیں کبیر سے سوال کر رہی تھیں، کہ کیا قصور تھا میرا اور میرے قریب والدین کا؟ اللہ کے قہر سے ڈرو، اس نے تو میری عزت کا پردہ رکھ لیا مگر اب تمہیں ذلیل و رسوا ہونے سے کوئی نہیں بچا سکے گا، تم سکون کے لئے ترسو گے میری آہ و بکاہ تمہارا ہمیشہ پیچھا کرے گی۔

کبیر نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں اس کا مقصد صرف اس کو ہراساں کرنا تھا مگر بات اتنی آگے بڑھ جائے گی اس نے سوچا بھی نہیں پہلی بار اسے کبیرہ گناہ پر اللہ سے خوف محسوس ہوا، گڈو یہ ساری صورتحال دیکھ کر اس کا مزید ساتھ دینے سے انکار کرتے ہوئے وہاں سے فرار ہو چکا تھا، کبیر جو بری طرح گناہوں کی دلدل میں دھنس چکا تھا اس وقت اسے چاروں طرف عنایہ کے ساتھ ساتھ اس کی ماں کی آہیں بھی سنائی دے رہی تھیں اس نے وہاں سے بھاگنا چاہا مگر عنایہ کی مردہ وجود نے جیسے اس کے قدم جکڑ لئے تھے۔

پورا محلہ عنایہ کے گھر جمع تھا، کچھ لوگ ہمدردی کی نگاہ سے اس کی ماں کی طرف دیکھ رہے تھے کچھ لوگوں کی نظروں میں اس خاندان کے لئے شک تھا، پتھر سے پتھر دل بھی عنایہ کی معصوم موت پر رو پڑا تھا، رابعہ مسلسل اس کی میت کے قریب بیٹھی تھی، جواں بیٹی کی بے گناہ موت پر ماں نیم پاگل ہو چکی تھی، کبیر نے ضمیر نے بری طرح اس کو جھنجھوڑا تھا، اب وہ پچھتاوے کی آگ میں جل رہا تھا وہ کسی طرح ہمت کر کے عنایہ کے مردہ وجود کو ایمبولینس میں لے کر آیا جس سے پورے محلے میں کہرام مچ گیا تھا پھر اس ہی نے بتایا کہ صبح حیدر آباد جاتے ہوئے عنایہ کا مردہ وجود سنسان سڑک پر پڑے ہوئے ملا تھا شاید کسی نے اس کو اغواء کرنے کی کوشش کی تھی یا کسی گاڑی سے ٹکر ہوئی تھی، تنہائی، خوف و ہراس کی وجہ سے اس کا نازک دل ساتھ چھوڑ چکا تھا، دو دن پہلے حرکت قلب بند ہونے کی تصدیق ہوسپٹل میں ہو گئی تھی لہٰذا وہ ایمبولینس کی مدد سے گھر لے کر آ گیا اس طرح وہ لوگ جس کی زبان عنایہ کی ذلت و رسوائی کے لئے زہر اگل رہی تھی اب وہی اس کی معصومیت اور نیک کردار کی گواہی دے رہی تھی اس نے اللہ سے مدد مانگی تھی اور اللہ نے اس کے عزت کے لیٹرے کے ذریعے ہی دوبارہ اس کی عزت و تکریم واپس لوٹا دی تھی، رابعہ کی دیکھ بھال اور توجہ سے اس کی ماں اب بہتر تھی اسے اپنی بیٹی کی بے وقت موت پر صبر آ چکا تھا مگر وہ اٹھتے بیٹھتے ان ظالم انسان کو جھولی بھر بھر کر بد دعائیں دے رہی تھی جس کی وجہ سے کبیر کو کسی پل چین نہیں تھا اس کے دوستوں نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا، وہ رات دن اللہ سے اپنے گناہوں کی گڑگڑا کر معافی مانگتا تھا مگر ابھی اس مظلوم کی آہیں باقی تھیں، رابعہ کے سسرال والوں نے رشتہ توڑ دیا تھا، انہیں کبیر کی غلط نازیبا حرکتوں کی خبر اس کے جگری یار گڈو کے ذریعے ہو گئی تھی، جس نے تعلق توڑنے پر اس سے دشمنی میں یہ سب کچھ کیا تھا کیونکہ اب اسے کبیر سے عیاشی کے نام پر کچھ نہیں ملنے والا تھا، اسی غم میں ایک دن اس کا باپ خاموشی سے یہ دنیا چھوڑ گیا اس وقت اسے عنایہ

کے باپ کے درد کا احساس ہوا کہ اس نے بھی اپنی جوان بیٹی کی رسوائی کا دکھ سہا تھا، اس کے گناہوں کا کفارہ اس کی معصوم بہن اور باکردار معزز باپ کو ادا کرنا پڑا ابھی اس غم سے وہ سنبھل نہیں پایا تھا کہ بڑی بہن کو اولاد نہ ہونے کی وجہ سے طلاق ہوگئی، وہ طلاق کا داغ عنایہ کی روشن پیشانی پر لگانا چاہتا تھا لیکن اللہ نے اس کی معصوم بہن کو اس کے گناہ کی سزا دی، اس کا ہنستا بستا گھر اس کی بے راہ روی اور غلط روش کی وجہ سے بد دعاؤں کی لپیٹ میں آگیا تھا، اس نے عنایہ کے قبر پر گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگی تھی۔

رابعہ کا رشتہ اس کے خالہ زاد کزن سے طے ہوگیا تھا خالہ، رابعہ کو بیاہ کر ہمیشہ کے لئے دوبئی شفٹ ہوگئی تھیں، جانے سے پہلے اس نے رابعہ سے بھی اپنے غلط رویے اور دل آزاری کی معافی مانگی تھی وہ بے چاری ہمیشہ کی طرح بھائی کی محبت میں پگھل گئی اور اسے کشادہ دل کے ساتھ معاف کر دیا، جس سے اس کے مضطرب دل کو تھوڑا سکون نصیب ہوا اس نے وہ محلہ چھوڑ دیا تھا بڑی بہن کو بھی وقت کے ساتھ ساتھ صبر آ گیا تھا، اب وہ دونوں بہن بھائی ہی ایک دوسرے کے دکھ درد کے ساتھی تھے بڑی بہن نے کسی طرح کبیر کو شادی کرنے پر راضی کرلیا جس پر اس کی ایک ہی شرط تھی کہ لڑکی کسی غریب گھر کی سیدھی سادی گھریلو ہونی چاہیے مگر یہاں پر بھی تقدیر اس مہربان نہیں رہی تھی، رباب شروع میں ٹھیک ٹھاک رہی پھر اس نے اپنے رنگ ڈھنگ دکھانے شروع کر دیے، کبیر جو اپنے گناہوں کے بوجھ میں تنہا دبا ہوا تھا کہ اسے رباب کی حرکات و سکنات پر غور کرنے کا موقع نہیں ملا وہ جتنے پیسے مانگتی اسے وہ بلا چوں چراں کیے دے دیتا، اس کا خیال تھا کہ وہ ایک غریب لڑکی کو اپنی محبت و توجہ

دے کر عنایہ کے ساتھ کی گئی زیادتی کا کفارہ ادا کر سکتا ہے لیکن شاید اس کو ابھی معافی نہیں ملی تھی، ایک دن چپکے سے وہ سارا زیور وقیمتی اشیاء لے کر رات کے اندھیرے میں اپنے کزن کے ساتھ فرار ہوگئی اس دن کبیر کو احساس ہوا کہ ذلت ورسوائی کیا ہوتی ہے؟ جس کی بیوی اس کی عزت کا جنازہ نکال کر چلی جائے اس سے بڑھ کر بھلا کوئی دکھ ہوسکتا ہے، بعد میں رباب کے مطالبے پر اس نے اسے طلاق کے کاغذات بھجوا دیئے، اسی غم میں ایک دن بڑی بہن بھی اسے چھوڑ کر سپرد خاک ہوگئی، انہیں کافی عرصے سے ٹی بی تھی شوہر کی بے وفائی کا دکھ اور پھر بھائی کی بربادی نے انہیں اندر ہی اندر روگ لگا دیا تھا مگر کبیر کو خبر نہ ہوسکی، اب وہ اپنے آپ کو بالکل ہی بے بس وتنہا محسوس کرنے لگا اس کی زندگی بے مصرف ہو کر رہ گئی تھی اس ہوٹل سے کمائی گئی دولت وہ فلاحی کاموں اور عنایہ ٹرسٹ میں پناہ گزین غریب ولاچار عورتوں اور لڑکیوں پر خرچ کرتا تھا، باقی سارا وقت اللہ کے سامنے سجدہ کرتے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے گزرتا، اسے یقین تھا کہ ایک دن عنایہ کی روح اسے معاف کر دے گی تو اللہ پاک بھی اس سے راضی ہو جائے گا اور تب ہی اس کے بے قرار دل کو سکون نصیب ہوگا اور آج شاید قبولیت کی گھڑی تھی جب ہی خاور جیسے بگڑے لڑکے کو راہ راست پر لانے کے لئے اللہ پاک نے اسے چنا تھا، اپنی بھیانک وشرمناک ماضی کی داستان سنا کر کبیر خاموشی سے وہاں سے جانے لگا تو خاور نے اسے ہاتھ پکڑ کر روک لیا، کبیر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا خاور کے چہرے پر ندامت و شرمندگی کے ملے جلے تاثرات تھے اس کے باقی دوستوں کا بھی یہی حال تھا۔

''کبیر بھائی! آپ نے ہماری آنکھیں کھول دیں مجھے کبیر بننے سے بچالیا، آج میں بھی کسی کی بیٹی کی عزت وناموس تار تار کی دھجیاں اڑانے چلا تھا مگر اللہ نے آپ کو نیکی کا فرشتہ بنا کر مجھے اس ذلت و پچھتاوے کے کنویں میں گرنے سے بچالیا آپ نے جو کچھ کیا وہ برے افعال آپ کا ماضی کا حصہ تھے، لیکن مجھے یہ یقین ہے کہ اللہ کو آپ کی یہ نیکی پسند آئے گی آپ نے جس بہادری سے اپنے عیبوں کا پردہ چاک کیا یہ بھی نہ سوچا کہ اس طرح اپنے عیب دار ماضی کو کھول کر آپ ہماری اور دوسروں کی نظر میں گر سکتے ہیں، اللہ کو آپ کا یہ نیک عمل ضرور پسند آیا ہو گا میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں خود کو ماضی کا بدکردار کبیر نہیں بلکہ میرے سامنے جو نیک دل کبیر کھڑا ہے اس جیسا بناؤں گا میں رہزن نہیں بلکہ رہنما بنوں گا اپنی تمام بری عادتیں ترک کر کے پڑھائی میں دل لگاؤں گا اور پھر اپنے باپ کا بازو اور بہن کا مضبوط سہارا بن کر اس لڑکی کو باعزت طریقے سے اپنی زندگی میں شامل کروں گا جس سے عنایہ جی کے روح کو بھی آپ کے اس نیک عمل اور گناہوں کے کفارہ سے سکون ملے گا۔'' کبیر کی آنکھیں الوہی چمک سے روشن ہوگئی اس کی پیشانی پر روشن محراب بھی اس کی نیک نیتی کی گواہی دے رہا تھا، اس کی آنکھوں سے تشکر کے اشک رواں تھے اسے لگا آج عنایہ نے اس سے نظریں نہیں پھیریں بلکہ اسے دیکھ کر مسکرا رہی ہے، آج اس نے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کر دیا تھا، ایک اور عنایہ کو کبیر کے ذریعے لٹنے سے بچالیا تھا، اسی شکرانے کے طور پر اس نے حرم شریف حاضری دینے کا فیصلہ کیا آج اس کا دل اپنے ماضی کے اس شرمناک راز کے بوجھ سے آزاد ہو کر ہلکا پھلکا ہو چکا تھا۔

☆☆☆

میرا دوست میرا غمگسار

کنول ریاض

ہمیشہ ڈائجسٹ میں ''ماں'' کے عنوان سے ہی کالم پڑھے ہیں اور تب کبھی خود بھی بھولے سے یہ خیال نہیں آیا کہ باپ کے عنوان سے بھی لکھا جا سکتا ہے، یا پھر ہم پاکستانی قوم کا المیہ ہی یہ ہے کہ ہم ''ماں'' کو ہی ''کل'' سمجھتے ہیں اور ''باپ'' کی ہر بات، ہر چیز کو حق سمجھ کر صرف وصولتے ہیں، شاید میں بھی اس دھوکے کا شکار رہتی اگر یہ محبوب ہستی یوں اچانک دنیا سے منہ موڑ کر نہ چلی جاتی، اب جب کہ میرے ابو دنیا میں نہیں رہے ہے تو مجھے ہر وہ لمحہ یاد آ رہا ہے جس نے مجھے لکھنے پہ اکسایا ورنہ شاید مجھے لگتا تھا کہ میں اب کافی عرصے تک لکھ نہیں پاؤں گی لیکن یہ میرے ابو کی مجھ سے محبت ہی ہے جس نے اپنی زندگی میں بھی میرے لکھنے کی حوصلہ افزائی کی اور مرنے کے بعد بھی ان ہی کے خیال نے مجھے قلم اٹھانے پہ مجبور کیا۔

امی بتاتی ہیں کہ میری پیدائش سے پہلے میرے ابو اور چچا دعا کرتے تھے کہ ان کے گھر بیٹی ہو اور جب میں پیدا ہوئی تو یہ دونوں واحد ہستیاں تھیں جو میری پیدائش پہ خوش تھیں اور میری دادی اور پھپھو افسردہ کہ پہلی بار میں ہی بیٹی ہو گئی۔

اتنی محبت سے مانگی بیٹی کا نام میرے ابو نے نہیں رکھا اب سوچنے بیٹھی ہوں تو حیران ہوتی ہوں کہ میرا مڈل پاس باپ کتنا لبرل تھا جس نے صرف محبت دی وصولی کا سوچا تک نہیں ہم سب بہن بھائیوں کے نام بغیر کسی جھگڑے کے ہماری امی نے رکھے اور تو اور میرے بچوں کے نام بھی میں نے اور امی نے مل کر تجویز کیے ابو نے بھولے سے ایک بار بھی اپنی رائے نہیں دی پوچھا تو کہا۔

''جو تمہیں اچھا لگے۔'' حالانکہ ہمارے معاشرے میں اکثریت یہ حق اپنے پاس رکھتی ہے کہ نسل ہماری ہے تو نام بھی ہم ہی رکھیں گے۔

میری پیدائش سے لے کر اب تک جتنی محبت ابو سے میں نے وصول کی وہ میرے دونوں بھائیوں کے حصے میں نہیں آئی شاید اس لئے کہ بیٹیاں باپوں کی زیادہ لاڈلی ہوتی ہیں یا پھر اس لئے کہ میں مزاج اور سوچ میں اپنے ابو کی طرح تھی، بچپن میں بیمار پڑنے پہ بچے ماؤں کو پکارتے ہیں اور میں ہائے ابو، ہائے ابو کی گردان کرتی تھی اور ابو دوکان چھوڑ کر بھاگے آتے اور شادی کے بعد تک میری یہی روٹین رہی اور آفرین ہے میرے باپ پہ جس نے ہر اچھے برے میں میرا ساتھ دیا، مجھے آج بھی ہسپتال کے کمرے کا وہ منظر اچھی طرح یاد ہے جب میری بیٹی کی پیدائش پہ سب سے زیادہ میرے ابو خوش تھے اور ان دنوں میں، مجھے اپنے ہاتھ سے چائے پلاتے، انڈہ کھلاتے۔

''تم لیٹی رہو میں کھلاتا ہوں۔''

(حالانکہ میری ساس اور امی دونوں وہاں موجود ہوتی تھیں) جب تمثال بیمار ہوئی اور ہمیں ہسپتال میں رات رکنا پڑا تو ابو نے اسے گود میں لیٹا کر ڈرپ لگوائی اور ساری رات میرے ساتھ ہسپتال میں رہے۔

اگر اپنی شادی کا ذکر کروں تو میرا رشتہ ابو کی منشاء پہ ہوا امی کو صرف ایک بات کہی۔

''بیٹی کا مجھے کرنے دو بیٹوں کا تم اپنی مرضی

سے کرلینا۔"
(میرا رشتہ پھپھو کے گھر ہوا ہے) اور پھر میری رضامندی سے ہاں کردی اور جب جس رات رخصت ہو کر میں سسرال آئی وہ رات میرے باپ نے جاگ کر گزاری تھی اور صبح جب نماز کے لئے میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو باہر صوفے پہ میرے امی ابو بیٹھے تھے مجھ سے ملنے کے لئے، میں شاید اس ایک رات کا قرض بھی نہیں اتار سکتی اتنی محبت، میری بیٹی کس حال میں ہو گی خوش ہو گی یا ناخوش پتا نہیں ان لمحوں میں کیا کیا خیالات ابو کے ذہن میں آئے ہوں گے جس نے انہیں سونے ہی نہ دیا نومبر کی لمبی راتیں اور میرے باپ کی بے قراری، یہ سب ان کی وفات سے پہلے تک سوچا بھی نہ تھا۔

میرے ددھیال، سسرال میں پڑھائی کو کچھ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا میری عمر کی لڑکیاں پانچوں کے بعد گھروں میں بیٹھ جاتی ہیں اور مجھ سے بعد کی جنریشن میٹرک پاس ان سب میں واحد میں تھی جس نے ماسٹرز کیا جاب کی اور تو اور کہانیاں لکھیں وہ بھی رسالوں میں؟

حیرت در حیرت تھی خاندان میں اتنی آزادی؟ اور یہ سب میرے ابو کی بدولت تھا، میرا ننھیال کافی پڑھا لکھا ہے میری امی کی نانی، دادی اپنے وقتوں کی پڑھی ہوئی تھیں (دو، دو، تین، تین جماعتیں) میرے ابو نے تعلیم کی اہمیت کو سمجھا اور مجھے مکمل آزادی دی بھرپور اعتماد کے ساتھ، میرے ابو کو میرے کردار میری ذات پہ اندھا اعتبار تھا۔

(شکر ہے اللہ کا جس نے ان کا یہ اعتبار قائم رکھا) میری امی اتنی پڑھی لکھی فیملی سے ہونے کے باوجود خوفزدہ تھیں کہ کہیں میرا لکھنا لکھانا میرے ابو کو ناگوار نہ گزرے لیکن جب میرا ایک ماہنامے میں پہلا خط شائع ہوا تو ابو اتنے خوش تھے کہ بیان سے باہر تھا میرے خط کو بار بار پڑھا اس پہ اتنا جامع تبصرہ اور پھر ہر آئے گئے کو پڑھانا میری بیٹی کا خط شائع ہوا ہے اور جب میں نے کہانیاں لکھنی شروع کی تو بولے۔

"اب میں مطمئن ہوں میری بیٹی کے ہاتھ میں ہنر آ گیا ہے مشکل وقتوں میں بھوکی نہیں رہے گی گھر بیٹھے عزت سے کما لے گی۔"

ساری زندگی خود حلال کی کھا کر اور ان تھک محنت سے کما کر کھلانے والے کے منہ سے یہ بات عجیب نہیں لگتی کہ وہ اپنی ماسٹر ڈگری ہولڈر اور موفیسٹری سپیشلسٹ بیٹی کے لئے ایسے الفاظ کہے کیونکہ ہمارے ابو نے بہت محنت سے کمایا ہے کبھی کوئی چور راستہ نہیں تلاشا، یہاں تک کہ ہمارے ماموؤں سے بھی کسی بھی قسم کی امداد لینے سے انکار کر دیتے تھے (میرے ننھیال بہت کھاتے پیتے ہیں بس میری امی اپنی آنکھوں کی بینائی کمزور ہونے کی وجہ سے میرے ابو سے بیاہی گئی تھیں میرے ددھیال میرے ننھیال کے سامنے آٹے میں نمک برابر بھی نہ تھا روپے پیسے اور پڑھائی وغیرہ کے معاملے میں)

میرے ابو نے بہت سے کاروبار بدلے، ابن آس کا طالبعلمی کا زمانہ اکثر ذہن میں آتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے طالبعلمی کے زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کی عمارت کے لئے پتھر کوٹے تھے، میرے ابو نے اگر مزدوری نہیں کی تو کچھ کم بھی نہیں کیا، کپڑے کی دوکان بنائی، بیکری کھولی، آئس کریم کی، ایجنسی لی، ڈرنک بنانا سیکھا اور آخر میں سپیئر پارٹس کا کاروبار کیا، ہر کام دو تین سال اچھا چلتا اور پھر نقصان ہو جاتا، اب جب ابو کی وفات پہ ہم بہن بھائی اکٹھے بیٹھے ہیں تو سوچتے ہیں کہ اتنی تنگی کے باوجود ہمارے ماں

باپ نے ہمیں کبھی باور بھی نہیں کروایا تھا کہ ہمارے پاس پیسے کم ہیں تم لوگ امراء کے بچوں جیسی چیزوں کی ضد نہ کرو، کھلونوں سے لے کر بیگوں اور جیومیٹری باکسز، لنچ باکس تک ہم نے اعلیٰ استعمال کیے اور خود ہمارا باپ تین جوڑوں میں گرمیاں بھی گزارتا اور آنے جانے کا بھی ایک جوڑا ان میں سے ہی سنبھال کر رکھ دیا جاتا، پتا نہیں شاید ہر باپ ایسے ہی کرتا ہو لیکن وہی بات کہ ہمیں ماؤں کی قربانیاں تو یاد رہتی ہیں باپ کا ایثار بھول جاتے ہیں۔

میرے بچپن سے لے کر میری اب تک کی بتیس سالہ زندگی میں، میں نے ہر چھوٹی بڑی بات ابو سے شیئر کی وہ میرے دوست، مشیر سب ہی کچھ تھے، میں نے اپنی دوستوں کے قصے بھی اپنے باپ کو سنائے ہیں اپنی جاب کے مسائل بھی اپنے ابو سے ڈسکس کیے اور اپنے سسرال کے دکھڑے بھی ان ہی کے سامنے روئے ہیں اور مزے کی بات یہ کہ ہر بار وہ کہتے۔

''تم خود کو حق بجانب سمجھتی ہو تو بس ٹھیک ہے باقی سب میں دیکھ لوں گا۔'' اور اس کے بعد میں صحیح ہوتی چاہے غلط، میرا باپ ڈھال بن کر میرے آگے کھڑا ہوتا تھا اور اب جب وہ نہیں رہے تو لگتا ہے کہ میرے کندھوں پہ پڑا حوصلہ افزائی کا ہاتھ اٹھ گیا اور ان تیس پینتیس دنوں میں، میں ذہنی طور پر اتنی میچور ہو گئی ہوں کہ شادی کے آٹھ سال بعد بھی نہ ہوئی تھی، (ابو ہیں ناں وہ سب سنبھال لیں گے) اس سے آگے میری سوچ جاتی ہی نہ تھی۔

میرے اندر یادوں کا اک جہاں ہے جو اُمڈا چلا آ رہا ہے۔

میری امی اکثر کہتی تھیں کہ میری کہانی لکھو (اک تھوڑا صبر) کے نام سے فوزیہ کے پاس پڑی ہے وہ کہانی) اور میں ہر بار ٹال جاتی کہ شاید ابو کو اچھا نہ لگے لیکن پھر اچانک ہی ایک نشست میں لکھ ڈالی اور تب دور دور تک ذہن میں یہ خیال بھی نہ گزرا تھا کہ میرے باپ کی قربانیاں بھی کچھ کم نہیں ہیں۔

امی سے ذکر کیا کہ کہانی ارسال کر دی ہے تو انہوں نے ابو کو بتایا اور ابو کی وہ ایک نظر...... باوجود کوشش کے میں اس کا مفہوم نہیں جان پائی فوراً میرے منہ سے نکلا ''ابھی چھپی نہیں ہے'' لیکن انہوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا شاید یہ شکوہ ہے کہ میں نے خود کیوں نہیں بتایا، ورنہ شکوہ گلہ تو میرے باپ کی فطرت میں نہیں تھا، شاہانہ مزاج دے کر میرے باپ کو مٹی میں رولنے والے رب سے بھی کوئی شکوہ کرتے میں نے نہیں سنا ہر حال میں راضی بہ رضا تھے امی کبھی حالات سے گھبرا جاتی تو حوصلہ دیتے تھے کہ اللہ اچھے دن لائے گا آزمائش میں شکوہ نہیں شکر کرتے ہیں، زندگی کی آخری سانس تک میرے ابو کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ اپنی جیب سے خرچ کرنے کی کوشش کرتے۔

اٹھارہ رمضان کو بیمار ہوئے تو جب ایک ہفتے تک اپنے شہر میں افاقہ نہ ہوا تو بھائی سی ایم ایچ کھاریاں لے گیا، آخری وقت تک اللہ تعالیٰ نے میرے ابو کو اتنا حوصلہ عطا کیا تھا کہ انہوں نے اپنی موت کی ہر منزل بھی خود طے کی۔

یکم اگست سے لے کر پندرہ اگست ان کی وفات کے دن تک وہ بہت تکلیف میں رہے لیکن منہ سے ذکر نہیں کیا، میں ان دنوں امی کی طرف ہی تھی پوری پوری رات چکر لگاتے اور جب ہم پوچھتے ''کیا ہوا؟'' تو یہ کہتے ''کچھ نہیں ہوا بس ابھی اٹھا ہوں'' ہر بات کے جواب میں ''میں ٹھیک ہوں''

آخری دنوں میں کھانا پینا تقریباً چھوٹ گیا تھا ان کا آدھا سیب، ایک سلائس اور آدھا گلاس جوس، سارا دن میں بس یہ ہی ان کا کھانا تھا، پانی تک گلاس سے پینا چھوڑ دیا تھا کہ ایک آدھ گھونٹ لینا ہے بوتل سے پی لیتا ہوں اور حوصلہ اتنا کہ ان کی وفات سے ایک منٹ پہلے تک ہمیں علم نہ ہوسکا کہ وہ جانے والے ہیں بس اتنا کہا کہ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا آ رہا ہے، میں نے کہا اندر لے جاؤں بولے لے جاؤ اور ساتھ ہی سانس اکھڑ گئی میں نے اونچی آواز میں کلمہ شریف کا ورد شروع کر دیا انہوں نے آخری نظر دیکھا اور میرے اور بھائی کے اٹھاتے اٹھاتے، بھائی کی بانہوں میں آخری ہچکی بھی لے ڈالی، چار پائی پر لٹاتے ہی ہلکے سے ہاتھ مڑے اور بس روح پرواز کر گئی، یہ تھا میرے باپ کا وقت نزع جس کا خوف سوتے سے لوگوں کو اٹھا دیتا ہے، لیکن اللہ کا فرمان سچا ہے کہ (مفہوم) میری راہ پہ چلنے والوں کو نہ کوئی دکھ ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے، اور میرے باپ کی ساری عملی زندگی ایک طرف اور رزق حلال کا حصول ایک طرف ان کی خود داری کا یہ عالم تھا کہ میرے بھائی نے ڈیڑھ سال سعودیہ سے اپنی تنخواہ بھجوائی ہے جو بینک میں ہی رہی میرے ابو نے اس کو نگاہ اٹھا کر دیکھا بھی نہیں گھر کا خرچ ابو ہی چلاتے تھے۔

ایک بار امی نے بھائی سے پوچھا تمہاری تنخواہ نہیں بڑھی تو بعد میں امی سے شدید ناراض ہوئے کہ بچے کو پردیس میں کیوں پریشان کرتی ہو تمہیں اس کی تنخواہ سے کیا لینا دینا، اس کی شادی اور کاروبار کے لئے جمع ہونے دو، وہ بس اک بات پہ خوش تھے کہ میرا بیٹا اچھی پوسٹ پر ہے اور اللہ کے گھر عمرہ کر آیا ہے، امی اکثر کہتیں ہم بھی عمرہ کرنے چلے گئے تو کہتے تم عمرہ کرنا میں تو حج کروں گا کیا پتا دوبارہ مہلت ملے نہ ملے لیکن ان کے نصیب میں یہ سعادت نہ تھی۔

عشق رسولﷺ میرے ابو کی رگ رگ میں تھا اور یہی وجہ اقبال سے محبت کا سبب بنی، چھٹی، ساتویں میں کلام اقبال ابو ہی سمجھاتے تھے، پودوں کی گوڈی کرتے جاتے اور ساتھ ساتھ اقبال کے اشعار ہم باپ بیٹی کی بحث کا حصہ ہوتے، اشفاق احمد کا زاویہ شوق سے دیکھتے تھے اور پھر ٹاک شو حسن نثار کا، کامران خان ہو یا شاہ زیب خانزادہ ہر پروگرام دیکھنا اور پھر اس پہ تبصرہ کرنا ہم دونوں کا محبوب مشغلہ تھا، ایسے میں امی کا ڈائیلاگ ان لوگوں کی جگہ تم باپ بیٹی پروگرام کرلیا کرو، اتنا سب کچھ ایک جیسا ہونے کے باوجود ایک اختلاف تھا باپ بیٹی میں وہ پکے ن لیگی اور میں سپورٹر پی ٹی آئی کی۔

میری ہر کہانی میرے ابو نے پڑھی ہے اور اس پہ تبصرہ بھی کیا ہے، (ایک واحد ابو ہی پڑھتے تھے باقی سارے تو کورا جواب دے دیتے، (معاف کرو اتنا حوصلہ نہیں کہ تمہیں سننے کے بعد پڑھیں بھی (بھائی، شوہر)

یہاں تک کہ مجھے لکھنے پہ اکساتے ہی تھے ''خار دار'' لکھوانے اور اس پہ تحقیق کرنے میں مجھ سے زیادہ میرے ابو کا ہاتھ ہے، مجھے یاد ہے کہ میری پرنسپل نے مجھے کہا تھا کہ اخبار میں اشتہار آیا ہے کہ ایڈز پہ لکھو آپ ضرور لکھنا ان کے سامنے تو میں نے اقرار کرلیا لیکن دل ہی دل میں ہچکچائی کہ ایڈز پر لکھنا مشکل ہے، گھر آ کر کھانا کھانے کے دوران معمول کے مطابق ساری روداد ابو کو سنائی تو بولے۔

''بیماری ہی تو ہے، تمہیں لکھنا چاہیے۔'' پھر خود مجھے ڈاکٹر اکبر کے پاس لے کر گئے، وہ بولے۔

"بیٹا یہ آپ کس کام میں لگ گئی ہو رہنے دو (تب میں غیر شادی شدہ تھی)۔" میرے کچھ کہنے سے پہلے ابو بولے۔

"ڈاکٹر صاحب آپ اس بات کو چھوڑیں بس بچی کو معلومات فراہم کریں پھر ابو کے ہی اصرار پر انکل نے مجھے بکس دی تھیں اور کچھ ریسرچ جن کی بدولت میں کہانی لکھ پائی۔"

کبھی کہا نہیں لیکن میرے نام کے ساتھ اپنا نام دیکھ کر خوش ہوتے تھے، جبھی میں نے شادی کے بعد بھی نام تبدیل نہیں کیا، مجھے خود بھی اندازہ ہے کہ میں بہت بے ربط لکھ رہی ہوں، ان گنت باتیں میں جو احاطہ تحریر میں لانے سے قاصر رہی ہوں شاید وہ تمام لمحے جب میرے قول و فعل سے میرے ابو کو تکلیف ہوتی یا شرمندگی ہوئی لیکن اگر وہ سب لکھنے بیٹھی تو شاید ایک کتاب بن جائے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے میری کوتاہیوں کو معاف کرے کہ یقیناً میرے باپ نے تو ان کو دوبارہ سوچا بھی نہ ہوگا کچھ ایسا ہی پیار تھا انہیں اپنی اولاد سے نہ جتانے والا نہ طنز و تشنیع والا، آپ سب کا شکریہ یہ جنہوں نے اس بے ربط تحریر کو پڑھنے کے لئے وقت نکالا اور خاص طور سے فوزیہ کا شکریہ کہ جس نے میری ہر تحریر کی پذیرائی کی اور یقیناً اگر میرے لکھوانے میں میرے ابو کا ہاتھ ہے تو اس سفر کو جاری رکھنے میں فوزیہ کا کمال ہے جس نے ہمیشہ مجھے لکھنے کے لئے اکسایا اگر فوزیہ میری تحریریں شائع نہ کرتی تو شاید آج میں لکھنے کا سفر ختم کر چکی ہوتی جبھی تو اب کم لکھنے کی وجہ سے پچھلے چار سال سے صرف حنا کے لئے ہی لکھ رہی ہوں یہ فوزیہ کی محبت کا اعجاز ہے۔

آپ سب سے گزارش ہے کہ میرے ابو کے لئے ایک بار الحمد شریف اور تین بار سورہ اخلاص پڑھ کر ان کی مغفرت کے لئے ضرور دعا کیجئے گا کہ اب یہ دعاؤں کا ہی تحفہ ہے جو ہم انہیں دے سکتے ہیں۔

بہت سے لوگوں کو حیرت ہے کہ میں اپنے باپ کے لئے اس طرح نہیں روئی جس طرح رونا چاہیے تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے لوگوں کے سامنے رونا ہی نہیں آتا ہاں جب نماز کے لئے کھڑی ہوتی ہوں تو آنسو چپکے سے کہیں سے نکل آتے ہیں، مجھے اس بات کا افسوس نہیں کہ وہ کیوں گئے، وہ اللہ کی امانت تھے اللہ نے لے لئے، شکر ہے اس ذات پاک کا جس نے میرے باپ کو محتاجی سے بچایا اور چلتے پھرتے بغیر کسی تنگی، معذوری کے وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے جس شان سے میرے ابو ساری زندگی جیے ہیں ویسی ہی اللہ تعالیٰ نے انہیں موت عطا کی، وہ خود کہتے تھے بیماری اور موت کا کوئی تعلق نہیں ہے اور واقعی بیماری ان کی موت کا سبب نہیں بنی رہی بات افسوس کی تو اس بات کا افسوس ضرور ہے کہ میرا دوست، میرا غمگسار چلا گیا اور وہ ساری باتیں جو میں ان سے کرتی تھی اب کسی سے بھی نہیں کر پاؤں گی امی سے بھی نہیں کہ ان سے میری دوستی دنیا داری کی باتوں تک ہے، اندر کی باتیں تو بس ابو سے ہی کرتی تھی، لیکن میرا یقین ہے کہ یہ جدائی عارضی ہے انشاء اللہ جنت میں ہم ان کے ساتھ ہوں گے اور اب تو مرنے سے بھی خوف نہیں آتا کہ ابو وہاں ہیں پھر موت کے بعد تنہائی کا ڈر کیسا؟

ہاں بس اک بات پہ رونا آتا ہے کہ جب میں امی کے گھر جاتی تو ابو مجھے دیکھ کر کھل جاتے اور کہتے۔

"کنول آئی ہے۔" بس اب یہ الفاظ کہنے والے مسکراتی آنکھوں والا میرا باپ نہیں ہوگا۔

☆☆☆

القرآن

O ''کیا تو نے نہیں دیکھا بے شک اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور (خصوصاً) پرندے بھی جو پر پھیلائے (اڑتے پھرتے) ہیں، سب کو اپنی اپنی دعا اور تسبیح یاد ہے اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ وہ لوگ کرتے ہیں۔'' (سورہ نور، رکوع ۶)

O ''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کا ذکر خوب کثرت سے کرو اور صبح شام اس کی تسبیح کرو۔'' سورہ احزاب رکوع ۶)

O ''اے لوگو! جو ایمان لائے ہیں بچاؤ، اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے، جس پر نہایت تند خو اور سخت گیر فرشتے مقرر ہوں گے جو کبھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انہیں دیا جاتا ہے، اسے بجا لاتے ہیں، (اس وقت کہاں جائے گا کہ) اے کافرو! آج معذرتیں پیش نہ کرو تمہیں تو ویسا ہی بدلا دیا جا رہا ہے جیسے تم عمل کر رہے تھے۔'' (التحریم)

O ''جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا اللہ نے ان کے عمل برباد کیے اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور اس پر ایمان لائے جو محمدؐ پر اتارا گیا اور وہی ان رب کے پاس سے حق ہے، اللہ نے ان کی برائیاں اتار دیں اور ان کی حالتیں سنوار دیں۔''

(محمدؐ)

نازیہ عمر، پشاور

پانچ عمل

نبی آخر الزمان مصطفی ﷺ نے ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ارشاد فرمایا۔

''اے علی! روزانہ رات کو پانچ کام کر کے سویا کرو۔''

اول: چار ہزار دینار صدقہ دے کر سویا کرو۔

دوم: ایک قرآن شریف پڑھ کر سویا کرو۔

سوئم: جنت کی قیمت دے کر سویا کرو۔

چہارم: دو ناراض لوگوں میں صلح کرا کے سویا کرو۔

پنجم: ایک حج کر کے سویا کرو۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا۔

''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ امر تو محال ہے میں کیسے کر سکوں گا؟'' فرمایا۔

''چار مرتبہ سورہ فاتحہ پڑھ کر سویا کرو، اس کا ثواب ایک قرآن پاک پڑھنے کے برابر ہے، دس مرتبہ درود شریف پڑھ کر سویا کرو یہ جنت کی قیمت ادا کرنے کے برابر ہو گا، دس مرتبہ استغفر اللہ پڑھ کر سویا کرو یہ دو لڑنے والوں میں صلح کرانے کے برابر ہو گا، چار مرتبہ تیسرا کلمہ پڑھ کر سویا کرو ایک حج کا ثواب ملے گا۔''

اس پر حضرت علی نے عرض کیا۔

''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اب تو میں ہر رات یہی عمل کر کے سویا کروں گا۔''

علینہ طارق، لاہور

بکھرے موتی

O کبھی کبھی ہر انسان کو بڑے گناہ سے بچنے کی خاطر چھوٹا گناہ بھی کرنا پڑ جاتا ہے۔
O امن کی فاختہ وہیں اترتی ہے جہاں پیار اور صلح کی دھوپ پھیلتی ہو۔
O جو شخص وعدہ کرنے سے جتنا زیادہ گریز کرتا ہے وہ وعدے کا اتنا ہی زیادہ پابند ہوتا ہے۔
O آپ کو اس دنیا سے جانے کے بعد دوبارہ کبھی لوٹ کر نہیں آنا تو پھر جو نیکی بھی کرنی ہے بڑے خلوص سے فوراً کر ڈالیے۔

زارا علی، منڈی بہاؤالدین

روشن سطریں

ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

میں اپنے بندوں کے گمان کے مطابق ہوں، جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔

اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتے تو میں اسے اپنے دل میں یاد کرتا ہوں۔

اگر وہ جماعت یاد کرے تو میں اسے ایسی جماعت میں یاد کرتا ہوں جو ان سے بہتر ہے۔

اگر وہ ایک بالشت میرے قریب آئے تو میں ایک ہاتھ اس کے قریب آتا ہوں۔

اگر وہ ایک ہاتھ میرے قریب آئے تو میں دو ہاتھ اس کے قریب آتا ہوں۔

اگر وہ میرے پاس چلتا ہوا آئے تو میں اس کے پاس دوڑ کر آتا ہوں۔

(حدیث قدسی: بحوالہ بخاری، مسلم، ترمذی، ابن ماجہ)

رمشا احمد، لاہور

انمول موتی

☆ ستاروں سے روشن رہنے کا سبق ضرور سیکھو مگر ستارہ بننے کی خواہش نہ کرو کیونکہ یہ راستہ دکھا سکتے ہیں، منزل نہیں ہوتے۔
☆ گناہ کرنے کے ساتھ ساتھ خدا کی رحمت کی امید رکھنا بدقسمتی کی علامت ہے۔
☆ رشتے اہم نہیں ہوتے ان کو سمجھنے کے طریقے اہم ہوتے ہیں۔
☆ وہ انسانی شخصیت کبھی کھوکھلی نہیں ہوتی جس میں جذبوں اور انسانی عظمت کے اوصاف موجود ہوں۔
☆ وہ شخص ہمیشہ بے فیض رہتا ہے جو اپنے استاد کی عظمت و بزرگی کا خیال نہیں رکھتا جس سے ایک نقطہ سیکھو، اس کی دل سے عزت کرو۔
☆ جتنا کسی کا ساتھ پرانا ہو، اتنا ہی اس کی بے وفائی کے لئے تیار ہونا چاہیے، کیونکہ تبدیلی کائنات کا خمیر ہے۔

لائبہ رضوان، فیصل آباد

دلچسپ و حیرت انگیز معلومات

☆ ہمنگ برڈ وہ پرندہ ہے جو اڑ تو سکتا ہے مگر چل نہیں سکتا اور یہی وہ واحد پرندہ ہے جو جتنی رفتار سے سیدھا اڑتا ہے اتنی ہی رفتار سے پیچھے کی طرف بھی اڑ سکتا ہے۔
☆ بلجیم دنیا کا وہ واحد ملک ہے جہاں ننگے پاؤں چلنا جرم ہے اور اس جرم پر باقاعدہ سزا دی جاتی ہے۔
☆ ناروے کے بادشاہ السپسن نے اپنے پالتو کتے کو ایک ریاست کا وزیر اعلیٰ مقرر کیا تھا۔
☆ سارس وہ گونگا پرندہ ہے جو کچھ بھی بول نہیں سکتا۔
☆ وسطی افریقہ کے ہاکی نامی گاؤں میں ایک ایسا درخت پایا جاتا ہے جو ہر وقت گول گول

گھومتا ہے۔

☆ چھوٹی ملک کی پولیس صرف چار افراد پر مشتمل ہے۔

☆ چمگادڑ دنیا کا وہ واحد اڑنے والا جانور ہے جس کے دانت ہوتے ہیں اور وہ اپنے بچوں کو دودھ پلاتا ہے۔

عالی ناز، گوجرانوالہ

سب کا خیال رکھیں

مدینہ میں بنوسلمہ نے اپنے محلے میں ایک مسجد بنائی تھی، جہاں حضرت معاذ بن جبل نماز پڑھایا کرتے تھے، ایک دن عشاء کی نماز میں انہوں نے سورہ بقرہ پڑھی یہ قرآن پاک کی سب سے لمبی سورہ ہے، پیچھے کی صفوں میں ایک صاحب تھے جو سارا دن کھیت میں کام کرکے آتے تھے اور بہت تھکے ہوئے تھے، حضرت معاذ کی نماز ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ وہ نیت توڑ کر مسجد سے چلے گئے، حضرت معاذ کو خبر ہوئی تو کہنے لگے کہ وہ منافق ہے، اس شخص نے جب یہ سنا تو اسے بہت رنج ہوا اور حضورؐ کے پاس آیا اور حضرت معاذ کی شکایت کی۔

حضورؐ نے حضرت معاذ کو بلایا اور فرمایا۔

''چھوٹی سورتیں پڑھا کرو کیونکہ تمہارے پیچھے پڑھنے والوں میں سبھی قسم کے لوگ ہوتے ہیں، بوڑھے بھی اور وہ بھی جنہیں کوئی کام ہوتا ہے، تم کو سب کا خیال رکھنا چاہیے۔''

مہناز فاطمہ، خوشاب

بڑے لوگوں کی باتیں

O حقیقی خوبصورتی کا چشمہ دل ہے اگر یہ سیاہ ہو تو چمکتی آنکھیں کچھ کام نہیں دیتیں۔ (بو علی سینا)

O محبت کے لحاظ سے ہر ایک باپ یعقوبؑ اور حسن کے لحاظ سے ہر ایک بیٹا یوسفؑ ہے۔ (بو علی سینا)

O جو شخص لوگوں کو عمل صالح کی ہدایت کرے اور خود اس پر عمل نہ کرے اس کی مثال اس اندھے شخص کی مانند ہے جس کے ہاتھ میں چراغ ہو اس سے وہ دوسروں کو تو روشنی دے اور خود نہ دیکھ سکے۔ (حکیم افلاطون)

O تحریر ایک خاموش آواز ہے اور قلم ہاتھ کی زبان ہے۔ (سقراط)

O زندگی کی سب سے بڑی فتح نفس پر قابو پانا ہے، اگر نفس نے دل پر فتح پائی تو سمجھو کہ وہ دل مردہ ہے۔ (ارسطو)

O کوئی شیشہ انسان کی اتنی حقیقی تصویر پیش نہیں کر سکتا جتنی اس کی بات چیت۔ (بین جونس)

O اپنے متعلق آپ خود کچھ نہ کہیے، یہ کام آپ کے جانے کے بعد ہو جائے گا۔ (ایڈیسن)

O عمدہ چیز کو حاصل کرنا کوئی خوبی نہیں بلکہ اس کو عمدہ طریقے سے استعمال کرنا خوبی ہے۔ (جونسن)

O انسان کی عقل کا اندازہ غصے کی حالت میں لگانا چاہیے۔ (ہوشنگ)

O اگر غرور کوئی عمل ہوتا تو اس کے سند یافتہ بہت ہوتے۔ (ہربرٹ سپنسر)

O میری ہر تکلیف اور غم میں میری ماں کا تصور میرے لئے فرشتہ نجات بن کر آتا ہے۔ (ابو الفضل)

O سب سے خوبصورت اور شیریں ماں کا پیار ہے۔ (چارلس ڈکنز)

شازیہ ثمن، جھنگ

☆☆☆

نائمہ ثمن: کی ڈائری سے ایک نظم
جانے کون نگر کی چڑیا
شام منڈیر پر آ بیٹھی ہے
چونچ میں اک نازک سی ڈالی
اس پہ ایک سنہرا پھول
جیسے عشق سفر کی دھول
زارا علی: کی ڈائری سے ایک نظم
خواہشوں کے سمندر کے سب موتی تیرا مقدر ہوں
پھول لہجے پھول چہرے تیرے ہمسفر ہوں
تیری ساعت کی دسترس میں
کبھی وہ لفظ نہ آئے
کہ دل کو ملال ہو
تیری بصارتوں میں ہر وہ منظر اترے
روشن ہو صاحب جمال ہو
تیری شام وہجر تیرے برگ وثمر
تیرے لیل ونہار تیرا رنگ عارض ورخسار
امنڈتی بہاروں کی مثال ہو
یوں اتریں تیرے لئے رحمتوں کا موسم
کہ تیرے دعا کوئی حرف مدعا
آسمانوں سے بھی رد نہ ہو
تیرے نام کی دعاؤں میں شامل
کسی کا کوئی حرف بد نہ ہو
کہکشاں راستوں پر پیہم رواں رہے
میری دعا ہے کہ تیری عمر کا ہر لمحہ جاوداں رہے
مریم ماہ منیر: کی ڈائری سے ایک نظم
''تعلق''
کہتے ہیں کہ شام اور اداسی کا
تعلق گہرا ہوتا ہے

مگر یہ بات بھی طے ہے کہ
جب دل میں خوشیوں کے
پھول کھلتے ہیں
تو شام بھی ان
گلوں کے رنگوں سے
کچھ رنگ چرا کر
ان میں نہا کر
ڈھل کر حسین لگتی ہے
دل کو اچھی لگتی ہے
پنکی گڑیا: کی ڈائری سے ایک نظم
ہماری ان کہی باتوں سے
زیادہ خوب صورت ہیں
جنہیں کوئی نہیں لکھتا
جنہیں کوئی نہیں سنتا
جو ہونٹوں تک نہیں آتیں
جو کانوں تک نہیں جاتیں
زبان کا مس چھولے تو
اندیشے لپکتے ہیں
ہماری ان کہی باتیں
کرن خان: کی ڈائری سے ایک نظم
''مان ٹوٹنے کا دکھ''
محبت ووفا کی راہ پہ چلتے ہوئے
بہت دکھ سہے ہیں میں نے
اس راہ پہ چلتے چلتے
میرا دل کرچی کرچی ہوا
اور روح
ریزہ ریزہ لیکن
نہ تو مجھے یہ دکھ ہے کہ
دل کرچی کرچی ہوا

اور نہ یہ رنج
کہ روح ریزہ ریزہ
بلکہ دکھ تو ان رشتوں کا ہے
جو ٹوٹے اور جن پر مجھے
مان تھا بہت

عالی ناز: کی ڈائری سے شہیدوں کے لئے نظم
''میں کیسے پرسہ دوں؟''
میرے کانوں میں چیخیں ہیں
میرے معصوم بچوں کی
میری آنکھوں کے تاروں کی
کہ جن کے کھیلنے کے دن تھے
لیکن ان ظالموں نے ان سے کیسا کھیل کھیلا تھا؟
میرے بچوں سے اس دن ''موت'' کھیلی تھی
میری آنکھوں میں منظر ہیں
بہت سفاک منظر ہیں
کہیں بکھری کتابیں ہیں
کہ جن پر موت لکھی ہے
کہیں بستہ ہے کاپی ہے
کہ جن پر خون کے دھبے رلائیں خون کے آنسو
کسی منظر میں مائیں بین کرتی ہیں
کہیں پھولوں کی لاشوں پر بہت سے پھول رکھے
ہیں
مجھے ماؤں کی چیخیں رات بھر سونے نہیں دیتیں
کہ میں ان سرد راتوں میں یہ گھنٹوں سوچتی ہوں
بس
میں پرسہ دے سکوں گی کیا؟
انہیں اب اپنی نظموں سے؟
میں کیسے ان کے دکھ کو اپنی نظم میں ڈھالوں؟
خدا سے پوچھنا چاہوں کہ یارب
تیری دھرتی پر اگر یہ ظلم ٹوٹا ہے
زمین کیونکر سلامت ہے قیامت کیوں نہیں آئی؟
میں شکوہ کر نہیں سکتی
جواب آئے گا شکوے کا
تمہارا فرض بھی کچھ تھا
اگر تم اک قوم بن جاتے
تو یہ دن بھی نہیں آتا
مجھے شکوہ نہیں کرنا
مجھے پرسہ تو دینا ہے
مجھے ان سب دکھوں کو اپنی نظموں میں بھی لکھنا ہے
میرے آنسو بھی حاضر ہیں
میری یہ نظم نذرانہ
مگر میں کیسے پرسہ دوں؟
کہ یارب...... میں بھی تو ماں ہوں
سو ماں کا دکھ سمجھتی ہوں
مجھے معلوم ہے ایسے دکھوں کا تیری دنیا میں
مداوا ہو نہیں سکتا
کبھی بھی دل گرفتہ ماں کو پرسہ ہو نہیں سکتا
تڑپتی ماںمتا کو اب دلاسہ دیا نہیں جا سکتا
بلکتی ممتا کو اب دلاسہ دیا نہیں جا سکتا

ارم آنچل: کی ڈائری سے ایک نظم
''آسمان کا فیصلہ''
ہاتھوں پہ
کتابوں پہ
درختوں پہ
کسی کا نام لکھنے سے
کوئی اپنا نہیں ہوتا
نام سے نام جوڑنا
اتنا آساں نہیں ہوتا
آسمان کا فیصلہ ہے یہ
زمیں پہ نہیں ہوتا

سارا حیدر: کی ڈائری سے ایک خوبصورت نظم
دل چاہتا ہے میں بنجارن بن جاؤں
ہر شہر، ہر گاؤں اپنا میں ڈیرہ لگاؤں
سدا یہ لگاؤں میں ہر گلی گلی
تیرے پیار کی جوگن بن جاؤں
ناچوں میں اپنے دل کی تال پہ
باندھوں گھنگرو اور مر جاؤں
ہر جگہ تجھے ڈھونڈ ڈھونڈ ہاروں

ہر سمت محبت کے اپنے قلعے بناؤں

محبت میں مر تو سبھی ہی جاتے ہیں
میں کوئی دوسرا ایسا کام کر جاؤں
لوگ روتے ہیں محبت کے مزاروں کو
میں گمنام سی اپنی قبر بناؤں
جہاں پیپل کا پرانا درخت ہو
نام جس پہ اپنا اور تیرا لکھواؤں
اور کوئی خواہش نہ کروں یا قیامت
بس اک تیرے نام سے پہچانی جاؤں

فرحانہ خان: کی ڈائری سے ایک غزل

راہ عمل میں اختیار تو سفر کرو
پھر گلہ بجا ہے کہ اب تو سحر کرو
بہتر ہے ایسے دوستوں کی دوستی سے کہ
اپنے بھی تم حصار میں جیون بسر کرو
عزیز بھی رکھتے ہیں وہ کیسے ہیں ستم گر
کر کے ستم کہتے ہیں جاناں صبر کرو
سنا ہے کہ وہ مہرباں ہر دل عزیز رہیں
ویراں ہے کب سے دل مرا اس کو تو گھر کرو
دیکھیں ذرا ناراضگی میں لگتے ہیں کیسے آپ
کیوں منہ گھمائے بیٹھے ہو چہرہ ادھر کرو
محفل یاراں میں وہ مگن ہیں کس قدر
تنہائی کی میری ذرا ان کو خبر کرو
کہتے ہو بھولنے کا جو سنتو میری یہ شرط
ہم تم کو بھول جائیں تم کبھی مگر کرو
رقیب نہ بن جائے راز دان ہے جو
ثال کے سخن میں کہ ان کا ذکر کرو

سباس گل: کی ڈائری سے ایک غزل

پھول سے خوشبو کو جدا کون کرے
اس قدر ستم ظریفی بتا کون کرے
پل میں بجھ جائے گا یہ زندگی کا دیا
سرکشی میں ہواؤں کی بچا کون کرے
ملنا ہو گا تو مل ہی جائے گا
گلی گلی اب اس کا پتہ کون کرے
سر پہ جو افتاد پڑی اپنے بھی ہوئے بیگانے
ایسے حالات میں اپنا ہوا کون کرے
دل میں سو چھید ہوں اپنوں کے دیئے جب
بات ہنسنے کی بنتی ہو پھر بھی ہنسا کون کرے
زندگی ہر ایک کو ہے فقط اپنی ہی پیاری
یوں کسی کی خاطر بتاؤ مرا کون کرے
یہ تو گل نے ہی سر آنکھوں پہ بٹھا رکھا ہے اسے
ورنہ اس کی کہانیاں قصے سنا کون کرے

رمشا احمد: کی ڈائری سے ایک نظم

"ضروری بات"

ذرا ٹھہرو
کہ تم سے اک ضروری بات کرنی ہے
ادھر آؤ
کہ رستے میں کھڑے ہونا ہمیں اچھا نہیں لگتا
یہاں بیٹھو
کہ باتیں تو ہمیشہ ہم تسلی ہی سے کرتے ہیں
ہمیں اس طرح مت دیکھو
نہیں تو ہم تمہارے سامنے کچھ کہہ نہ پائیں گے
تو ہاں بس بات اتنی ہے
چلو چھوڑو
کبھی موقع ملا تو پھر بتائیں گے

نازیہ عمر: کی ڈائری سے ایک نظم

یونہی زندگی گزار دی
ہم نے وصل کی چاہ میں
فراق کے زنداں میں
رنجگوں کے عذاب جھیلے
صحرائے آبلہ پاہ میں
تمہاری یاد کے عوض
اپنی ہر سانس وار دی
ہم نے وصل کی چاہ میں
یونہی زندگی گزار دی
سدا لاحق رہی بے کلی
سدا پریشاں رہے
کچھ بھی حاصل نہ ہوا

☆☆☆

زارا علی ---- منڈی بہاؤالدین

س: سوال گندم، جواب چنا کیا بات ہے آپ کی؟

ج: اگر آپ کو جواب سمجھ نہیں آتا تو اس میں جواب کا نہیں آپ کی عقل کا قصور ہے، سمجھ آیا۔

س: لیجئے برا مان گئے...... کرلو گل؟

ج: کرلو گل نہیں سمجھو گی۔

سبیلہ خان ---- جھنگ

س: یوں بھی ہوا ہے جرم ناحق کیے بغیر لٹکے ہیں سولیوں پہ کچھ؟

ج: ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات۔

س: ان کی یادوں کے دیئے جلتے کیوں نہیں جب دیکھوں بجھتے ہی رہتے ہیں آخر ایسا کیوں ہے عیار جی؟

ج: دیئے دل سے جلاؤ پھر دیکھو جلتے ہیں کہ نہیں۔

س: تیری حیثیت بڑھا دوں گا اڑا کر ان کی قبر؟

ج: یہ کس کی قبر کی سامت آئی ہے؟ لگتا ہے کہ جھنگ کے قبرستان تم خراب کرتی ہو۔

س: عیار جی پھر چپت لگی نہ آپ کے خلاص میں کہا بھی تھا مت جایئے اپنی ان کی طرف چھ بھائی ہے ان کے؟

ج: اس کو چھوڑو یہ بتاؤ تمہارے کتنے ہیں؟

س: تم کو تصور میں لانے کی غلطی کبھی نہیں کرتی، کمزور دل جو رکھتی ہو۔

ج: میں طاقتور دل رکھنے کے باوجود تمہارے تصور میں نہیں آنا چاہتا کہ برداشت نہ کر پاؤں گا۔

س: عیار جی لگتا ہے ناراض ہو گئے آپ؟

ج: آپ کو کیسے لگا۔

س: چلو اچھا ہے ناراض نہیں ہو مجھے لگا پھر منانا پڑے گا گنجے کو؟

ج: یہ گنجا کون ہے؟ وہ تو نہیں جس کے یاد کے دیئے جلانے کی کوشش کر رہی ہو۔

رمشا احمد ---- لاہور

س: کھو دیتے ہیں، ہم اپنا ضبط کچھ اس طرح سے
خاموش تیری محفل سے چلے جاتے ہیں

ج: زمانہ خود بتا دے گا میں کچھ نہیں کہتا
کبھی پردے اٹھاؤ گے میں کچھ نہیں کہتا

س: اداسیاں جب پھیل جائیں سینے میں درد کی صورت
تو محبت کے سلسلے وہاں مشکل سے ہی ملتے ہیں
چاند کے تمنائی اب بھی ہیں بے شک موجود
اس لئے پروانوں کے شیدائی کم ہی ملتے ہیں

ج: محبت نے رگوں میں کس طرح کی روشنی بھر دی
کہ جل اٹھتا ہے امجد دل چراغ شام سے پہلے

س: جتنا میں فاصلوں سے بھاگتی تھی
دوریاں اتنی ہی مرے مقدر میں لکھی گئیں

ج: اس سے کیا ہے قدر دانی کا گلہ
ہم نے قدر اپنی کہاں جانی بہت

مہناز فاطمہ ---- خوشاب

س: عینی جی بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ غلط فہمی پیدا نہیں کی جاتی بلکہ ہو جاتی ہے اب آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: ہو کیوں جاتی ہے اس بات پر بھی تو غور کرو۔
س: جب کسی کی یاد ستائے تو کیا کرنا چاہیے؟ تجربے کی روشنی میں ثابت کریں؟
ج: اس سے ملنا چاہیے۔
س: اگر کوئی آپ کو سبز باغ دکھانا چاہے تو کیا آپ دیکھنا پسند کریں گے؟
ج: آپ دکھائیں گے تو۔
س: اکثر میاں روٹیاں جل جاتی ہیں، کیوں؟
ج: کوئی کام ڈھنگ سے کر لیا کرو۔
س: ہمارے حافظ آباد کا گندا نالہ بہت مشہور ہے تو پھر کب آ رہے ہیں سیر کرنے کے لئے؟
ج: اب پتہ چلا کہ تمہیں سبز باغ کیوں پسند ہیں اب کوئی تمہیں سبز باغ کھا کر گندے نالے کی سیر کرائے تو یہی حال ہوگا۔
س: سنا ہے مسجد میں سے جوتیاں چرانے میں آپ ماہر تصور کیے جاتے ہیں؟
ج: کیا تم نے مقابلہ کرنا ہے۔

شازیہ ثمن ---- جھنگ

س: وہ خوابوں میں آ کر ڈراتی ہے کیا تعبیر ہوگی؟
ج: یہ وارننگ ہے۔
س: میٹھے خربوزے کی کیا نشانی ہے؟
ج: کھانے میں میٹھا ہوگا۔
س: ارمیلا جب پاکستان آئی تو سنا ہے تم نے آٹو گراف کے لئے اس کے پاؤں پکڑ لئے تھے؟
ج: اس لئے کہ دونوں ہاتھوں سے تو وہ تمہیں پیٹ رہی تھی۔
س: رحیم یار خان میں لگے زخموں کے کیا حال ہیں؟
ج: میرے تو معمولی تھے ٹھیک ہو گئے تم ہسپتال سے کب آئے۔
س: کبھی شہد کی مکھیوں کے چھتے پر ہاتھ مارا ہے؟

ج: نہیں تمہارا حال دیکھ کر ہمت نہیں ہوئی۔
س: کبوتر بلی دیکھ کر اور تم کسے دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتے ہو؟
ج: اگر میں بھی آنکھیں بند کر لیتا تو تمہیں رحیم یار خان میں بلی سے کیسے چھڑاتا۔

صدف عمران ---- حیدر آباد

س: سچ سچ بتا دوں؟
ج: میں نے کب کہا ہے جھوٹ بولو۔
س: میں آج تک آپ کو سمجھ نہیں پائی؟
ج: آپ کو مجھے سمجھنے کی ضرورت کیوں پڑی۔
س: کوئی دردا نو کھا دے گیا؟
ج: کسی معالج سے رجوع کرو۔

نعمانہ لطیف ---- حیدر آباد

س: میں سوچتی ہوں...... بھلا کیا؟
ج: سوچنا بند کرو سمجھ جاؤ گی۔
س: عین غین جی آپ آدمی تو سمجھدار ہیں کہیں کبھی کبھی پھسل جاتے ہیں؟
ج: کہاں پھسل جاتے ہیں۔
س: چلتی کا نام گاڑی اور کھڑی کا نام؟
ج: وہ بھی گاڑی ہی ہوتی ہے ذرا نمائشی۔
س: بوجھو تو کون ہوں؟
ج: نعمانہ...... بوجھ لیا نا۔

شاہینہ یوسف ---- عمر کوٹ

س: عین غین جی چلو معاف کیا تم بھی کیا کہو گے کس رئیس سے پالا پڑا تھا؟
ج: میں نے تمہاری مج (بھینس) چوری کر لی تھی۔
س: تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبڑ تو؟
ج: یہ جواب دے کر اپنی ہی نبڑ رہا ہوں۔
س: میرے دل میں کچھ کچھ ہوتا ہے؟

☆☆☆

رنگ حنا

بلقیس بھٹی

مزاحیہ غزل

تمہارے شہر کا کتا بڑا دیوانہ ہے
میں ایک اینٹ اٹھا لوں اگر برا نہ لگے
اس کے بس میں اگر ہو تو کاٹ ڈالے ہمیں
کہ آس پاس کے لوگوں کو بھی پتا نہ لگے
تمہارے شہر میں آنا عذاب ہے جاناں
کہیں یہ دھکا کہیں فکر کہیں یہ تھانہ لگے
وہ اور بات کہ آئے تھے ذوق و شوق سے ہم
یہاں سے لوٹ کر جانا ہی اب سہانہ لگے
لئے ہی جاتے ہو حساب دوستاں اب تک
ہمارے ضبط کا تم کو بڑا پیمانہ لگے
بس ایک بار نکل جائیں اس شہر سے یوں ہم
کہ تمہیں تو کیا تمہارے فرشتوں کو بھی پتا نہ لگے
پکارا تم نے تو سر کے بل چلے آئے
سوائے اپنے ہمیں ہر کوئی سیانہ لگے
یہ روز روز کی کل کل عذاب ہے اے گل
یوں تیر کمان سے پھینکو کہ صحیح نشانہ لگے

زارا علی، منڈی بہاؤ الدین

شادی

ایک سردار جی کسی سیاسی میٹنگ میں گئے جہاں چند نمائندہ خواتین بھی موجود تھیں، سردار جی نے اپنے ایک دوست سے احتیاطاً پہلے پوچھ لیا تھا کہ عورتوں سے کیسی باتیں کرنی چاہئیں، دوست نے بتایا تھا کہ یہی کہ آپ کے کتنے بچے ہیں؟ شادی ہو چکی ہے وغیرہ، اتفاق سے ایک خاتون سردار جی کے پاس بیٹھی، سردار جی نے ان سے پوچھا۔

''آپ کے کتنے بچے ہیں؟'' خاتون نے جواب دیا۔

''تین۔''

سردار جی نے پوچھا۔

''کیا آپ کی شادی ہو چکی ہے؟''

رمشا احمد، لاہور

قطعہ

یادوں کے جھروکوں سے جب جھانکتی ہیں یادیں
کچھ پل کو ہم اب ٹھٹک سے ہی جاتے ہیں
سنا ہے پیچھے مڑ کر دیکھیں تو پتھر سے ہو جاتے ہیں
زخم پرانے جانے کے بعد ہی یاد آتے ہیں

افشاں احمد، ٹوبہ ٹیک سنگھ

تنقید

آرٹسٹ نے اپنے دوست سے شکوہ کیا۔

''تم نے اخبار میں مصوری کے نقاد وارثی صاحب کا تبصرہ پڑھا؟ انہوں نے میری تمام پینٹنگز پر سخت تنقید کی ہے اور ان کی مٹی پلید کر کے رکھ دی ہے۔''

''تم ان کی تنقید کی بالکل پرواہ مت کرو۔'' دوست نے غمزدہ آرٹسٹ کو تسلی دی۔

''ان کی تو اپنی کوئی رائے ہے ہی نہیں جو ساری دنیا کہہ رہی ہوتی ہے وہی وہ اپنے کالم میں لکھ دیتے ہیں۔''

مکنون شاہ، لاہور

بیگم

ایک صاحب ہوٹل میں داخل ہوئے تو سامنے ہی ایک حسین و جمیل لڑکی بیٹھی دکھائی دی، وہ انہیں دیکھ کر مسکرائی، موصوف نے اس حسین

اتفاق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لڑکی کو اپنی میز پر آنے کی دعوت دی، جسے اس نے منظور کرلیا پھر باتوں باتوں میں وہ ان کے ساتھ رہنے پر بھی آمادہ ہوگئی، ان صاحب نے ہوٹل کے رجسٹر میں اسے اپنی مسز لکھوایا، دوسرے دن جب وہ جانے لگے تو ہوٹل کا بل دیکھ کر چکرا گئے جو بہت زیادہ تھا وہ گرجتے ہوئے بولے۔

''میں تو صرف چوبیں گھنٹے یہاں ٹھہرا ہوں، اتنا زیادہ بل کیسے بن گیا؟''

منیجر نے جواب دیا۔

''آپ کی مسز گزشتہ دو ماہ سے یہاں ٹھہری ہوئی تھیں۔''

علینہ طارق، لاہور

ہمیں تو......

ایک پاپ سنگر کو ایک صاحب نے اپنے گھر گانا سنانے کے لئے بلایا۔

گلوکار نے بڑے اسٹائل سے پوچھا۔

''سب سے پہلے کون سا گانا سناؤں؟''

''کوئی سا بھی گانا سنا دو، ہمیں تو پڑوسیوں سے مکان خالی کروانا ہے۔'' انہوں نے جواب دیا۔

نازیہ عمر، پشاور

مستقل مزاج

کلرک ایک خاتون سے۔

''محترمہ آپ پچھلے پانچ سال سے ہماری نمائش کا ٹکٹ لیتے وقت اپنی عمر اٹھارہ سال لکھواتی ہیں، کیا وجہ ہے؟''

خاتون۔

''اس لئے کہ میں بات کی پکی ہوں۔''

نائمہ احسن، سرگودھا

تاج محل

''شاہجہان نے تاج محل کی ہر گھڑی کو دیکھا، ہر دروازے ہر جھروکے ہر دیوار ہر دالان کو دیکھا ایک بار نہیں بار بار دیکھا لاتعداد بار دیکھا اور آخر میں لمبی سی ٹھنڈی آہ بھر کر بولا۔

''کیا بولا......؟''

''ماں قسم بہت خرچا ہوگیا۔''

لائبہ رضوان، فیصل آباد

عادت

ایک لیڈر کو تقریر کرنے سے پہلے مائیک درست کرنے کی عادت تھی، وہ جہاں بھی تقریر کرنے جاتے مائیک کو ضرور ہاتھ لگا کر درست کرتے، ایک بار الیکشن کے دوران ان کے مخالف نے جہاں ان کو تقریر کرنا تھی، اس مائیک میں کرنٹ چھوڑ دیا، تقریر کرنے کے لئے لیڈر صاحب اسٹیج پر آئے اور حسب عادت جوش میں آ کر مائیک کو درست کرنے کے لئے ہاتھ لگایا تو حاضرین نے سنا انہوں نے کہا۔

''میرے پیارے بھائیو، میری بہنوں؟ ہائے میں مر گیا۔''

مہناز فاطمہ، خوشاب

کلنک کا ٹیکہ

ہمارے ہاں اچھے بھلے بڑی کلاسوں کے طلبہ بھی محاورے کی وہ ٹانگ توڑتے ہیں کہ رہے نام اللہ کا، ایف اے کے ایک پرچے میں ایک طالبہ نے ''کلنک کا ٹیکہ لگنا'' کو بھی انجکشن کی کوئی قسم سمجھا تھا اور اسے کچھ یوں جملے میں استعمال کیا۔

''ہمارے محلے میں سب نے کلنک کے ٹیکے لگوائے میں گھر پر نہ تھی اس لئے نہ لگوا سکی۔''

(امجد اسلام امجد کے سفرنامے ''ریشم ریشم'' سے اقتباس)

شازیہ ثمن، جھنگ

کاروبار

ایک فقیر نے ایک راہ گیر کے آگے ہاتھ پھیلایا تو اس آدمی نے کہا۔
''معاف کرو۔''
فقیر نے حسب عادت پھر سے سوال کیا تو آدمی نے کہا۔
''میرے پاس ریزگاری نہیں ہے واپسی پر لے لینا۔''
فقیر نے برا سا منہ بنایا اور کہا۔
''ادھار کے اس کاروبار میں میرے لاکھوں ڈوب گئے ہیں۔''

نعیمہ رانا، ملتان

بہت خوب

پارٹی میں ایک خاتون دوسری خاتون کو بتا رہی تھی۔
''میرے باس نے مجھے ہیرے کی انگوٹھی تحفے میں دی ہے بغیر لالچ کے۔''
''بہت خوب۔'' دوسری خاتون نے کہا۔
''میرے باس نے مجھے ڈیفنس میں بنگلہ بھی لے کر دیا ہے اور وہ بھی بغیر کسی غرض اور لالچ کے۔'' پہلی خاتون نے مزید بتایا۔
''بہت خوب...... بہت خوب!'' دوسری خاتون نے کہا۔
''انہوں نے مجھے ایک ہنڈا اکارڈ اور ڈرائیور بھی دیا ہے اور وہ بھی بغیر کسی غرض اور لالچ کے۔''
''بہت خوب بھئی بہت خوب۔'' دوسری خاتون نے سر ہلا دیا۔
تب پہلی خاتون نے پوچھا۔
''اور تم سناؤ آج کل کیا کر رہی ہو؟''
''میں آج کل تمیز اور شائستگی سکھانے والی کلاس اٹینڈ کر رہی ہوں، وہاں سب سے پہلے یہ سکھایا جاتا ہے کہ جب آپ کسی سے کہنا چاہیں کہ کیوں بے پر کی چھوڑ رہی ہو، تو اس کی جگہ ''بہت خوب، بہت خوب'' کہنا چاہیے۔'' دوسری خاتون نے کہا۔

رضوانہ علی، ساہیوال

جواب

''آپ کا بچہ حساب میں کمزور ہے میں نے کل اس سے پوچھا کہ تین انڈے حسن کو چار انڈے اکرم کو اور پانچ انڈے تمہیں دوں تو بتاؤ میں نے کل کتنے انڈے دیئے؟''
آپ کے بچے نے جواب دینے کے بجائے شرماتے ہوئے کہا۔
''نہیں سر آپ انڈے نہیں دے سکتے۔''

ثوبیہ احمد، قصور

فیصلہ

شیر خوار اور گھٹنوں کے بل چلنے والے بچے نے پہلے لیمپ توڑا، پھر ایش ٹرے ٹی ٹرالی کے شیشے پر دے ماری، نوجوان ماں نے اسے گود میں اٹھاتے ہوئے غصے سے کہا۔
''بس...... ہو گیا فیصلہ تم اس گھر کے پہلے اور آخری بچے رہو گے۔''

زاہدہ افضل، کراچی

ماموں

ناکام محبت کا ہر اک دکھ سہنا
ہر حال میں انجام سے ڈرتے رہنا
قدرت کا بڑا انتقام ہے جیدی
محبوبہ کی اولاد کا ماموں کہنا

عفرا ثاقب، جہلم

☆☆☆

بیاض

تسنیم طاہر

سہیلہ خان ---- جھنگ

جو وقت گزرے تو سینے پہ بوجھ بن جائے
کچھ اس کا حال بھی اس قرض بے طلب کا تھا
خود اس کے گھر کی ہی دیوار گر پڑی اس پر
یہ فن آج ہوا ہے مرا تو کب کا تھا

....

کھلائے رکھنا امید گلشن یونہی ہمیشہ
اداس چہرے پہ زندگی کا جمال رکھنا
مٹا نہ دینا ہجوم غم میں نشان منزل
جنوں سفر میں نمو کی خواہش بحال رکھنا

....

نوک شمشیر پہ یوں ہم نے گزارے لمحے
کانچ کی آنکھ سے خوابوں کا گزر ہو جیسے

عابی ناز ---- گوجرانوالہ

دھیما دھیما خوش ادا خاموش سا اچھا لگا
پہلی ہی نظر میں وہ شخص جانے کیوں اچھا لگا
حلقہ احباب میں سب سے الگ سب سے جدا
گہری گہری سوچ میں کھویا ہوا اچھا لگا

....

اس سے کب ہم نے ملاقات کا وعدہ چاہا
دور رہ کر تو اسے اور زیادہ چاہا
یاد آیا ہے وہ کچھ اور بھی شدت سے ہمیں
بھول جانے کا اسے جب بھی ارادہ چاہا

....

کبھی تو کرے گا وہ شخص وفا آخر
کبھی تو ختم ہو گی اپنی یہ سزا آخر
میرے گھر کی دیوار پہ یہ کون لکھ گیا؟
کب تک جیو گی تم میرے سوا آخر؟

....

جنہیں عزیز انا تھی جو شہر چھوڑ گئے
وہ لوٹ آئیں مگر کس طرح کوئی صورت
چھپائے پھرتے ہیں کتنی کہانیاں ہم بھی
تجھے سنائیں مگر کس طرح کوئی صورت

رمشا احمد ---- لاہور

میری آنکھوں کے خواب بن کر تم
کھو جانا سراب بن کر تم
میری سانسوں میں تیری خوشبو ہو
مجھ میں رہنا گلاب بن کر تم

....

میں بھی دیکھوں گا تمہاری زندگی کا ہر ورق
تم بھی میرے روز و شب کا ہر شمارہ دیکھنا

....

جب تک نہ اس کو چاہا گم نام ہی رہا
اک شخص میرے نام سے مقبول ہو گیا

عالیہ بٹ ---- چنیوٹ

میری محبتیں میرے سلام تیرے نام
میری نگاہوں کے سب احترام تیرے نام
دیکھوں تجھے تو میری رات کا سویرا ہو
میری حیات کی ہر صبح و شام تیرے نام

....

کبھی جو شوخ آنچل سے تمنا جگمگائی ہے
تصور میں تجھے پا کر یہ دنیا بھول جاتی ہے
محبت کے سنہرے خواب دیکھے جب کوئی راہی
یہ چھٹکی چاندنی اکثر ترے سنائی ہے

....

میں چند دن روؤں گی رو کر چپ کر جاؤں گی
تیری بے وفائی کے درد کو بھول جاؤں گی
دستور زمانہ کارساز قدرت ہی ہے

چند دن یاد رکھوں گی پھر بھول جاؤں گی
حنا ناز ---- چند دادنخان

تو مرے قریب رہا تیرا نشاں نہ ملا
دور سے سارے نشاں تیرے ملے

....

کہتے ہیں جب کوئی پیار کرے تو نیند اڑ جاتی ہے
کوئی ہم سے پیار کرے ہمیں نیند بہت آتی ہے

....

میں جب دیکھوں جدھر دیکھوں تجھے دیکھوں
تو میری آنکھ کی پتلی پہ یوں تحریر ہو جائے
عاتکہ نظام الدین ---- لیہ

جہاں بھی جانا آنکھوں میں خواب بھر لانا
یہ کیا کہ دل کو ہمیشہ اداس کر لانا
میں صرف برف رتوں میں چلا تو اس نے کہا
پلٹ کر آنا تو کشتی میں دھوپ بھر لانا

....

ہم نے غم سہے ہیں اوروں سے اس قدر
کہ اب زندگی خود سہارا تلاش کرتی ہے
خود ہی چھوڑ دیا دوستوں کو ہم نے
لیکن نہ جانے کیوں نظر پھر ملنے کی آس کرتی ہے

....

کتنی عام سی بات ہے لیکن اتنی عام سی بات نہیں
سب کو خوشیاں مل جاتی ہیں میرا حصہ کھو جاتا ہے
روما تنویر ---- شیخوپورہ

اک ستارہ ٹوٹ کے بکھرا خلاؤں میں کہیں
اک مسافر کھو گیا ہے راستوں کے درمیاں
یا تو ہیں میرے تعاقب میں میرے ہی وسوسے
یا فقط پاگل ہوا ہے راستوں کے درمیاں

....

زرد پتے شاخ سے گرتے ہیں جب روتے ہوئے
سوچتا ہوں کتنی آرزوؤں کا مدفن ہے ہوا
کھل گئے ہیں جھونکے سے کئی چہروں کے پھول
آج کی شب چاند نکلا ہے روشن ہے ہوا

....

ہر طرف آپ کی یادوں کے لگا کر پہرے
جی کڑا کر کے میں بیٹھا تھا کہ مت یاد آئے
ناگہاں کسی بات پہ دل ایسا دکھا
میں بہت رویا مجھے آپ یاد آئے
ام حاجرہ ---- لاہور

کتنا کم ظرف ہے وہ شخص
اپنے فن پر جسے غرور ہوتا ہے
کوئی کتنا ہی فن میں ماہر ہو
وہ ناقص ضرور ہوتا ہے

....

جب کبھی خود کو سمجھاؤں کہ تو میرا نہیں
دل میں کوئی چیخ اٹھتا ہے نہیں ایسا نہیں
کب نکلتا ہے کوئی دل میں اتر جانے کے بعد
اس گلی کی دوسری جانب کوئی رستہ نہیں

....

اگر ہم فیصلہ کر لیں کہیں سے کوچ کرنے کا
تو پھر واپس مہاروں کو کبھی موڑا نہیں کرتے
ہمیں معلوم ہے ہر جیت بالآخر ہماری ہے
سو ہم وقتی شکستوں پر دل چھوٹا نہیں کرتے
علینہ طارق ---- لاہور

بجا کر آنکھ میں نیندوں کے سلسلے بھی نہیں
شکست خواب کے اب مجھ میں حوصلے بھی نہیں
خفا اگرچہ ہمیشہ ہوئے مگر اب کے
وہ برہمی ہے کہ ہم سے انہیں گلے بھی نہیں

....

ہر ایک بچھڑ کے خوش تھا چلو جان بچ گئی
یہ اپنے عہد اپنی وفا کا زوال تھا

....

آنکھوں میں آ کے بیٹھ گئی آنسوؤں کی لہر
پلکوں پہ کوئی خواب پرونے نہیں دیا
دل کو تمہارے نام کے آنسو عزیز تھے
دنیا کا کوئی درد سمونے نہیں دیا
نازیہ عمر ---- پشاور

وہ قیامتیں جو گزر گئیں

تھیں امانتیں کئی سال کی
ہے منیر تیری نگاہ میں
کوئی بات گہرے ملال کی

....

زندگی میں ساتھ دینا تو نہیں کرتے پسند
دم نکل جائے تو کندھے پر اٹھا لیتے ہیں لوگ

....

چپ چپ گم صم رہنے والے
اپنے آپ سے جنگ کرتے ہیں
سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا
پچھتاوے پھر تنگ کرتے ہیں
فرح احسن ---- سرگودھا
دنیا تو کیا خود سے بھی کرتے رہے گریز
جب تک ملے کسی سے کسی سے نہیں ملے
جو بے طلب تھا اس کی ہمیں جستجو رہی
جو ملنا چاہتا تھا اسی سے نہیں ملے

....

خالی ہیں دل فقیر کے کشکول کی طرح
اس شہر بے وفا سے وفا کون لے گیا

....

جیسے غموں کے ہم ہو گئے عادی سے
مگر تجھ سے بھی ہو تو خود سے لڑنے لگتے ہیں
ساتھ ساتھ چلنا ہے بسنا اور اجڑنا بھی
بسنے ہم نہیں پاتے اور اجڑنے لگتے ہیں
فرحت نعیم ---- لاہور
بھول جانے کا تو بس ایک بہانہ ہو گا
کہ بہر طور اسے یاد تو آنا ہو گا
بند مٹھی سے جو اڑ جاتی ہے قسمت کی پری
اس ہتھیلی میں کوئی چھید پرانا ہو گا

....

نیند میری چھین کر ادائے دلبری سے
وعدہ وہ کر رہے ہیں آنے کا خواب میں

....

پاؤں پھیلائے تو پھر دیکھی نہیں چادر ہم نے
تجھ کو چاہا تو پھر اوقات سے بڑھ کر چاہا
زیست آسان ہو بھی سکتی تھی لیکن ہم نے
تیری چاہت کو ہر اک بات سے بڑھ کر چاہا
لائبہ رضوان ---- فیصل آباد
اس کو الفاظ کا ادراک بھی ہو سکتا ہے
اس لیئے جناب وہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے
تم جسے غم کے سمندر میں ڈبوتے ہو چلے
وہ اچھا سا تیرا اک بھی ہو سکتا ہے

....

کہنے کو اس سے عشق کی تفسیر ہے بہت
پڑھ لے تو صرف آٹھ کی تحریر ہے بہت
بیٹھا رہا وہ پاس تو میں سوچتی رہی
خاموشیوں کی اپنی بھی تاثیر ہے بہت

....

تمام رشتوں کو میں گھر پر چھوڑ آیا تھا
پھر اس کے بعد کوئی اجنبی نہ ملا
بہت عجیب ہے یہ قربتوں کی دوری بھی
وہ میرے ساتھ رہا پھر بھی کہیں نہ ملا
مہناز فاطمہ ---- خوشاب
تیری یاد میں مصرع کوئی لکھنے بیٹھا
میں نے کاغذ پر بھی چھالوں کا گلستاں دیکھا
تو نے دیکھا ہے منڈیروں پر چراغوں کو فقط
میں نے جلتا ہوا ہر دور میں انساں دیکھا

....

ہم کو معلوم ہے کیا دست حنائی دے گا
کرب بوئیں گے تو وہ فصل جدائی دے گا
آنکھ نیلم کی بدن کانچ کا دل پتھر کا
اپنے شہکار کو کون اتنی صفائی دے گا

....

کچھ اس طرح سے وفا کی مثال دیتا ہوں
سوال کرتا ہے کوئی تو ٹال دیتا ہوں
اسی سے کھاتا ہوں اکثر فریب منزل کا
میں جس کے پاؤں کا کانٹا نکال دیتا ہوں

☆☆☆

میرے سینے میں ابھی اک جذبہ بے نام ہے
ضبط کرتے کرتے حرف مدعا بن جائے گا
ہما کاشف ---- ملتان

مل گیا تھا سکون نگاہوں کو
کی تمنا تو اشک بھر آئے
گل ہی اکتا گئے ہیں گلشن سے
باغباں سے کہو نہ گھبرائے

....

اس جگہ عقل نے دھوکے کھائے
جس جگہ دل ترے فرمان گئے
کوئی دھڑکن ہے نہ آنسو نہ امنگ
وقت کے ساتھ یہ طوفان گئے
شہلا خان ---- سکھر

نہیں نہیں ہمیں اب تیری جستجو بھی نہیں
تجھے بھی بھول گئے ہم تری خوشی کے لئے
کہاں کے عشق و محبت کدھر کے ہجر و وصال
ابھی تو لوگ ترستے ہیں زندگی کے لئے

....

یہ دن رات یہ لمحے مجھے اچھے سے لگتے ہیں
تمہیں سوچوں تو سارے سلسلے اچھے سے لگتے ہیں
بہت دور تک چلنا مگر پھر بھی وہیں رہنا
مجھے تم سے تمہی تک فاصلے اچھے سے لگتے ہیں

....

دسمبر کی شب آخر نہ پوچھو کس طرح گزری
یہی لگتا تھا ہر دم وہ ہمیں کچھ پھول بھیجے گا
ام رومان ---- جہلم

تم آئے ہو تو آؤ وفا کی بات کریں
وفا کی بات میں ہر بے وفا سے کرتا ہوں

....

ہر شخص کبریا ہے تجھے دیکھنے کے بعد
دعوا مرا بجا ہے تجھے دیکھنے کے بعد
سجدہ کروں تجھے تو کافر کہیں گے لوگ
یہ کون سوچتا ہے تجھے دیکھنے کے بعد

....

حوادث سے الجھ کر مسکرانا میری فطرت ہے
مجھے بربادیوں پر اشک برسانا نہیں آتا
کسی کا پیار کسی کی دعا ضروری ہے
دیار حبس میں تازہ ہوا ضروری ہے
رافعہ اسلم ---- قصور

ہم نے لہو کے دیپ جلائے تو تھے ندیم
پر شہر آرزو میں چراغاں نہ ہو سکا

....

تیرے ہر رویے میں بدگمانیاں کیسی
جب تلک ہے دنیا میں اعتبار دنیا کر
جس نے زندگی دی ہے وہ بھی سوچتا ہو گا
زندگی کے بارے میں اس قدر نہ سوچا کر

....

وہ کر رہے تھے اپنی وفاؤں کا تذکرہ
دیکھا مجھے تو بات کا پہلو بدل گئے
ندا ---- لاڑکانہ

کہنے کو اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں
امجد مگر وہ شخص مجھے بھولتا نہیں

....

عمر بھر کی ہیں سانسیں یہ دوریاں یہ فاصلے
تم چاہو تو کچھ عجب نہیں یہ پل میں سر ہو جائیں

....

جب لوگ ہی جذبوں کی توقیر نہیں کرتے
ہم بھی کوئی دکھ اپنا تحریر نہیں کرتے
دو گز ہی زمین سب کا جب آخری مسکن ہے
ہم کوئی مکان اپنا تعمیر نہیں کرتے
ساجدہ خان ---- اسلام آباد

ہم سے فرعون کے لہجے میں بات نہ کر
ہم تو پاگل ہیں خداؤں سے الجھ جاتے ہیں

....

حنا کا دسترخوان

افراح طارق

بھنی ہوئی لوکی

اشیاء

لوکی	آدھا کلو
ٹماٹر	آدھا پاؤ
ہلدی	چائے کا آدھا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
سرخ مرچ	حسب ذائقہ
گرم مصالحہ	چائے کا ڈیڑھ چمچہ
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
کوکنگ آئل	آدھا کپ
پیاز	ایک عدد

ترکیب

لوکی چھیل کر اس کے قتلے کاٹ لیں، ایک دیگچی میں کوکنگ آئل ڈالیں، اب اس میں پیاز ڈال کر بادامی رنگ کا کرلیں، پھر اس میں باقی سب مسالے ڈال کر بھونیں، پانی کا چھینٹا دے کر بھونتے جائیں، مسالا اچھی طرح بھون جائے تو اس میں لوکی ڈال دیں، اوپر سے ٹماٹر کاٹ کر ڈال دیں اور دو چمچے پانی ڈال کر دم پر رکھ دیں، جب لوکی گل جائے تو اسے بھونیں اب اس میں پسا ہوا گرم مسالا اور ہرا دھنیا ڈال دیں اور اتار لیں۔

بیسن میں تلے ہوئے بینگن

اشیاء

بینگن لمبے	ایک پاؤ
بیسن	ایک پاؤ
نمک	حسب ذائقہ
سرخ مرچ	حسب ذائقہ
اجوائن	ایک تولہ
سوڈا	ایک چٹکی
کوکنگ آئل	تلنے کے لئے

ترکیب

بینگن بمع چھلکے لمبے اور پتلے پتلے کاٹ لیں اور ان میں نمک مل کر رکھ دیں، بیسن میں سوڈا، نمک، سرخ مرچ ڈال کر اچھی طرح گھول دیں، (بیسن اتنا پتلا ہونا چاہیے کہ بینگن پر اچھی طرح لگ جائے) اب بینگن دھولیں اور خشک ہونے کے بعد اجوائن ادھ پسا کر کے ہر ٹکڑے پر ذرا ذرا سا لگا دیں۔

فرائی پین میں کوکنگ آئل گرم کریں، اب بینگن بیسن میں ڈبو ڈبو کر تلتی جائیں گرم گرم کھانے کے لئے پیش کریں۔

آلو اور دھنیا

اشیاء

آلو	آدھا کلو
پیاز	آدھا پاؤ
ٹماٹر	آدھا پاؤ
ادرک	آدھی چھٹانک
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ	حسب ذائقہ
سبز مرچ	چھ عدد
ہرا دھنیا	چار بڑی گٹھی
کوکنگ آئل	ایک کپ

ترکیب

آلو چھیل کر کاٹ لیں چھوٹے ٹکڑے کر لیں، ٹماٹر دھو کر کاٹ لیں، پیاز لچھے دار کاٹ لیں اور دھنیا صاف کر کے دھو کر باریک باریک کاٹ لیں۔

ایک دیگچی میں کوکنگ آئل ڈالیں گرم ہونے پر پیاز ڈالیں، جب پیاز بادامی رنگ کے ہو جائے تو آلو ڈال کر بھونیں تھوڑا بھوننے کے بعد ادرک اور ٹماٹر ڈال دیں ساتھ ہی نمک اور سرخ مرچ ڈال دیں پانچ منٹ بھونیں، اب ہرا دھنیا ڈال دیں اور تھوڑا سا پانی ڈال کر پکنے دیں، جب دھنیا اور آلو گل جائیں تو ہری مرچ ڈال کر اتار لیں اور اس میں پانی کا شوربا نہیں رہنا چاہیے۔

کریلے اور پیاز

اشیاء

کریلے	آدھا کلو
پیاز	آدھا کلو
ٹماٹر	آدھا پاؤ
نمک	حسب ذائقہ
سرخ مرچ	حسب ذائقہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
کوکنگ آئل	ڈیڑھ کپ

ترکیب

کریلے اچھی طرح چھیل لیں اور بیج نکال کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیں، اب ان کو نمک لگا کر ایک گھنٹے تک رکھ دیں، ایک گھنٹے کے بعد ان کو خوب مل مل کر دھو لیں اور پانی اچھی طرح نچوڑ لیں۔

ایک دیگچی میں حسب ضرورت کوکنگ آئل گرم کریں اب اس میں آدھا پاؤ پیاز ڈال کر سرخ کریں اور نمک مرچ ہلدی ڈال کر مسالے کی طرح تیار کریں، اب ایک فرائی پین میں بقیہ کوکنگ آئل ڈال کر کریلے اس میں تل لیں، سرخ ہونے پر کوکنگ آئل کے ساتھ ہی تیار مسالے میں ڈال دیں اور اس میں باقی پیاز لچھے دار کاٹ کر ڈال دیں، ٹماٹر بھی ساتھ ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر دم پر لگا دیں، جب پیاز گل جائے تو اتار لیں خیال رہے کہ پیاز کا پانی خشک ہو جائے، اگر پانی رہ جائے گا تو ذائقہ ٹھیک نہیں ہو گا۔

پالک پنیر

اشیاء

کاٹیج چیز کیوبز بنالیں	ایک پیکٹ
مکھن	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
لہسن باریک کٹے ہوئے	چار عدد
پالک	آدھا کلو
دودھ	ایک پیالی
ہری مرچ	چار عدد
کالی مرچ کٹی ہوئی	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب

پالک کو اچھی طرح سے دھو کر اپنے ہی پانی میں ابال لیں، جب پانی خشک ہو جائے تو بلینڈر میں پیس لیں، ایک دیگچی میں آدھا مکھن ڈال کر گرم کریں پھر لہسن کے جوے ڈال کر گولڈن براؤن کر لیں، جب گولڈن براؤن ہو جائے تو پالک اور نمک ڈال کر ہلکا سا بھون کر دودھ ڈال دیں، پکنے دیں، جب خشک ہو جائے تو بھون لیں، فرائنگ پین میں مکھن ڈال کر گرم کریں پھر پنیر کے کیوبز مکھن میں فرائی کر کے پالک میں ڈال دیں اس کے بعد کالی مرچ ڈال کر پانچ منٹ کے لئے دم پر رکھ دیں۔

سبزیوں کی جالفریزی

اشیاء

آلو چپس کی طرح کاٹ لیں	دو عدد
گاجر کاٹ لیں گول	دو عدد
پیاز پرت الگ کر لیں	دو ڈلی
ادرک باریک کٹی ہوئی	ایک کھانے کا چمچہ
ہری مرچ کٹی ہوئی	تین عدد
ثابت لال مرچ	تین سے چار عدد
ٹماٹو ساس	ایک کھانے کا چمچہ
سفید زیرہ پسا ہوا	ایک چائے کا چمچہ
تیل	آدھی پیالی
بند گوبھی	ایک پھول
شملہ مرچ کیوبز بنالیں	تین عدد
مٹر چھیلے ہوئے	ایک پیالی
ہرا دھنیا کٹا ہوا	ایک گٹھی
کالی مرچ کٹی ہوئی	ایک چائے کا چمچہ
ٹماٹو پیسٹ	دو کھانے کے چمچ
سفید سرکہ	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب

سب سے پہلے ایک دیگچی میں لال مرچ اور تیل ڈال کر ہلکا سا گرم کر لیں دو منٹ بعد گاجر، مٹر، بند گوبھی اور پیاز ال کر اسٹر فرائی کر لیں پھر ادرک، نمک، ہری مرچ اور کالی مرچ ڈال دیں، آلو الگ فرائنگ پین میں چپس کی طرح ڈیپ فرائی کر لیں جب گولڈن براؤن ہو جائیں تو دیگچی میں سبزیوں کے اوپر پھیلا کر ڈال دیں اس کے اوپر سرکہ، ٹماٹو پیسٹ، ٹماٹو ساس اور زیرہ ڈال کر دس منٹ کے لئے ہلکی آنچ میں دم پر رکھ دیں، ہرا دھنیا ڈال کر گرم گرم چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔

پنیر کے کباب

اشیاء

کاٹیج چیز	ایک پیکٹ
ڈبل روٹی کا چورا	ایک پیکٹ
ہری مرچ کٹی ہوئی	چار عدد
بادام باریک چھل لیں	پندرہ عدد
ہری پیاز پتوں سمیت	دو عدد
چکن کیوب ملا ہو میدہ	ایک کھانے کا چمچہ
لہسن باریک کٹے ہوئے	چار عدد جوئے
ڈبل روٹی کے سلائس	چھ عدد
کالی مرچ کٹی ہوئی	ایک چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا کٹا ہوا	ایک گٹھی
نمک	حسب ذائقہ
انڈے	دو عدد
ادرک باریک کٹی ہوئی	آدھا کھانے کا چمچہ

ترکیب

سب سے پہلے چیز کدوکش کر لیں، سلائس کے چاروں کنارے کاٹ کر درمیانی حصہ باریک چورا کر کے چیز میں ملا دیں پھر سارے مصالحہ جات اچھی طرح ملا کر گوندھ لیں اور تھوڑی دیر کے لئے رکھ دیں، ڈبل روٹی کا چورا بھی ملا دیں پھر چھوٹے چھوٹے گول کباب بنا کر انڈے میں ڈبو کر ہلکی آنچ میں ڈیپ فرائی کر لیں جب گولڈن براؤن ہو جائیں تو نکال کر اخبار پر پھیلا دیں اور چٹکی بھر بیسن چھڑک دیں، گرم گرم ٹماٹو ساس کے ساتھ پیش کریں۔

پورن پوری

پوری کے لئے اشیاء

میدہ	ایک پیالی
تازہ دودھ	ایک پیالی
بادام باریک کاٹ لیں	بیس عدد
ناریل کا پاؤڈر	ایک پیالی
کشمش	ایک پیالی
سوجی	ایک پیالی
گھی، تیل	ایک پیالی

پستے باریک کاٹ لیں	بیس عدد
چینی	ایک پیالی
تلنے کے لئے تیل	حسب ضرورت

ترکیب

سب سے پہلے ایک بڑے پیالے میں دودھ اور سوجی بھگو کر رکھ دیں، جب سوجی دودھ میں اچھی طرح بھیگ جائے تو میدہ چھان کر سوجی میں ملا دیں گھی ملا کر آہستہ آہستہ سخت میدہ گوندھ لیں اور تھوڑی دیر کے لئے رکھ دیں، ایک دیگچی میں ایک کھانے کا چمچہ گھی ڈال کر پستے بادام تل کر نکال لیں، آدھے گھنٹے بعد تلے ہوئے بادام پستے میں ناریل پاؤڈر کشمش اور چینی ملا دیں، اب تیار کیا میدہ لے کر چھوٹے چھوٹے پیڑے بنا لیں ایک ایک پیڑا لے کر پوری کی طرح بیل لیں، درمیان میں میوہ رکھ کر ڈی کی شکل میں بند کر کے کناروں کو سجا دیں، ساری ایک ساتھ بنا کر رکھ لیں، ان کے اوپر ایک ململ کا کپڑا گیلا کر کے پھیلا دیں، ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں جب تیل گرم ہو جائے تو آنچ ہلکی کر کے پوریاں تلنا شروع کریں اسٹیل کا چمچہ چلاتے رہیں، جب گولڈن ہو جائیں تو نکال کر چھلنی میں اخبار بچھا کر رکھتے جائیں تا کہ چکنائی جذب ہو جائے۔

آلو کی سبزی

اشیاء

آلو چھلکا اتار کر بھرتہ بنا لیں	آدھا کلو
ہری مرچ باریک کٹی ہوئی	چھ عدد
چینی	ایک چائے کا چمچ
ہلدی	ایک چائے کا چمچ
رائی پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچ
کڑی پتا	چند پتے
لیموں	دو عدد
پیاز باریک کٹی ہوئی	دو ڈلی
کلونجی	آدھا چائے کا چمچ
لال مرچ پسی ہوئی	آدھا کھانے کا چمچ
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
ہرا دھنیا باریک کٹا ہوا	ایک گٹھی
املی کا رس	آدھی پیالی
تیل	آدھی پیالی

ترکیب

آلو کے بھرتے میں ایک گلاس پانی ملا کر دال کی طرح پتلا کر لیں پھر اوپر دی گئی ساری اشیاء ملائیں تیل بھی ڈال دیں، اچھی طرح ملا کر پندرہ منٹ کے لئے پکا کر اتار لیں، مزیدار آلو کی سبزی تیار ہے، گرم گرم پوری کے ساتھ پیش کریں۔

☆☆☆

"شادی مبارک"

ہماری پیاری اور ہر دلعزیز مصنفہ اُم مریم سے اُم مریم فرحان علی تک کا سفر طے کر کے پیا دیس سدھار گئیں۔

ادارہ حنا اُم مریم کو زندگی کا نیا سفر شروع کرنے پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

کس قیامت کے یہ نامے

فوزیہ شفیق

السلام علیکم!

آپ کے خطوط اور ان کے جوابات کے ساتھ حاضر ہیں، آپ سب کی صحت وسلامتی کی دعاؤں کے ساتھ۔

محرم الحرام کے آغاز کے ساتھ ہی نیا اسلامی سال کا بھی آغاز ہو چکا ہے، وقت کا کام گزرنا ہے اور یہ گزرتا چلا جارہا ہے، کسی کے لئے بھی نہیں ٹھہرتا، آگے کی طرف رواں رہتا ہے، پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا، نہ رکتا ہے نہ پلٹتا ہے جو اس کے ساتھ نہیں چلتا وہ پیچھے رہ جاتا ہے، ترقی اور کامیابی اس کی منزل ہے، لیکن ترقی صرف وہی ہے جو صحیح اور درست راستے سے اپنی منزل کی طرف لے جارہی ہو، جو حرکت منزل کے برعکس سمت لے جائے وہ ترقی نہیں تنزلی ہے، ہر آنے والی صبح کا سورج ایک خوشگوار امید کے ساتھ طلوع ہوتا ہے، آسودگی، خوشحالی اور مسرتوں کی بہار کے ساتھ۔

ہمارا وطن پیارا پاکستان بہت سارے مدو جزر سے گزر رہا ہے، یہ ابھی ترقی کی منازل طے کر رہا ہے، اسے ترقی پذیر سے ترقی یافتہ کی صف میں کھڑا کرنا ہم سب کی ذمہ داری، جو لوگ اپنی ذمہ داریوں کو ایمان داری سے نبھاتے ہیں ان کا نام تاریخ کے صفحات میں لوگوں کے دلوں میں اور انسان کی یاداشت میں ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی ذمہ داریاں بہ احسن و خوبی انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

خطوط کی محفل میں پہنچنے سے پہلے حسب توفیق درود پاک، کلمہ طیبہ اور استغفار کا ورد کرتے چلیں۔

اپنی دعاؤں میں یاد رکھئے گا اپنا بہت سا خیال رکھئے گا اور ان کا بھی جن کی خوشی آپ کی خوشیوں کے ساتھ جڑی ہے۔

آپ سب کو ہماری طرف سے نیا اسلامی سال مبارک ہو۔

یہ پہلا خط ہمیں جھنگ سیال سے مہوش راجہ نے لکھا ہے وہ اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کر رہی ہیں۔

ستمبر کا شمارہ مہرین سید کے سرورق سے سجا ملا، حمد ونعت، پیارے نبی کی پیاری باتوں کی تعریف کیا کریں الفاظ ہی نہیں ہمارے پاس، سید اختر ناز صاحب کے قلم کی بدولت ہماری دینی معلومات میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے، جزاک اللہ انشاء نامہ میں انشاء جی ملکی صورت حال کے پیش نظر بے حد اچھا کالم لکھا (ہمارے حکمران بھی تو آج کل بادشاہت کی تلاش میں ہے) ایک دن حنا کے ساتھ میں سباس گل صاحبہ مہمان تھیں، معذرت کے ساتھ سباس گل ایک دن حنا کے ساتھ میں بھیجا گیا انٹرویو نما کالم پسند نہیں آیا، اس کے بعد ہم صوفیہ چشتی کی تحریر ''رنگ ریز'' کی طرف لپکے، مگر یہ کیا صوفیہ آپ اپنی دوسری ہی تحریر میں اپنا وہ انداز برقرار نہ رکھ پائی جو آپ پہلے ناول ''کی خاصیت تھا'' اس کے بعد نایاب جیلانی کے سلسلے وار ناول ''پربت کے اس پار کہیں'' میں پہنچے، نایاب نے بڑی تیزی سے

کہانی کو آگے بڑھایا ہے، نبیل بر کے ساتھ نا انصافی نہیں ہوئی، یہ کس طرح کا والد تھا اس کا جس نے بغیر کسی تصدیق کے اپنے گھر کے ملازم سے بیٹی کو بیاہ دیا، جس کا آگے پیچھے کچھ پتا نہیں تھا۔

مصباح نوشین کا مکمل ناول ''ادھورے خوابوں کا محل'' آخر میں مکمل خوابوں کا محل کی صورت وجود میں آیا، مصباح معذرت کے ساتھ آپ کی یہ تحریر تھوڑی نہیں اچھی خاصی الجھی ہوئی تھی، مونا لیزا جیسے شاہکار کو آپ نے ڈی گریٹ کرنے کی کوشش کی نہ جانے کیوں؟ ارے واہ جی فوزیہ آپی آپ درشمن کو بھی حنا کی اس کہکشاں میں لے آئیں، بہت خوب درشمن کا ناولٹ ''تو میری ضرورت ہے'' کی پہلی قسط نے ہی بے ساختہ اپنی طرف متوجہ کرلیا ہے یقیناً آگے چل کر یہ تحریر مزید دلچسپ ہو جائے گی، درشمن آپ کو محبتوں کی اس نگری میں جسے (فوزیہ آپی نے بڑی محبت سے بسایا ہے) خوش آمدید، ''دل گزیدہ'' اُم مریم کے ناول کی دسویں قسط میں بھی ''بڑے صاحب'' کا راز نہیں کھل سکا کہ وہ کون ہے؟ ایک تو دل کہتا ہے یہ اپنا منیب، مطلب منیب صاحب ہی، مگر نہ، نہ جانے کیوں اپنی رائے بدلنے پڑھتی ہے، بڑے صاحب کے دو بچوں کے متعلق جان کر جب کہ منیب کا تو ایک ہی بچہ ہے ''یارمن'' خیر اس مرتبہ بھی آپ نے تحریر میں دلچسپی برقرار رکھی، کہانی پر گرفت آپ کی ہے مگر کچھ ایسا ہے جو کہ کھٹکتا ہے مریم تحریر میں، وہ کیا سمجھ میں نہیں آتا شاید جملوں میں بے ساختگی کی کمی ہے جو آپ کا مخصوص انداز ہے، پلیز اس طرف ضرور توجہ دیں، ناولٹ کارنر میں نوال احمد ایک نیا نام جگمگا رہا تھا پہلے تو نام نے متوجہ کیا پھر تحریر نے بھی، واہ گڈ نوال اگر یہ آپ کی پہلی تحریر ہے تو بے حد اچھی ہے آپ بے حد خوبصورتی سے کہانی کو شروع سے آخر تک نبھایا اس کے علاوہ جس تحریر نے ہمیں چونکایا وہ عرشیہ راجپوت کی ''شام غم'' تھی، عرشیہ کا نام بھی حنا کے صفحات پر پہلی مرتبہ دیکھا، لیکن ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں، مستقبل کی دو بہترین مصنفین کو متعارف کرانے سہرا ستمبر کے شمارے کے سر جائے گا۔

اس کے علاوہ حفصہ طفیل، رمشا احمد کی ''چاند میاں'' فرح طاہر کی ''اجلی محبتیں'' اور قرۃ العین خرم ہاشمی کا افسانہ ''تمہیں اس کی خبر نہ ہو'' بھی اچھی تحریریں تھیں۔

مستقل سلسلوں میں حاصل مطالعہ، سعدیہ جبار، ثناء حیدر اور رابعہ زرقا کا انتخاب پسند آیا، بیاض اور میری ڈائری بھی کی پسند لاجواب تھی، عین غین بھی حسب عادت مسکراہٹیں بکھیر تے رہے جبکہ حنا کا دستر خوان اور کس قیامت کے یہ نامے، دونوں سلسلے ہی چٹ پٹے اور مزیدار تھے۔

مجھے یقین ہے آپ میرا خط شائع نہیں کریں گی ایک تو میں نے پہلی مرتبہ لکھا اور اس پر تنقید سے بھرا، خیر اپنی رائے حق میں محفوظ رکھتی ہوں۔

مہوش راجہ! خوش آمدید اس محفل میں آپ کو دل و جان سے تعریف اور تنقید دونوں ہی ہمارے لئے بے حد اہم ہیں تعریف اپنے کام کا آپ کے معیار پر پورا اترنے کا ثبوت ہے جو کہ اطمینان کا باعث بنتا ہے کہ ہماری محنت کامیاب ہوگی اور آپ دوستوں کی تنقید ہمیں خوب سے خوب تر بنانے کی جدوجہد پر اکساتی ہے۔

آپ کی ہر طرح کی رائے ہمارے لئے اہم ہے، حنا کو پسند کرنے کا شکریہ ہم آئندہ بھی آپ کی رائے کے منتظر رہیں گے، کیونکہ اب آپ کو یقین آ گیا ہوگا ہم تعریف اور تنقید دونوں

کو اہمیت دیتے ہیں شکریہ

زوبیہ نثار: حویلی لکھا سے لکھتی ہیں۔

میں پچھلے آٹھ سال سے حنا پڑھ رہی ہوں اس محفل میں دوسری مرتبہ شرکت کر رہی ہوں ایک مرتبہ پہلے بھی اس محفل میں آئی تھی مگر آپ نے لفٹ ہی نہیں کروائی تو دوبارہ ہمت ہی نہ ہوئی، مگر اس بار ستمبر کا حنا پڑھنے کے بعد رہ ہی نہ سکی اور کاغذ قلم اٹھایا۔

ستمبر کے شمارے کا ٹائٹل پسند نہیں آیا ہمیشہ کی طرح پیارے نبی کی پیاری باتوں اور حمد و نعت سے دل کی نگری کو روشن کیا، پھر انشاء جی کا ساتھ دیتے ہوئے "بادشاہت کی تلاش میں" مایوس ہو کر سباس آپی سے ہیلو ہائے کی، اس کے بعد اپنے پسندیدہ ناول اور "دل گزیدہ" کی دنیا میں پہنچے جہاں حسب عادت منیب مرچیں چباتے ہیں، غانیہ کے صبر پر رشک آتا ہے، کتنی ویل آف فیملی سے تعلق رکھنے کے باوجود منیب کو خوش کرنے کے لئے گھر کا ہر کام کرتی ہے، صوفیہ چشتی کا مکمل ناول "رنگریز" نے بھی بے حد متاثر کیا جبکہ نوال احمد کے افسانے "ستم گر" کی تو کیا ہی بات تھی بہت خوبصورت تحریر لکھی نوال احمد نے، اس کے علاوہ عرشیہ راجپوت کا افسانہ "شام غم" بھی دل کو چھو گیا۔

"پربت کے اس پار کہیں" میں کہانی نے نیا موڑ لیا ہے، نیل براور نشرہ کی مشکلات میں اضافہ ہوا ہے اسامہ زندہ و سلامت ہے جان کر سکھ کا سانس لیا، بالآخر مصباح نوشین کے ناول کا بھی اختتام ہوا، اینڈ ویسا ہی تھا جیسا سوچا تھا یعنی شروع میں مشکلات اور آخری میں ہپی ہپی، رمشا احمد کا افسانہ "چاند میاں" پڑھ کر بے اختیار مسکرا اٹھے، حفصہ طفیل نے سچ ہی کہا کہ اس دور میں ہم کسی کو بھی الزام نہیں دے سکتے۔ جبکہ قرۃ العین نے

کہتی ہوئی آئیں کہ "تمہیں بھی اس کی خبر نہ ہو"
قرۃ العین آپ کی تحریر بھی بے حد پسند آئی۔
مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح بہترین تھے خصوصاً قیامت کے یہ نامے اور حاصل مطالعہ تو بے حد اچھے لگے۔

زوبیہ نثار! خوش آمدید اس سے پہلے آپ کا خط ہمیں نہیں ملا، ستمبر کے شمارے کو پسند کرنے کا شکریہ، ٹائٹل کے سلسلے میں آپ کی شکایت دور کرنے کی کوشش کریں گے، آپ کی فرمائش نوٹ کر لی ہے، انشاء اللہ جلد پوری کریں گے، اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیے گا ہم منتظر رہیں گے شکریہ۔

عابدہ رضا: کوٹ اڈو سے بے شمار دعاؤں کے بعد لکھتی ہیں۔

کیا بات ہے آپی دو سال سے متعدد خط لکھے مگر آپ نے شائع نہیں کیے، کیا کوئی ناراضگی ہے، ہر ماہ میں اتنی حسرت سے "کس قیامت کے یہ نامے" میں اپنا لیٹر تلاش کرتی ہوں، مگر آپ نے شائع کیا ہو تو وہ ملے، اس مرتبہ سرورق سو سو تھا، "کچھ باتیں ہماریاں" نے ہمیشہ کی طرح دل کو چھو لیا، "پیارے نبی پیاری باتیں" سے مستفید ہو کر انشاء نامہ پڑھا تو بے اختیار لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی، "ایک دن حنا کے ساتھ" یہ سلسلہ بہت زبردست ہے اس مرتبہ سباس گل نے اس سلسلے میں شامل ہو کر رونق بڑھا دی۔

سباس گل کے خیالی انٹرویو سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اپنی پسندیدہ مصنفہ اُم مریم کا ناول "دل گزیدہ" پڑھا، جہاں منیب کی غانیہ پر بے جا سختی دل افسردہ کر گئی، بھرجائی کے سامنے تو منیب کی بولتی بند ہو جاتی ہے مگر بیوی کے آگے خوب شیر بنا ہوا ہے۔

"پربت کے اس پار کہیں" بھی چھایا رہا، ناول بے حد دلچسپ موڑ پر ہے اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے، صوفیہ چشتی کے ناول "رنگریز" میں پہنچے تو حیرت زدہ سے رہ گئے، صوفیہ جی تحریر دل کو چھو نہ سکی جبکہ اس سے پہلی والی تحریر تو آپ کی بے حد دلچسپ تھی، درثمن کا ناولٹ "تم میری ضرورت ہو" کی پہلی قسط پسند آئی صرف ایک بات جو کھٹکی وہ ناول کے آغاز میں "جاتی سردیوں" کا ذکر تھا، خدا کا نام لیں درثمن اللہ اللہ کر کے تو سردیاں آنے والی ہیں اور آپ ہیں کہ اس کو واپس بھیج رہی ہے، درثمن آپ کے ناولٹ کی ہیروئین کچھ زیادہ ہی "ماڈرن" نہیں؟ بہر حال حنا کے صفحات پر آپ کو ہم تمام قارئین دل و جان سے خوش آمدید کہتے ہیں۔

نوال احمد کا ناولٹ بھی پسند آیا جبکہ افسانوں میں حفصہ طفیل، فرح طاہر کی تحریریں اچھی لگی، عرشیہ راجپوت، قرۃ العین خرم اور رمشا احمد کی تحریریں بہترین تھیں۔
مستقل سلسلے تو ہوتے ہی اچھے ہیں، آپی اس مرتبہ خط شامل نہ کیا تو میں بھلا کیا کروں گی؟ کچھ بھی تو نہیں، ہم حنا کی محبت میں ایسے بندھے ہیں کہ اس کے نظر انداز کرنے کے باوجود کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔

عابدہ رضا! کیسی ہو؟ ہمیں تو خود تمہاری رائے کا انتظار رہتا ہے، اس سے پہلے ہمیں آپ کا کوئی خط نہیں ملا ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ شائع نہ ہوتا، حنا کو پسند کرنے اس سے محبت کرنے کا بہت شکریہ ہم آپ کی رائے کے آئندہ بھی منتظر رہیں گے شکریہ۔

☆☆☆